اُردو ادب کی ترقی پسند تحریک
(تحقیقی و تنقیدی جائزہ)
www.KitaboSunnat.com
احمد پراچہ

www.KitaboSunnat.com

اُردو ادب کی ترقی پسند تحریک

(تحقیقی و تنقیدی جائزہ)

احمد پراچہ

E-mail: fictionhouse2004@hotmail.com
Ph:042-7249218, 7237430

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب : اُردو ادب کی ترقی پسند تحریک

مئولف : احمد پراچہ

پبلشرز : فکشن ہاؤس

18- مزنگ روڈ، لاہور

فون: 7249218-7237430

اہتمام : ظہور احمد خاں

کمپوزنگ : فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور

پرنٹرز : سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور

سرورق : ریاض

اشاعت : 2010ء

قیمت : -/240 روپے

ہیڈ آفس : 18- مزنگ روڈ لاہور، پاکستان

برانچ لاہور

124- ٹیمپل روڈ لاہور

فون: 042-7321040

سب آفس حیدر آباد

52,53 رابعہ اسکوائر حیدر چوک گاڑی کھاتہ حیدر آباد

فون: 022-2780608

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترقی پسند خاتونِ اوّل

ڈاکٹر رشید جہاں (مرحومہ)

کے نام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترتیب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ڈاکٹر رشید جہاں

پیدائش: ۱۹۰۵ء (علیگڑھ)

وفات: ۱۹۵۲ء (روس)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سخنے چند

احمد پراچہ

انسانی زندگی، معاشرہ، جامد اور ساکت نہیں ہے بلکہ ہمیشہ تبدیل ہوتا رہتا ہے اور اپنا ارتقائی سفر طے کرتا رہتا ہے اس تبدیلی کے عمل میں اقتصادی۔ سیاسی ادبی اور ثقافتی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ نئے خیالات وافکار کے دریچے وا ہوتے ہیں جو معاشرے کو بنانے سنوارنے اور ترقی دینے میں معاون ومددگار ثابت ہوتے ہیں۔

۱۹۳۵ء کے آس پاس (Home Rule) حکومتِ خود اختیاری اور آزادی کی مختلف تحریکوں کا دور شروع ہوتا ہے قریب قریب یہی وہ زمانہ ہے جسے اُردو ادب کی ترقی پسند ترقی تحریک کا آغاز کہا جاتا ہے۔

ترقی پسند تحریک نئے خیالات وافکار کی پیداوار تھی اور اس کا نقطہ آغاز وہ ہوئی تھی۔ کانفرنس نے ترقی پسند تحریک کے نصب العین کی وضاحت ایک منشور کی صورت میں پیش کی تھی جسے متفقہ طور پر منظور کیا گیا تھا۔ اس منشور پر دستخط کرنے والوں میں نوجوان ترقی پسند اہل قلم کے دوش بدوش مولوی عبدالحق اور نیاز فتحپوری ایسے مشاہیر بھی شامل تھے۔ مولانا حسرت موہانی اور مولانا سلیمان ندوی نے اپنے پیغامات کے ذریعے ترقی پسند کی نہ صرف سرپرستی فرمائی تھی بلکہ اس کے ساتھ اپنی وابستگی اور ہم خیالی کا برملا اظہار بھی کیا تھا۔

ترقی پسند تحریک کی اٹھان ایسی ولولہ انگیز اور پرکشش تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے ہر سو پھیل گئی اور منظم ومتحرک ہوتی گئی اس نے نہ صرف اُردو بلکہ جنوبی ایشیا کی ہر زبان کے ادب کو متاثر کیا، علاقہ علاقہ ترقی پسند مصنفین کی شاخیں قائم ہونے لگیں، مختلف زبانوں کے اہل قلم نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، جوش وخروش اور سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔

دیکھا جائے تو یہ ہماری ادبی تاریخ میں ایک نیا اور انقلابی موڑ تھا۔ یہ وہ مرحلہ تھا جب ثقافتی ڈھانچہ انحطاط پذیر ہوکر ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔ اس شکست وریخت سے نئی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

روایات جنم لے رہی تھیں ۔۔۔ چنانچہ نت نئے موضوعات پر طبع آزمائی کی گئی اظہار و ابلاغ کے سلسلہ میں ہیئت اور اسلوب کے نئے اور تازہ تجربات کئے گئے ۔ ادب میں وسعت پیدا ہوئی ۔ ندرت پیدا ہوئی ، نئی دلکشی و رعنائی پیدا ہوئی ۔ ادب کا جمالیاتی اور افادی پہلو نمایاں ہوا اور کھل کر سامنے آیا ۔

لاریب ، برطانوی سامراج کی نوآبادیاتی غلامی کے خلاف جنوبی ایشیا کے عوام کی جدوجہد آزادی میں ترقی پسند تحریک نے جو مثبت کردار ادا کیا ہے وہ اس کا ایک قابل فخر کارنامہ ہے ۔ (بحوالہ: شوکت صدیقی (حرف آغاز) مشمولہ: ترقی پسند ادب ۔ دستاویزات ، ۱۹۸۶ء)

بلا مبالغہ ترقی پسند ادبی تحریک نے آغاز ہی سے ایک عظیم مظہر کی حیثیت رکھی ہے اور ادب پر اس کے مثبت اثرات کا معترف ہونا پڑتا ہے لیکن بتقاضائے بشریت نظریۂ ادب میں نظریاتی پیچیدگیوں کا در آنا جبلی تقاضا ہے لہٰذا انجام کار ترقی پسند ادب میں بھی نظریاتی اختلاف نے سر اٹھایا اور رشتہ ادب کے نام پر کئی نظریاتی تفاودات سامنے آئے ۔

ترقی پسند ادبی تحریک کی حمایت اور مخالفت میں بھانت بھانت کی بولیاں اور آوازیں سنائی دینے لگیں ۔

ترقی پسند ادب کے مسائل پر روشنی ڈالنے کے لیے کئی مضامین اور مقالات لکھے گئے جو وقتاً فوقتاً مقتدر جرائد و رسائل میں چھپتے رہے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے ۔ اس تحریک کی مخالفت اور حمایت میں لکھے گئے ، وہ مضامین و مقالات جو مختلف رسائل و اخبارات کے انبار تلے دبے ہوئے تھے میں نے انہیں رزقِ کرم سے بچا کر ایک مبسوط صورت میں ترتیب دے دیا ہے تاکہ موجودہ نسل کے بعد آئندہ نسلیں بھی استفادہ کر سکیں ۔

جب مجھے یہ کتاب مرتب کرنے کا خیال آیا تو میں نے اپنے طور پر بے ترتیب مطالعے کے علاوہ اُردو ادب کے معتبر اور مستند نقادوں کی تحریروں کا گہرا مطالعہ کیا اور جہاں جہاں سے مجھے ترقی پسند نظریہ ادب یا ترقی پسند ادبی تحریک کے بارے میں اشارے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

،اقتباسات یا مفصل مضامین اور مقالات ملے میں نے ان سب کو متوازن نقطۂ نظر کے تحت اس کتاب میں شامل کر دیا ہے تاکہ اُردو ادب کی ترقی پسند تحریک کے حوالے سے طلباء کے علاوہ اس موضوع میں دلچسپی رکھنے اور مواد ڈھونڈنے والوں کو زیادہ سے زیادہ کتابوں سے گرد جھاڑنے کی زحمت اٹھانے کی بجائے زیرِ نظر کتاب ''اُردو ادب کی ترقی پسند تحریک'' میں یکجا مواد دستیاب ہو چنانچہ اسی خیال کی انفرادیت کی اساس پر اسے منظرِ عام پر لایا جا رہا ہے۔

احمد پراچہ
مکان نمبر ۳۵۰ سیکٹر نمبر ۴ کوتل ٹاؤن کوہاٹ

☆☆☆☆

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

• ترقی پسند ادب

ممتاز شیریں

ترقی پسند تحریک ایک وسیع، عالمگیر اور زبردست تحریک ہے۔ ۳۰-۱۹۳۲ء میں ایک طرف فاشیت سر اُٹھا رہی تھی تو دوسری طرف روس کے لیے نظام کا جو قریب قریب تشکیل پاچکا تھا نمونہ سامنے تھا۔ ان حالات کے زیر اثر ایک منظم تحریک نیک اغراض و مقاصد لے کر اُٹھی۔ اب یہ تحریک ہندوستان میں بھی خوب زور پکڑ چکی ہے اور اس نے اپنے وسیع دامن میں ادب کے علاوہ دوسرے فنون لطیفہ کو بھی سمیٹ لیا ہے۔ ادب کو اس میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ترقی پسند ادب کی مختصر تعریف یوں کی جاسکتی ہے۔

وہ ادب جو زندگی کو اپنے حقیقی روپ میں پیش کرے جس میں زندگی کی تفسیر ہی نہیں تنقید بھی ہو اور جس میں زندگی کو بہتر بنانے کی صلاحیت ہو۔

یہ کہنا غلط ہوگا کہ اس تحریک سے پہلے ادب میں زندگی کی صحیح عکاسی نہیں ہوئی تھی۔ ہر دور کا بڑا ادب زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس تحریک سے بہت پہلے بھی ادب کا یہی نظریہ رہا ہے اور بہت سی ترقی یافتہ زبانوں میں ایسا ادب پیش ہوتا آیا ہے۔ حقیقت نگاری صرف ترقی پسند ادب کی خصوصیت نہیں کہی جاسکتی خصوصاً جب یہ ہر دور کے ساتھ پہلو بدلتی آرہی ہے۔ مغربی ادب میں انیسویں صدی میں معاشرتی حقیقت نگاری تھی تو ۱۹۲۰ء کے بعد جنسی حقیقت نگاری اور آج سیاسی اُردو ادب میں آج کل رجحان مجموعی طور پر جنسی حقیقت نگاری کی طرف ہے لیکن آج جس قسم کی حقیقت پیش کی جارہی ہے وہ پرانے دور کی حقیقت نگاری سے کچھ مختلف ضرور ہے۔ حقیقت اپنی عریاں صورت میں البتہ اُردو ادب کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ حقیقت نگاری اسی تحریک کے ساتھ آئی اس سے پہلے ہمارے ادب میں رومانیت، فراریت اور مثالیت بہت زیادہ تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بعض لوگ ترقی پسندی کو مارکسیت کے مترادف سمجھتے ہیں۔ بعض ادیبوں کا یہ خیال ہے کہ ان کی ساری کوششیں ایک ایسی راہ کے تیار کرنے میں صرف ہوں جس کی آخری منزل اشتراکی نظام ہے۔ یہ نظریہ ادب کو تنگ داماں بنا دیتا ہے۔ بعض نے محض پرانی روایات اور پرانی قدروں کے مٹانے ہر قسم کی پابندیوں سے آزادی اور سماج سے بغاوت کو ترقی پسندی سمجھ لیا ہے۔ پرانی روایت، رواج اور قانون بجائے خود قابلِ ملامت نہیں ہیں۔ ایک خاص ماحول میں یہ ٹھیک بیٹھتے تھے۔ پرانے زمانے میں ان کا اثر اس لیے ہلک نہیں تھا کہ ان پابندیوں کے ساتھ مخصوص اخلاق اقدار جن سے ایک آئین ایک نظام کی تشکیل ہوئی تھی مظبوط جال میں بٹے ہوئے تھے۔ یہ جال مظبوط تھا تو نظام بھی پائیدار تھا۔ لیکن اب زندگی پیچدہ ہوگئی ہے۔ یہ پرانے قانون اس میں جڑ نہیں سکتے۔ لوگوں کو اب ان سے عقیدت نہیں رہی۔ انہیں آج محسوس ہو رہا ہے کہ یہ رواج یہ قانون ان کی آزادی کو سلب کر رہے ہیں اور افیونی دواؤں سے (جیسے مذہب، اخلاقیات) ان کے حس احساس کو مردہ کیا گیا ہے۔ بعض نے آزادروی اختیار کر لی ہے، بعض لوگ مکمل آزادی کو خطرناک سمجھ کر پرانی اور نئی راہوں کے بیچ میں کھڑے ہیں بعض ابھی تک پرانی ڈگر پر چل رہے ہیں اور ان سب کے لیے اخلاقی قدریں بھی الگ الگ ہیں۔ نئے قانون بن رہے ہیں اور انہیں جوڑنے کے لیے پرانے حصوں کو کاٹنا چھانٹنا پڑ رہا ہے۔ اس توڑ، مڑوڑ، گھسوڑ میں نظام کی بری حالت ہوگئی ہے۔ اس کے جوڑ جوڑ ڈھیلے پڑ گئے ہیں، بعض کیلیں نکل گئی ہیں کئی جگہ بندھن ٹوٹ چکے ہیں کئی مقام مظبوط ہیں۔ ہندوستان میں یہ نیم آزادی اور نیم پابندی کا دور خطرناک ثابت ہو رہا ہے۔ ترقی پسند چاہتے ہیں کہ ان تمام پرانی روایتوں کو مٹا ڈالیں اس جال کی دھجیاں اُڑا ڈالیں ساری پابندیوں سے آزاد ہو جائیں۔ لیکن یہ مکمل آزادی ہمیں کہاں لے جائیگی؟ کون جانے! شاید انارکی کا دوردورہ ہو جائے اور یہ مکمل شخصی آزادی پابندیوں سے بھی خطرناک ثابت ہو!

ترقی پسند تحریک کے مقاصد نیک ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس تحریک کے زیر اثر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اُردو میں آج جو ادب تخلیق ہو رہا ہے وہ کہاں تک ان مقاصد کی تکمیل میں مدد دے رہا ہے اور کہاں تک یہ سب کچھ جو ترقی پسند ادب کہا جاتا ہے ادب ہے؟ اس میں شک نہیں کہ اس تحریک کے زیر اثر ہندوستان میں بھی اچھا ادب۔ خصوصاً افسانوی ادب جہاں تک ناولوں کا تعلق ہے ہمارا ادب ابھی بہت پیچھے ہے) پیدا ہوا ہے جو کسی بھی ملک کے ترقی پسند ادب کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ بہت سارا رطب ویابس بھی جمع ہو گیا ہے۔ اسکا بہت بڑا سبب یہ ہے کہ ترقی پسند ادب ایک بڑی حد تک مقصدی ادب ہے اور مقاصد کے پرچار کے لیے پروپیگنڈا بھی ادب میں شامل ہوتا جارہا ہے حالانکہ پروپیگنڈے کی سطح تک گرائے بغیر بھی ادب میں افادیت کا عنصر لایا جاسکتا ہے۔ مقصد فن کے پردے میں ڈھکا نہیں تو کم از کم اس طرح گھل مل جائے کہ اس کا اثر تو ضرور ہو لیکن مقصد آپ کو گھورتا ہوا نظر نہ آئے۔ کامیاب فن کار طنزیہ جملوں، جوشیلی تقریروں اور پند و نصائح کی بھرمار کیے بغیر بھی بہت اثر پیدا کر سکتا ہے۔ حقیقت نگاری کے معنے یہ نہیں کہ جو کچھ سامنے گزرا ہوا ہے من وعن بیان کر دیں خواہ یہ روکھی پھیکی رپورتیج کیوں نہ بن جائے۔ رپورتیج اور فن میں یہ فرق ہے کہ فن کارانہ چیز کی تخلیق میں واقعات کے چناؤ ترتیب اور انداز بیان کو بہت بڑا دخل ہے۔ ادب فوٹو گرافی نہیں۔ فن کار خاکہ کھینچنے کے بعد جن نقوش کو اُبھارتا ہے ان میں رنگ آمیزی کر کے اور زیادہ اثر پیدا کرتا ہے۔ یوں تخیل حقیقت کو نکھارتا ہے۔ پروپیگنڈا عوام پر اثر ڈالنے کے لیے ادب سے زیادہ کارآمد حربہ ہے۔ روس میں انقلاب اور موجودہ جنگ کے دوران میں پروپیگنڈا زوروں پر تھا۔ اچھے اچھے ادیبوں نے اپنے آپ کو پروپیگنڈے کے لیے وقف کر دیا تھا۔ چنانچہ اھلیاں اھرن برگ پمفلٹ نگاری کرتے رہے۔ افسانوں کے ذریعے بھی پروپیگنڈا کیا جاتا تھا لیکن اسے پروپیگنڈا سمجھ کر وہ یہ منوانے پر مصر نہیں تھے کہ یہ بہترین ادب ہے۔ تیسرے درجے کی چیزوں کی تخلیق کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ ترقی پسند ادب کے مقاصد اور خاص رجحانات دیکھ کر لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ ترقی پسند ادب لکھنا بہت آسان ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فلاں فلاح موضوع پر لکھ دیں تو ترقی پسند افسانہ تیار ہے۔ اس لیے ایسے لوگ بھی لکھنے لگے ہیں جن میں فنی صلاحیتیں نہیں۔ بعض ایسے بھی ہیں جن کے ارادوں میں خلوص ہے لیکن جو فن پر دسترس نہیں رکھتے ایسے بھی ہیں جو خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ یہ خلوص سے نہیں لکھتے بلکہ صرف اس لیے کہ فلاں فلاں موضوع پر لکھنا آج کا فیشن ہے اور وہ ان پر لکھ کر ادیبوں کے زمرے میں شمار کیے جائیں گے۔ ان کی تحریروں میں نہ گہرائی ہوتی ہے نہ خلوص بلکہ سطحیت اور رسمیت البتہ پھیکا جوش و خروش ضرور ہوتا ہے۔

ادب کو مقصدی سمجھنے کا ایک اثر یہ بھی ہو رہا ہے کہ ہمارے ادیب کسی سماجی حقیقت کو بحیثیت مجموعی دیکھنے کی بجائے صرف بعض پہلوؤں پر زور دیتے ہیں اور انہیں ایک حد تک بڑھا چڑھا کر بھی پیش کرتے ہیں۔ مثلاً غریبوں کی زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں تو انہیں اتنی مصیبت میں بتاتے ہیں جتنے غریب خود محسوس نہیں کرتے کیونکہ وہ اس زندگی سے مانوس ہوتے ہیں۔ پھر ان کی زندگی میں بھی چھوٹی چھوٹی مسرتیں ہیں جن کی وجہ سے انہیں زندگی قابل برداشت معلوم ہوتی ہے۔ شاید یہ سب جان بوجھ کر نظر انداز کیا جاتا ہے کیونکہ ان کا ذکر کرنا موجودہ حالت سے اطمینان بتانا ہوگا۔ لیکن اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم ان کی زندگی کو متوسط طبقے کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے اکثر قریب قریب سبھی ادیب متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یورپ میں نچلے طبقے نے بھی ادیب پیدا کیے ہیں۔ لیسی ہالورڈ اگر پلاسٹررز کے متعلق لکھتے ہیں تو وہ خود پلاسٹرر رہے تھے۔ بی۔ ایل۔ کومبس جارج گیرٹ اور فرڈیو کوہارٹ وغیرہ نے مزدوروں کے متعلق بہت اچھا لکھا ہے اور یہ خود اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں ان کی تحریروں کا متوسط طبقے کے ادیبوں کی تحریروں سے موازنہ کیا جائے تو نمایاں فرق معلوم ہوتا ہے متوسط طبقے کے ادیب مزدوروں وغیرہ کی مصیبتوں کا ذکر کرتے ہیں تو ان کا لہجہ زیادہ تلخ اور جذباتی ہوتا ہے۔ بی۔ ایل کومبس، جارج گیرٹ اور فرڈیو کوہارٹ نے اپنی دیکھی ہوئی اپنے آپ پر بیتی ہوئی مصیبتوں کا ذکر کیا ہے لیکن انہیں بیان کرنے میں ان کا لہجہ بہت تلخ اور جذباتی نہیں ہے پھر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھی یہی زیادہ مؤثر معلوم ہوتا ہے۔ان کی تحریر میں صرف مصیبتیں اور مایوسیاں ہی نہیں اُمیداور اپنی طاقت پر بھروسے کی جھلک بھی ہوتی ہے۔

یہی حال جنسی ادب کا ہے۔ ہمارے ہاں جنس پر بہت لکھا جارہا ہے۔جنس زندگی کا ایک بہت اہم جزو ضرور ہے لیکن اس پر ضرورت سے زیادہ توجہ دی جارہی ہے۔شاید مغربی ادب کی ۱۹۲۵ء کے بعد کی جنسی حقیقت نگاری کی تقلید اب ہورہی ہے۔ہم تقلید بھی بیس برس بعد کرتے ہیں! جنسی بھوک، جنسی ناآسودگی، جنسی بے راہ روی بس انہیں کے ذکر سے ہمارا ادب بھرا پڑا ہے۔مرد کی تصویر بھی سیاہ ہے اور عورت کی بھی افسوس تو یہ ہے کہ عورت کے قلم سے کھینچی ہوئی عورت کی تصویر بھی سیاہ ہے۔سوگندھیاں (ہتک: منٹو) اور جینائیں (چپ: ممتاز مفتی) کتنی زیادہ ہیں اور شمی (گرم کوٹ) صفیہ (نیلی) اور آپا کتنی کم حالانکہ ہندوستان میں انہیں کی تعداد زیادہ ہے۔شاید ترقی پسند یہ کہیں کہ ہمیشہ جنسی برائیوں کا ہی ذکر اس لیے کیا جاتا ہے کہ یہ برائیاں محض سماجی حالات کا نتیجہ ہیں اور ان سماجی حالات کو بدلنا ہو تو برائیوں کو اپنی کریہہ صورت میں پیش کرنا ہوگا لیکن پورے جنسی ادب کا ہم جائزہ لیں تو اس میں بہت کم سماجی مسائل ملیں گے۔لے دے کے طوائف کا ایک موضوع ہے یا ایک بوڑھے مرد اور جوان لڑکی کی بے جوڑ شادی۔ان موضوعوں پر بیسیوں افسانے لکھے گئے ہیں اور لکھے جارہے ہیں لیکن کتنے اہم مسائل چھوئے تک نہیں گئے۔زیادہ تعداد میں ایسے افسانے ہیں جن میں منفرد کرداروں کی جنسی بے راہ روی یا عیاشی کا ذکر ہوتا ہے۔ان افسانوں کے انفرادی ہونے سے کوئی گلہ نہیں۔ آخر ایک فرد کے احساسات اس پر گزرے ہوئے واقعات بھی اہم ہیں۔گلہ اس بات سے ہے کہ آخر انسان کو ہمیشہ حیوان کے روپ میں کیوں پیش کیا جائے؟ جدید افسانہ نگاروں کو جنسی بدعنوائیوں کا ذکر کرنے کا خبط ہے ترقی پسند ادب میں عریانی فحاشی پر آئے دن بحثیں ہوتی ہی رہتی ہیں اس لیے یہ الزام بھی بے بنیاد نہیں۔ممکن ہے بعض ادیبوں کے ارادوں میں واقعی خلوص ہو اور گناہوں کو اپنی کریہہ صورت میں پیش کرنے سے ان کا مقصد ان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سب سے نفرت دلانا ہو لیکن بعض تو ایسا معلوم ہوتا ہے سیکس کو فیشن سمجھ کر خواہ مخواہ عریاں حقیقتوں کو اجاگر کرتے ہیں بعض عریاں نگاری کو اپنی جرات کا اظہار سمجھتے ہیں یا محض ضد اور بغاوت مخصوص باتوں کو کھلے طور پر بیان کرنا بجائے خود فحاشی ہرگز نہیں اس کا انحصار پیش کرنے کے انداز اور مواقع پر ہے۔ ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ ایسے افسانے بھی لکھے گئے ہیں اور لکھے جا رہے ہیں جو کریہہ گناہ آمیز اور غلاظت میں ڈوبے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے افسانوں میں یوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے کہ نئے نئے لکھنے والے پہلے کی چند مثالیں دیکھ کر تقلید کرتے ہیں پھر ان کے بعد جو آتے ان کی تحریروں میں اور عریانی بڑھ جاتی ہے یہاں تک کہ مبتدی اور معمولی لکھنے والے عریانی کو اپنے افسانے کے اچھے اور ترقی پسند ہونے کی سند میں پیش کرتے ہیں۔ ترقی پسند ادب پر فحاشی کے الزام کے جواب میں ترقی پسند اکثر یہ کہتے ہیں کہ لوگ ایسے افسانے پڑھ کر اس لیے جھنجھلا اٹھتے ہیں کہ یہ ان کا پول کھولتے ہیں یہ محض چور کی داڑھی میں تنکے والا معاملہ نہیں ہے۔ ممکن ہے بعض لوگوں کی طبیعت پر ایسے افسانے اس لیے گراں گزرتے ہوں کہ یہ ان کی جمالیاتی حس کو ٹھیس پہنچاتے ہیں اور پڑھنے والوں میں ایسے بھی ہیں جنہیں ایسے افسانوں سے اکتاہٹ ہوتی ہے۔ اس لیے نہیں کہ یہ ان کا پول کھولتے ہیں بلکہ اس کے برخلاف اس لیے ایسا جنسی ادب ان کی زندگی کو نظر انداز کر رہا ہے وہ صحت مند محبت یا ازواجی محبت کے قائل ہوں خود اچھی زندگی بسر کرتے ہوں اور ادب میں اپنی زندگی کا ایسا عکس بھی دیکھنا چاہتے ہوں جس سے انہیں ایک طرح کا سکون اور مسرت حاصل ہو۔

آپ ہی کا لحاف گندہ ہے آپ ہی کے جسم سے یہ بو آتی ہے کہہ کر چپ ہونے کی بجائے ہمیں چاہئے کہ اس شکایت پر غور کریں اس معاملے پر زیادہ توجہ دیں اور جنسی ادب میں سنجیدگی توازن اور اعتدال پیدا کریں جنس میں لتھڑے ہوئے افسانے کی بجائے جنس میں زندگی کو پیش کریں۔

سنجیدگی توازن اور اعتدال سے ترقی پسند ادب کی خوبیاں اور اُجاگر ہوں گی۔ یہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

افراد و تفریط انہیں عوام کی نظروں سے چھپائے ہوئے ہے لوگ یہ دیکھتے ہیں کہ ترقی پسند ادب میں بغاوت کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ پرانے نظام کی ہر چیز پر محض اس لیے کہ وہ اسے فرسودہ خیال کرتے ہیں حملہ کیا جاتا ہے یہاں تک کہ مذہب و اخلاق پر بھی۔ مذہبی عقاید کا ٹھٹھہ اُڑایا جاتا ہے خدا کو گالیاں دی جاتی ہیں۔ ہائے ترقی پسندی تیرے نام پر کیا کیا لکھا جا رہا ہے یہ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ خدا کو پرانے نظام سے وابستہ کیوں کیا جاتا ہے؟ اور خدا کو گالیاں دینے سے نئے نظام کی تعمیر میں کیا مدد ملتی ہے۔؟

ترقی پسند ادب کا عام رجحان ہی یہ ہے کہ زندگی اور حقیقت کے چند (زیادہ تر تاریک) پہلوؤں پر خصوصی توجہ کی جا رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مقاصد کے حصول کے لیے یہ ایک حد تک ضروری ہے لیکن اس کے معنی یہ بھی نہیں کہ روشن پہلو بالکل نظر انداز کر دیے جائیں۔ ہاں آج ہمیں اپنے گرد تاریکی اور برائیاں ہی زیادہ نظر آ رہی ہیں نیکی اور روشنی کم ہے لیکن انہیں کم از کم اس تناسب میں پیش کیا جائے۔ ہمیشہ زندگی اور انسانی کردار کی سیاہ تصویریں پیش کرنے سے زندگی اور انسانی فطرت ہی سے مایوسی ہو جائے گی۔ پھر آنے والے دور کی امید کہاں رہے گی؟ انسان کی فطرت پر سے بھروسہ اُٹھ جائے تو انسانیت کا مستقبل روشن کیسے نظر آئے گا؟ ساتھ ساتھ نیک کردار اور انسانی فطرت کی خوبصورتی بھی دکھائی جائے تو سکون اور مسرت حاصل ہوتی ہے اور یہ احساس قائم رہتا ہے کہ انسانیت کی شمع بجھ نہیں گئی ٹمٹا رہی ہے اور ایک سازگار ماحول میں اس کی لو پھر سے تیز ہو سکتی ہے۔

اب ہمارے ادب پر یاسیت اور قنوطیت چھائی ہوتی ہے۔ بے چینی ہے الجھنیں ہیں شکوک ہیں۔ کوئی رجائی پیغام نہیں۔ یہ بڑھتی ہوئی یاسیت اُمید کا گلا گھونٹ رہی ہے ترقی کی راہ میں حائل ہو رہی ہے ہمارے ادب میں بلا کی تیزی ہے قوت ہے، جوش ہے لیکن یہ سب کچھ ایک بغاوت میں استعمال ہو رہے ہیں۔ ادیبوں کا لہجہ ایسا ہے جیسے وہ زندگی اور انسانیت سے محبت نہیں ان پر حملہ کر رہے ہیں۔ ہمارا ادب منفی بن کر رہ گیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔اس وقت یہ بہت ضروری ہے کہ ادیب رجائی پیغام دیں اثباتی اور تعمیری اقتدار پیش کریں۔

ادب میں ایک ہی رجحان کبھی قائم نہیں رہتا۔ایک دور میں ایک رجحان ہوتا ہے تو اس کے بعد کے دور میں ردِ عمل بالکل متضاد قسم کا۔ ایچ۔جی۔ویلس آرنلڈ بینیٹ اور گالزور دی کا ردِ عمل جونس ورجینا وولف اور لارنس تھے ایک فرد (بڑی حد تک خود مصنف) کے خیالات اور احساسات کی تصویر کشی ذہنی تصورات کی عکاسی یہ داخلی حقیقت نگاری کا دور تھا۔پھر اسکے ردِعمل میں بالکل خارجی حقیقت نگاری آئی۔اس کا محرک نئے لکھنے والوں کا وہ گروہ ہے جس کی قیادت کرسٹوفر اشروڈ، جارج آردل، سٹیفن سپنڈ وغیرہ نے کی۔ جو لوگ جنگ اور زندگی کی بڑھتی ہوئی مصیبتوں سے تھک چکے ہیں وہ ادب میں ایسی مصیبتوں کا پر تو نہیں دیکھنا چاہتے،ادب میں فرار ڈھونڈ ھنا چاہتے ہیں۔ ایک اور سکول قائم ہوگیا ہے جنہیں Apoclypties کہا جاتا ہے اس کی نگارشات میں رومانیت اور فراریت شامل ہوتی جارہی ہے۔روس جہاں کل تک اس زور وشور سے جنگی اور انقلابی ادب پیش ہو رہا تھا اب پرانی تاریخ کی طرف متوجہ ہورہا ہے۔ V.Yan نے پرانے درویشوں کی قصہ گوئی کے طرز پر''چنگیز خان'' اور ''باتو خان'' لکھے ہیں اور ٹالسٹائی نے''پیٹر دی گریٹ''۔

ادب کے نظریئے بدلتے رہتے ہیں رجحان بدلتے رہتے ہیں لیکن یہ مخصوص نظریئے اور رجحانات ادب کے احاطے کو محدود کر دیتے ہیں۔ادب کو وسیع ہونا چاہیئے تا کہ داخلی،خارجی،انفرادی،اجتماعی لمحاتی،ابدی،روایاتی حدوں اور خصوصیتوں سے نکل کر اور ان سب کو اپنے دامن میں لے کر زندگی کی ترجمانی کرے۔زندگی جو اس لمحے ہمارے سامنے ہے،زندگی جو ازل سے ہے،فرد کی زندگی ،جماعت کی زندگی ،ہر طبقے کی زندگی، ہرقوم کی زندگی ،زندگی اپنی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مصیبتوں اور مسرتوں کے ساتھ اپنی نیکیوں اور برائیوں کے ساتھ غلاظت اور پاکی کے ساتھ اپنی امیدوں اور مایوسیوں کے ساتھ زندگی اپنی کشمکش، اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کے ساتھ اپنی ساری وسعتوں اور پیچیدگیوں کے ساتھ اپنے تناسب اور توازن کے ساتھ،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترقی پسند تحریک، تخلیقی ادب میں نظریے کی فعالیت اور سماجی شعور کی اہمیت کا حوالہ

پروفیسر ڈاکٹر نجیب جمال

اُردو شعر و ادب میں سماجی شعور کی نمود کا مسئلہ اور اس کی بحث خاصی پرانی ہے اگر چہ تخلیقی عمل کی تشکیل میں اسے کبھی بھی مقصود بالذات نہیں سمجھا گیا تاہم اس مسئلے پر باقاعدہ بحث کا آغاز حالؔی کے مقدمہ شعر و شاعری سے ہوا جس میں پہلی مرتبہ شاعری پر سماج اور سماج پر شاعری کے اثرات کا تجزیہ سائنٹفک بنیادوں پر کیا گیا اور ان دونوں کو ایک دوسرے کے بناؤ یا بگاڑ کا جز و لاینفک قرار دیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ ایک اچھے سماج کی تشکیل کے لیے شاعری کے عمل انگیز ہونے کی صلاحیت کو استعمال کرنے کی ترغیب بھی دی گئی۔ بلاشبہ ایک اچھے سماج کو عمرانی، اخلاقی، تہذیبی اور معاشرتی اعتبار سے بہتر انسانوں کی ضرورت ہوتی ہے ادر ادب اور شاعری غیر محسوس طریقے سے سماجی زندگی میں توازن، اعتدال، تناسب اور ہم آہنگ طرز احساس کو پیدا کرنیکا جتن کرتے ہیں۔ اب اگر ہم عصر موجود میں اپنے وجود، اپنی ذات اور اپنی زندگی کی معنوی تعمیر کرنا چاہیں تو شاید آسانی سے کوئی حتمی بات نہ کہہ سکیں اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ہم یقین اور بے یقینی کے درمیان ایک ایسے دوراہے پر رُکے ہوئے کھڑے ہیں جہاں سے ہر راستہ دھند میں لپٹا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ آگے قدم رکھنے کا حوصلہ اس لیے نہیں رہا کہ سماجی تہذیبی اور معاشرتی سطح پر زندگی کے جو معنی ہوا کرتے تھے محبت اور مروت کی جو اقدار تھیں، اجتماعی طرزِ احساس کے جو حیات آفریں رنگ تھے کب کے معدوم ہو چکے۔ مشین کا پہیہ اتنی تیزی سے گھومے گا، زندگی کی بلٹ ٹرین اتنی تیزی سے حرکت کرے گی اور آلات اتنی تیزی سے احساس مروت کو کچل ڈالیں گے کہ مشینوں کی سلومت دلوں کی موت بن جائے گی ایسا کب اور کس نے سوچا ہوگا؟ لوگ اپنے ہی سائے سے خوف کھائیں گے۔ ناانصافیوں کی بھینٹ چڑھ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جائیں گے۔ظلم کے شکنجے میں کسے جائیں گے ۔بڑی طاقتیں بڑی مچھلیوں کی طرح چھوٹے چھوٹے کمزور ، بے بس اور لاچار ملکوں کو چھوٹی مچھلیاں سمجھ کر نگل جائیں گی۔لفظوں کو اپنی مرضی کے معنی پہنائیں گی۔انسانوں کو غلام اور محکوموں کو بے دام سمجھیں گی۔ یہ سب کچھ آج ناچار دیکھنا پڑ رہا ہے۔ایسے میں شعروادب ہر دور میں مسیحائی کرتے رہے ہیں زندگی کو گوارا بناتے رہے ہیں تمناؤں میں رنگ بھرتے رہے ہیں اوران سب ضروری باتوں کو بھی بیان کرتے رہے ہیں جنہیں روبرو بیان نہ کرنے کا دکھ ملاقاتوں کے ادھورے ہونے کا سبب بنتا رہا ہے۔گویا ادب کی ضرورت اوراہمیت ہر دور میں مسلمہ ہے اس کی ضرورت کل بھی تھی ، جب میرؔ کی شاعری میں دل اوردلی جیسے نگر کے لٹنے کا منظرایک جیسا وحشت خیز تھا۔

دل کی بربادی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

یا جب غالبؔ نے پوری تہذیبی بساط ہی الٹتے ہوئے دیکھی تھی اور کہا تھا ؎

بوئے گل ،نالۂ دل،دودِچراغِ محفل
جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

اور یا جب حالیؔ نے زمانے کی بدلتی ہوئی عادات اور محبوب کی بے وفائی کو ایک جیسی معنویت کا حامل قرار دیا تھا ؎

کہا جو میں نے وفا کرتے آئے ہیں احباب
کہا زمانے کی عادت بدلتی جاتی ہے

اورکون نہیں جانتا کہ بیسویں صدی کے نصف اول میں جب انقلاب کی باتیں ہو رہی تھیں اور شاعری میں جذباتیت ، جوش بیان اور بلند آہنگی کی لو کو بڑھا دیا گیا تھا تو مجاز جیسے رومانوی بانکپن رکھنے والے اور مدھم سُروں میں بات کرنے والے شاعر نے بھی رومانوی شاعری کی لطافت اور نزاکت کے بجائے آنچل کو پرچم بنانے کا نعرہ لگا دیا تھا اور کہا تھا ؎

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تیرے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

اس ساری تمہید سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تخلیقی ادب اپنے زمانے کی تاریخ ہی نہیں لکھتا بلکہ زمانے کی پشت پر اپنے دستخط بھی ثبت کرتا ہے اور جس طرح باجا راگ سے بھرا ہوا ہوتا ہے اسی طرح فن کار کے دل میں بھی اشکوں کا جوش تہہ بہ طوفان کیئے ہوئے ہوتا ہے اور وہ زمانے کی کروٹوں، سماج کی جنبشوں سیاست کی بوالعجبیوں اخلاقیات کی پابندیوں، حسن کی شوخیوں اور عشق کی رنگینیوں کو بیان کرنے کا سب سے موثر ذریعہ ہے مگر یہ کہانی کچھ اور بھی بتانا چاہتی ہے اس کہانی کے کردار چپ ہیں مگر ایک طوفان اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہیں اور یہ کہانی ہے ادب کی اس تحریک، اس رو اور اس موج بلاخیز کی جس نے اُردو ادب کے خاموش پُرسکون اور اطمینان سے بہتے ہوئے دریا میں بھاری پتھر لڑھکا کر اس کی موجوں میں اضطراب پیدا کر دیا تھا۔ اسکی سوئی ہوئی لہروں میں طغیانی برپا کر دیا تھا اسے ایک بڑے طوفان سے آشنا کر دیا تھا اور طوفان جب اُمڈ کر آتا ہے تو پھر جہاں بڑی تباہی مچاتا ہے خس وخاشاک کو بہا کر لے جاتا ہے۔ کسی کو مقابل میں گوارا نہیں کرتا وہاں اپنے پیچھے زرخیزی بھی چھوڑ جاتا ہے۔ زمینوں کو ہموار کر جاتا ہے اور چکنی مٹی کی ایک تہہ چڑھا جاتا ہے۔ اُردو شعر و ادب کی سب سے موثر طاقت ور اور کسی حد تک منہ زور تحریک کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے جس کی حمایت اور مخالفت میں اتنا کچھ لکھا جاتا رہا ہے اور ابھی اتنا کچھ لکھا جائے گا کہ کسی دوسری تحریک پر اس کا عشرِ عشیر بھی لکھا نہیں گیا۔ اس تحریک کو ترقی پسندی کی تحریک کا نام دیا گیا اور ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے طور پر رجسٹرڈ کرایا گیا۔ اس تحریک کی حمایت کرنے والوں نے ایسے جوش جذباتیت اور گھن گرج سے کام لیا کہ رومانوی طرز احساس کی لطافتیں پھیکی پڑ گئیں ان لوگوں نے رُخ برگِ گلاب نکھارنے کے لیے خون دینے کی قسمیں کھائیں اسی طرح مخالفت پر تلے ہوئے لوگوں نے وہ دھول دھپا کیا کہ گریبانوں کے ڈھیر لگ گئے اور ان کی دھجیوں کا شمار ممکن نہ ہو سکا ان لوگوں نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترقی پسندی کو پروپیگنڈا جذباتی ہیجان، سیاست پروری اور نظریے کی پرچار کا نام دیا اور ایک بڑی لمبی فردِ جرم مرتب کی۔

فی الوقت ہماری بحث کا مقصد یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک کے اچھے بُرے پہلوؤں کا تجزیہ کر کے ادب میں اس کے مثبت یا منفی کردار کا تعین کیا جائے کیوں کہ بلاشبہ یہ تحریک ادب کی سب سے فعال، مسلسل اور زود اثر تحریک ہے جو اپنے آغاز کے ستر سال بعد بھی اپنے مزاج اپنی افتادِ طبع اور اپنے موثرات کے اعتبار سے نہایت اہم ہے اس کے حامی اور مخالفین آج بھی اسی شدت کے ساتھ موجود ہیں جس طرح پہلے روز تھے۔ آج بھی ادب میں نظریے کی نمود پر جب بھی بحث ہوتی ہے ترقی پسند تحریک اس کا سب سے ناگزیر حوالہ ہوتی ہے۔ آج بھی یہ سوال بہت اہم ہے کہ سماجی شعور یا مقصدیت ادب کے لیے ضروری ہے یا اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ آج بھی ادب میں خطابت، تبلیغ اور پرچار کرنے کو کبھی ادب کا حصہ اور کبھی خارج از ادب سمجھا جاتا ہے حالانکہ یونان کے ڈراموں کی خطابت سے لے کر اشفاق احمد کے ڈراموں کے طویل مکالموں تک میں یہ سارے جوہر کل کی طرح آج بھی موجود ہیں۔ اسی طرح سماجیات کی طرح سیاسیات بھی حیاتِ انسانی کا لازمہ ہے اور ادب حیات انسان ہی کے مختلف النوع پہلوؤں کو ایک خاص کن لگا کر پیش کرتا ہے۔ براہِ راست نہ سہی بالواسطہ طور پر ادب بہتر سماج کی تشکیل کے لیے کاوش کرتا ہے اب یہ الگ بات ہے کہ کمیونسٹ پارٹی اگر یہ چاہتی ہے کہ پیداوار کے ذرائع کسی فردِ واحد کے دائرہ اختیار سے نکل کر ایک ایسے نظام کے تابع ہو جائیں جس میں ہر شخص کو اس کی پیداواری صلاحیت کے مطابق حصہ ملے تو یقیناً اس نظریے میں اتنی قوت ہے کہ ادب جیسی فعال اور سیال قوت اس سے متاثر ہوئے بغیر رہ ہی نہیں سکتی خصوصاً اس وقت جب معاشرے میں استحصال جبر عدم توازن سماجی ناانصافیاں اور محرومیاں برابر موجود ہوں تو ادب کبھی اعلانیہ اور کبھی غیر محسوس طریقے سے اس عدم توازن کے خلاف آواز اُٹھائے بغیر نہیں رہتا ایسا ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ کوئی لاکھ یہ کہے کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

”ترقی پسندوں نے ادب میں سماجی شعور کی جو بات اُٹھائی تھی وہ سراسر بکواس تھی۔شاعر کو سماجی بصیرت فکر پیغام وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے اسے تو بس یہ کرنا چاہیے کہ جو کچھ وہ محسوس کرتا ہے اسے پورے خلوص سے بیان کر دے۔“ [1]

عملاً ایسا ممکن نہیں ہے ادیب یا شاعر بھی اسی دنیا کے فرد ہیں اور اسی طرح سوچتے اور متاثر ہوتے ہیں جیسے کوئی عام آدمی متاثر ہوسکتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ چوٹ دل پر پڑے اور اس کی آواز بھی سنائی نہ دے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی واردات ادیب کے دل پر سے ہوکر گزرے اور اسے رقم نہ کرے۔ایسے میں فیض صاحب یاد آتے ہیں

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے — جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
ہاں تلخیِ ایام ابھی اور بڑھے گی — ہاں اہلِ ستم مشقِ ستم کرتے رہیں گے
منظور یہ تلخی ، یہ ستم ہم کو گوارا — دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے

”فیض ان لوگوں میں سب سے آگے دکھائی دیتے ہیں جنہوں نے ترقی پسند تحریک کے اعلامیوں کو ہمیشہ تخلیقی لمس عطا کیا۔وہ ہر سنجیدہ لکھنے والے سے بلا خوف وخطر اور برملا سچی باتیں کہنے کا تقاضا کرتے رہے۔“ [2]

”ان کے خیال میں لکھنے والوں کو جبر اور ظلم کو بے نقاب کرنا چاہیے اور جو ناانصافیاں ہورہی ہیں انہیں ننگا کرنا چاہیے اور سماجی ،معاشی ،ثقافتی ،منافقت کو بے نقاب کرنا چاہیے۔“ [3]

آیئے دیکھتے ہیں فیض اپنے اس ارادے میں کہاں تک راسخ ہیں:

جشن ہے ماتمِ اُمید کا ،آؤ لوگو
مرگِ انبوہ کا تہوار مناؤ لوگو
عدم آباد کو آباد کیا ہے میں نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تم کو دن رات سے آزاد کیا ہے میں نے

جلوۂ صبح سے کیا مانگتے ہو

بستر خواب سے کیا چاہتے ہو

ساری آنکھوں کو تہ تیغ کیا ہے میں نے

سارے خوابوں کا گلا گھونٹ دیا ہے میں نے

اب نہ مہکے گی کسی شاخ پہ پھولوں کی حنا

فصلِ گل آئے گی نمرود کے انگار لیے

اب نہ برسات میں برسے گی گہر کی برکھا

اَبر آئے گا خس وخار کے انبار لیے

میرا مسلک بھی نیا میری طریقت بھی نئی

میرے قانوں بھی نئے میری شریعت بھی نئی

اب فقیہان حرم دستِ صنم چومیں گے

سرو قد، مٹی کے بونوں کے قدم چومیں گے

ذرا محسوس کیجئے کہ یہ اشعار کس آہنگی سے خون کی گردش کو تیز کرتے ہیں اور اندر کے سچ کو باہر لاتے ہیں: ؎

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے بول زباں اب تک تیری ہے

تیرا ستواں جسم ہے تیرا بول کہ جاں اب تک تیری ہے

دیکھ کہ آہن گر کی دکاں میں تند ہیں شعلے سرخ ہے آہن

کھلنے لگے قفلوں کے دہانے پھیلا ہر اِک زنجیر کا دامن

بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے جسم و زباں کی موت سے پہلے

بول کہ سچ زندہ ہے اب تک بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

فیض کی شاعری یہ رجزیہ آہنگ پوری انسانیت کو سچ یقین اور اعتماد کا لہجہ عطا کرتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہم دیکھیں گے / لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے / وہ دن کہ جس کا وعدہ /
ہم دیکھیں گے / جو لوحِ ازل میں لکھا ہے / ہم دیکھیں گے /
جب ظلم و ستم کے کوہِ گراں / روئی کی طرح اُڑ جائیں گے
ہم محکوموں کے پاؤں تلے / یہ دھرتی دھڑ دھڑ دھڑ کے گی /
اور اہل حکم کے سر اوپر / جب بجلی کڑ کڑ کڑ کے گی / ہم دیکھیں گے

فیض انسانوں کے معاشرے میں ظلم، استحصال، ہوس ملک گیری اور طاقت کے زعم میں پیدا ہونے والی اجارہ داری کے خلاف عدل، مساوات، آزادی اور بین الاقوامی امن و خوش حالی کی بشارت دیتا ہے۔ فیض کے اندر ہمیشہ ایک ہی آواز بلند ہوتی سنائی دیتی ہے یہی آواز آج کی ترقی پسندی، روشن خیالی اور آزاد روی کی علامت قرار پاتی ہے۔

آپ بھی سنیے

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں — چمن میں آتشِ گل کے سنگھار کا موسم
بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے — فروغِ گلشن وصوتِ ہزار کا موسم

فیض کے پیچھے پیچھے پاکستانی شاعری کے منظر نامے میں کڑی سے کڑی ملی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور ایک ایسی زنجیر سی بنتی نظر آتی ہے جس کا ہر حلقہ موئے آتشِ دیدہ ہے۔ فیض نے لکھا ہے

''ہمارا یقین ہے کہ ہر سنجیدہ لکھنے والا کومٹ منٹ رکھتا ہے اس کی اپنی ذات سے وابستگی ہوتی ہے اور اپنے فن سے ہوتی ہے اسے اس کی وفاداری کو جو اسے اپنی ذات اور فن سے ہے نبھانا چاہیے اور کسی قسم کے خوف سے اپنی وفاداری اور اپنی رائے ترک نہیں کرنی چاہیے۔ موقع پرستی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے اور اسے چند ٹکوں کے عوض اپنا فن اور اپنا نظریہ نہیں بیچنا چاہیے۔ اسے اپنے تجربات اور مشاہدات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے بے وفائی نہیں کرنی چاہیے اور نہ اسے مصلحت آمیز رویہ اختیار کرنا چاہیے اور نہ کوئی بیرونی دباؤ قبول کرنا چاہیے۔ لکھنے والا اپنا ملک اور اپنے عوام کا وفادار ہوتا ہے اور وہ عوام کا دوست اور ان کا دانشور اور ان کا رہنما ہوتا ہے۔ اس کا کام ہے عوام کو جہالت ،توہمات ، روایات اور تعصبات کے اندھیرے سے نکالنا اور علم و دانش کی روشنی کی طرف لے جانا۔ اس کا کام ہے عوام کو جبر سے آزادی کی طرف اور مایوسی سے اُمید کی طرف لے جانا۔'' ؎

ہم نے اب تک ترقی پسند تحریک کی کل ہند اور کل پاکستان کانفرنسوں میں پڑھے جانے والے اعلان ناموں کی تحریروں سے عمداً گریز کیا ہے تاہم فیض کی اس تحریر کو جسے ''اے اہلِ قلم تم کس کے ساتھ ہو'' کا عنوان دے کر معروف ترقی پسند دانشور عبداللہ ملک نے اپنے جریدے نے احتساب (۷۹-۱۹۷۸ء) میں اداریے کے طور پر شامل کیا تھا میں اختر حسین رائے پوری اور سجاد ظہیر کے ترقی پسند مصنفین کے اولین جلسوں کے اعلان ناموں اور منشی پریم چند کے اولین خطبہ صدرات کے تمام اہم نکات کے علاوہ عہد جدید کے تقاضوں کو بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ اسی لیے جب فیض کی نظمیں آجاؤ افریقا ،سر وادی سینا صنم دکھلائیں گے راہِ خدا ہم دیکھیں گے ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے ایک ترانہ مجاہدین فلسطین کے لیے اور آخری رات جب ڈھول کی تھاپ پر گائی جاتی ہیں تو لہو کی گردش خود بخود تیز ہو جاتی ہے۔ ایک نئی اُمنگ انگڑائی لینے لگتی ہے ایک نیا حوصلہ بزدلی کے پتلے کو نذرِ آتش کرتا ہوا انسان کے زندہ ہونے کی گواہی دینے لگتا ہے۔ یہ حوصلہ زمین سے ہارنے کے بجائے اٹھ کے اپنے حصے کا رزق اور پانی طلب کرتا ہے۔ یہ وہ لہجہ ہے جو آخر کار فریاد چھوڑ کر للکار بنتا ہے جو معرکۂ عشق میں پیچھے ہٹنے کی بجائے تلوار کھا کے بھی دستِ یار کا بوسہ لیتا ہے۔ یہ وہ لہجہ ہے جو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلسل ظلم وستم سہتے رہنے سے انکار کر کے انقلاب کا راستہ بناتا ہے۔

ستم سکھلائے گا رسمِ وفا ایسے نہیں ہوتا
صنم دکھلائیں گے راہِ خدا، ایسے نہیں ہوتا
گنو سب حسرتیں جو خوں ہوئی ہیں تن کے مقتل میں
مرے قاتل حسابِ خوں بہا ایسے نہیں ہوتا
ہر اک شب ہر گھڑی گزرے قیامت یوں تو ہوتا ہے
مگر ہر صبح ہو روزِ جزا ایسے نہیں ہوتا
رواں ہے نبضِ دوراں گردشوں میں آسماں سارے
جو تم کہتے ہو سب کچھ ہو چکا ایسا نہیں ہوتا

اب فیض کے بعد جاری ہونے والے چشمہ فیض رساں کی مختلف صورتیں ملاحظہ کیجیے:

عالم ہجر میں سویا ہوں نہ سونا چاہوں
میں تیری ذات سے مایوس نہ ہونا چاہوں
میں ہوں اک طرفہ بھکاری کوئی میری بھی سنو
رات کے فرش پہ کرنوں کا بچھونا چاہوں
گل ترے دل میں کھلیں اور مہک جاؤں میں
اسی رشتے میں ہر انساں کو پرونا چاہوں
میرا منصب نہیں پیغمبر فن بننے کا
میں تو احساس کو لفظوں میں سمونا چاہوں
اس زمانے کا عجب طرزِ تصوف ہے ندیم
کہ میں قطرے میں سمندر کو ڈبونا چاہوں

(احمد ندیم قاسمی)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اب جو لوگ دیکھیں گے تو خواب اور طرح کے
اس شہر پہ اُتریں گے عذاب اور طرح کے
اب کے نہ تو چہرے ہیں نہ آنکھیں ہیں نہ لب ہیں
اس عہد نے پہنے ہیں نقاب اور طرح کے
سو تیر ترازوں ہیں رگِ جاں میں تو پھر کیا
یاروں کی نظر میں ہیں حساب اور طرح کے
واعظ سے فراز اپنی بنی ہے نہ بنے گی
ہم اور طرح کے ہیں جناب اور طرح کے
بزمِ مقتل جو سجے کل تو یہ امکاں بھی ہے
ہم سے بسمل تو رہیں آپ سے قاتل نہ رہیں
یوں تو ہر شخص ہے اندیشہ رہزن کا اسیر
کارواں نیتِ رہبر سے بھی غافل نہ رہیں

میں کس کا بخت تھا میری تقدیر کون تھا — تو خواب تھا تو خواب کی تعبیر کون تھا
میں بے گلیم لائقِ دشنام تھا مگر — اہلِ قبا میں صاحب توقیر کون تھا
میزاں بدست کون لرزتا رہا فراز — منصف تھا کون صاحب تقصیر کون تھا

احمد فراز

شکارِ گردشِ لیل و نہار وہ بھی تھے — سکوں ہمیں بھی نہ تھا بے قرار وہ بھی تھے
سزا قبول مگر اتنا سوچ لو کہ یہاں — جو تم سے پہلے تھے بااختیار وہ بھی تھے

ظہور نظر

بے سبب بیٹھے رہے دیدۂ بے دار کے ساتھ — ظلمتیں کم نہ ہوئیں صبح کے آثار کے ساتھ
ابھی کچھ اور کڑی دھوپ میں چلنا ہوگا — ربط اتنا نہ بڑھا سایۂ دیوار کے ساتھ

ظہیر کاشمیری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جب گھر سے نکل آئے پھر کس کا پتا رکھنا یہ شوق کی بازی ہے کیا کھونا ہے کیا رکھنا

غیروں پہ نہ کھل جائے جو دل پہ گزرتی ہے رخساروں پہ آسودہ کچھ رنگ حنا رکھنا

ناموسِ محبت کو درکار لہو ہوگا یہ فرض ادا کرنا یہ قرض ادا رکھنا

ہیں ہاتھ تو اپنے ہی پر تیغ ہے اوروں کی تسلیم و رضا والو گردن نہ جھکا رکھنا

ہلکان ہوئے شہرت سن سن ترا افسانہ باقی جو رہا اس کو کل شب پہ اُٹھا رکھنا

(شہرت بخاری)

میرے دیدہ ورو/ میرے دانشورو/ پاؤں زخمی سہی/ ڈگمگاتے چلو

راہ میں سنگ وآہن کے ٹکراؤ سے/ اپنی زنجیر کو جگمگاتے چلو

میرے دیدہ ورو/ اپنی تحریر سے/ اپنی تقدیر کو/ نقش کرتے چلو

تھام لو ایک دم/ یہ عصائے قلم ایک فرعون کیا/ لاکھ فرعون ہوں/ ڈوب ہی جائیں گے

(شیخ ایاز سندھی سے ترجمہ)

گرے دیوار اُٹھانے والے مرگئے موت سنانے والے

ڈگمگائے نہ سرِ مقتل بھی عشق کی رسم نبھانے والے

اس سیہ رات پہ بھاری ہوں گے خون سے شمعیں جلانے والے

اپنی راہوں میں بکھر جائیں گے صبح کی راہ میں آنے والے

عباس اطہر

میرے ہر آج کو گزشتہ بنانے والوں نے/ اپنے نام کے سامنے اوصاف/

اور میرے نام کے سامنے دُشنام لکھی ہے/ میری تاریخ کو زنجیر پہنانے والوں نے/

میرے گھر کے سامنے سلاخیں/ اور اپنے گھر کے سامنے عشقِ پیچاں کی بیل سجالی ہے

(روزنامچہ از کشور ناہید)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کوفۂ عشق میں / میری بے چارگی / اپنے بالوں سے چہرہ چھپائے ہوئے /
ہاتھ باندھے ہوئے / سر جھکائے ہوئے / زیرِ لب ایک ہی اسم پڑھتی ہوئی /
یا غفور الرحیم / یا غفور الرحیم

(پروین شاکر)

میں بھوک پہنوں میں بھوک اوڑھوں میں بھوک دیکھوں میں پیاس لکھوں
برہنہ جسموں کے واسطے میں خیال کاتوں کپاس لکھوں
سِسک سِسک کر جو مر رہے ہیں میں ان میں شامل ہوں اور پھر بھی
کسی کے دل میں امید بوؤں کسی کی آنکھوں میں آس لکھوں
مرا سفر ہے سمندر ایسا جدھر بھی جاؤں بکھر کے جاؤں
کہیں اُچھالوں میں موجِ وحشت کہیں میں خوف و ہراس لکھوں

اقبال ساجد

پرندے سرِ شاخ پیوند ہیں شجر جنگلوں میں نظر بند ہیں
ہمی لوگ ہوتے تھے آئینہ گر ہمی لوگ آئینہ پابند ہیں

جمال احسانی

ہم سفر یہ جوت دلوں میں جلنے دو خواب میں جلنے والوں کو بھی جلنے دو
شاید کچھ تعمیرِ نو کی بات چلے یہ فرسودہ قصر وایوان جلنے دو
آخر اک دن سچ کا سورج نکلے گا اور کوئی دن جھوٹ کا سکہ چلنے دو
چھم چھم کرتی ناچتی رُت بھی آئیگی موسمِ غم کی اندھی رات کو ڈھلنے دو
فارغ کتنے ہی آشوب ہیں راہوں میں نسلِ نو کو طوفانوں میں پلنے دو

(فارغ بخاری)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حبسِ شب ہو تو اُجالے بھی ترے شہر سے آئیں
خواب دیکھوں تو حوالے بھی ترے شہر سے آئیں
تیرے ہی شہر میں سر تن سے جدا ہو جائے
خوں بہا مانگنے والے بھی ترے شہر سے آئیں
وقت جب بیعتِ ہر سنگ پہ اصرار کرے
آئینہ مانگنے والے بھی ترے شہر سے آئیں

(افتخار عارف)

تم کہتے ہو / ہاتھ تمہارے لمبے ہیں / کیا بارش کی دھاروں سے زیادہ لمبے ہیں / کیا سورج کی کرنوں سے زیادہ لمبے ہیں / کیا معصوموں کی چیخ سے زیادہ لمبے ہیں / کیا میرے وطن کے نقشے سے بھی لمبے ہیں / ہاتھ تمہارے اخباروں کی سرخیوں جتنے لمبے ہیں / یہ فردِ جرم کی تحریروں اور سازش جتنے لمبے ہیں / کیا ہاتھ تمہارے دھوپ اور خوشبو جیسے لمبے ہو سکتے ہیں / میری عمر میں شامل جتنی عمریں ہیں / کیا ہاتھ تمہارے اس سے آگے بڑھ سکتے ہیں / ہاتھ تمہارے ...

(اصغر ندیم سید)

یہ سب اشعار اور نظمیں اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہیں کہ ادب اور سماج کے بیچ بڑا گہرا تعلق ہے۔ خارج کا تجربہ ہو یا وارداتِ دل سماج ہی فن کی کسوٹی ہے قطع نظر تبلیغ یا مقصدی ادب سے کہ ابتدا میں ترقی پسند مصنفوں نے ایک مینی فیسٹو کی تبلیغ اور نظریے کے پرچار ہی کو پیش نظر رکھا مگر ہم نے دیکھا کہ مقصدیت اور نظریہ جب بھی تخلیقی مزاج اور تخیلی صداقتوں سے ہم آہنگ ہوا تو اُردو شعر و ادب میں ایک نئی توانائی ایک نئی قوت اور ایک نئی زندگی پیدا ہوئی۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن

''ترقی پسند تحریک کی بڑی خدمت یہ ہے کہ اس نے ادب کی سماجی اہمیت کو واضح کیا اور تخلیقی عمل میں شعور کو اس کا صحیح مرتبہ بخشا۔'' ۵

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسی طرح ترقی پسندوں کے ترجمان علی سردار جعفری کا کہنا بھی بجا ہے کہ

''ترقی پسند ادیبوں نے سیاسی اور سماجی زندگی کے اتنے پہلوؤں پر قلم اُٹھایا ہے کہ ان کی تخلیقات سے ہندوستان کی جنگ آزادی کی ہر منزل اور ہر موڑ کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے مجموعی حیثیت سے ترقی پسند ادب کا لہجہ پُر وقار جذبہ ہمت افزا اور انداز فاتحانہ ہے''۔ ۶

انور سدید نے ترقی پسند تحریک کی حمایت میں یہ دلیل دی ہے۔

'' ترقی پسند تحریک کی ابتدا ہوئی تو یہ دونوں دھارے (رومانیت اور حقیت نگاری) آپس میں مل گئے چنانچہ تحریک نے اقبال کی رومانیت سے تخلیقی قوت اور جوش کی رومانیت سے بغاوت کا جذبہ حاصل کیا۔ پریم چند کی حقیقت نگاری نے اسے زمین کی طرف متوجہ کیا اور ان سب کے امتزاج کو بھی نوع انساں کی بہبود میں صرف کرنے کے لیے ادب کی فکر کو داخل سے خارج کی طرف پیش قدمی کی راہ دکھائی۔'' ۷

ان سب اقتباسات سے ترقی پسند تحریک کے مثبت رویوں کا احساس ہوتا ہے تاہم ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ترقی پسند تحریک جس کا ایک باقاعدہ منشور تھا۔ جس میں ادب کی تخلیق کے لیے ضابطے مقرر کیے گئے تھے اور موضوعات کی تخصیص کی گئی تھی ہندوستان کی شہروں میں تحریک کے مراکز قائم کیے گئے تھے اور مخصوص مطالب برلانے کے لیے رسائل جاری کیے گئے تھے جن کے ذریعے غیر ترقی پسند ادب کو انحطاطی قرار دے کر ادیبوں پر ان رسائل میں اشاعت کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے گویا یہ امر واقعہ ہے کہ اس تحریک کی تعمیر میں خرابی کی ایک صورت بھی مضمر تھی جس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے احمد علی نے جو اولین ترقی پسند افسانوی مجموعے 'انگارے' کے شریک افسانہ نگار بھی تھے نے ابتدا ہی میں تحریک سے علیحدگی اختیار کرتے ہوئے لکھا تھا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''کسی ادبی تحریک کو اس بات کا حق نہیں کہ وہ مصنفوں کے ہاتھ جکڑ دے اور ان کے حقِ رائے اور تحریر کی آزادی کو چھین کر اسے ایک مخصوص نظریے پر عمل پیرا ہونے پر مجبور کرے''۔ ۸

اور پھر جب ۱۹۴۴ء بمبئی کو تحریک کے مرکز کی حیثیت حاصل ہوئی تو چوتھی کل ہند ترقی پسند کانفرنس کے ذریعے ادب میں نعرہ بازی کو اہمیت ملی اور ادب کو سیاست کے طابع کرنے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔''۹ یہ صحیح ہے کہ بمبئی اس وقت ایک بڑا صنعتی مرکز تھا جہاں سرمائے کی غیر مساوی تقسیم نے معاشرے کو آجر اور مزدور میں بانٹ دیا تھا یہ دو طبقے تو آج بھی اسی طرح اسی شکل اور اسی حالت میں موجود ہیں چنانچہ وقتی طور پر جلانے جھونک دینے اور چھین لینے کی باتیں ہوئیں انقلابی پھریرے لہرائے جانے لگی نعرے بلند ہوئے ٹریڈ یونینیں بنیں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کو حکومتی سطح پر تسلیم کر لیا گیا لہذا بمبئی کے ادیبوں اور شاعروں کے یہاں بھی اس کا اثر صاف نظر آنے لگا۔ مجاز جیسے رومانی شاعر کے یہاں بھی وقتی جوش اور جذباتیت غالب آتی دکھائی دینے لگی۔ دیکھیے

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

لیکن پھر جلد ہی ہمیں ترقی پسند شاعروں کے یہاں ایک سنبھلی ہوئی، معتدل اور متاثر کن انقلابیت دکھائی دیتی ہے۔ فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، مخدوم، مجاز، جاں نثار اختر، اختر الایمان، کیفی اعظمی اور احمد فراز نے تبدیلی پیدا کرنے کے مقاصد کو بہتر طریقے سے پیش کر کے اپنی شاعری کو غیر ترقی پسند حلقوں میں بھی مقبول بنایا۔ جیسے کیفی اعظمی کے یہ اشعار:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہم وہ راہی ہیں جو منزل کی خبر رکھتے ہیں　　پاؤں کانٹوں پہ شگوفوں پہ نظر رکھتے ہیں
کتنی راتوں سے نچوڑا ہے اُجالا ہم نے　　رات کی قبر پہ بنیاد سحر رکھتے ہیں

ان اشعار میں تپش بھی ہے اور گداز بھی:

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی
سب اُٹھو میں بھی اُٹھوں تم بھی اُٹھو تم بھی اُٹھو
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی

ترقی پسند تحریک نے ہی کیفی کی شاعری کو یہ فکری جلا بخشی تھی۔ [۱۰]

فیض، ندیم، مخدوم، مجاز، جاں نثار اختر، اختر الایمان اور کیفی اعظمی کی فکر کا تسلسل آج بھی موجود ہے تاہم یہ ضرور ہے کہ بدلتے ہوئے تقاضوں کے تحت موجودہ دور میں بات کہنے کے قرینے تبدیل ہو گئے ہیں۔ لہجہ بدلا ہوا، لفظیات کسی حد تک [محو] اور معروضیت زیادہ نمایاں دکھائی دینے لگی ہے۔ دیکھیے

دن بھر تو بچوں کی خاطر میں مزدوری کرتا ہوں
رات کو اپنی غیر مکمل غزلیں پوری کرتا ہوں
شام کو سیٹھ مل مالک ساری خوشبو لے جاتا ہے
لوہے کی میں ناف سے پیدا جو کستوری کرتا ہوں

(تنویر سپرا)

انسان کے مقسوم کو بدلنے کی خواہش آج بھی شاعری میں نئے نئے پیرائے اور نئے نئے قرینے پیدا کرتی ہے۔ آل احمد کا یہ شعر بھی اپنے لہجے اور لفظیات کے اعتبار سے متاثر کرتا ہے:

ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو کیا سوچتے ہو
شب کی شہ رگ پہ چھری رکھو سویرا ہوگا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ سب مضامین ظاہر کرتے ہیں کہ آج کی ترقی پسند شاعری کی بیداری، روشن خیالی اور اپنی پہچان کا حوالہ ہے آج بھی تحریک کی فکر اور رویہ اپنا راستہ خود بنا رہا ہے۔ آج یہ کسی کمیونسٹ پارٹی کا ضمیمہ نہیں۔ [۱۱]

آج کا ترقی پسند ادب اپنی تہذیبی، ادبی اور تاریخی روایات سے بے گانہ نہیں۔ آج کا شاعر تلخ حقائق سے دوچار ہونے کے باوجود، اثباتی نقطۂ نظر پیش کر رہا ہے۔ کل کے ترقی پسندوں کے بہت سے تحفظات اب اس شدت کے ساتھ باقی نہیں رہے بلکہ یوں کہنا شاید زیادہ مناسب ہوگا کہ پاکستان اور بھارت کے علاوہ ساری دنیا میں آج مزاحمتی شاعری ترقی پسندی ہی کی توسیع ہے یوں دیکھا جائے تو اب دنیا کو مذہبی جنونیت، فرقہ پرستی، شدت پسندی، ہوس ملک گیری اور بڑی طاقتوں کے دوسری اور تیسری دنیا کے مادی وسائل پر مکمل اختیار حاصل کرنے جیسے مسائل کا سامنا ہے اس شدت پسندی کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مطالبہ ادیبوں اور شاعروں سے ہی کیا جاسکتا ہے حکمرانوں، پالیسی سازوں یا سیاست دانوں سے نہیں۔ کشور ناہید کی تازہ نظم "پاؤں کی بیڑیاں" سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے اور محسوس کیجیے کہ شاعری حقیقت اور سراب کے درمیان کیفیتوں کو کس طرح بیان کرسکتی ہے۔

چھت پر اکیلے ٹہلتے ہو / مکالمہ یا غصہ / میرے اندر کے اندھیرے کے خلاف /
لڑنے کا عمل تھا / مجھے بار بار یہ یقین اس ضد پہ اُکساتا تھا / کہ کسی سرزمین پہ کسی جگہ تو /
خوش گوار صبح طلوع ہو رہی ہوگی / میں اسی تلاش میں اپنی آواز کے پیچھے بھاگتی رہی /
میں اسی تلاش میں انکار کی ہر سرحد عبور کرتی گئی / میں اسی تلاش میں /
ستاروں، چاند اور سورج کی ماں بن گئی

(کشور ناہید)

اب حالات بہتری کی طرف مائل ہیں لہذا دونوں طرف کے ادیبوں کو ان مسائل پر بھی غور کرنا چاہیے اور ان اسباب و علل کو سمجھنا چاہیے جو گزشتہ نصف صدی سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مخاصمت کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد کے حالات کا معروضی انداز میں جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ باہمی اعتماد کے ساتھ ایک نئے دن اور ایک نئے دور کا آغاز ہی دونوں طرف کی عوام کے لیے خوش حالی اور امن کی نوید دے گا۔

گلاب بوئے ہوں جس نے گلاب ہی کاٹے
یہ ایک خواب سہی پھر بھی ہو تو سکتا ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک

سائنسی طرزِ فکر اور طرزِ معاشرت کی ترغیب، اور مثبت قدروں کو مستحکم کرنے کی کوشش ترقی پسندی ہے

جاوید اختر

انجمن ترقی پسند مصنفین، یہ چار لفظ سنتے ہی ذہن کے افق پر کتنے ہی ناموں کے ستارے جگمگا اٹھتے ہیں۔ فیض، مجاز، کرشن چندر، علی سردار جعفری، مخدوم، عصمت چغتائی، ساحر، صفیہ اختر، کیفی اعظمی، راجندر سنگھ بیدی، مجروح اور ایسے ہی کتنے ناموں کا ایک سلسلہ ہے جو ایک کہکشاں کی طرح یادوں کے آسمان پر نمودار ہوتا ہے اور ہم حیران سے رہ جاتے ہیں کہ بقول شاعر: ع

اک زمانہ تھا کہ سب ایک جگہ رہتے تھے

کیا کیا یاد آ جاتا ہے کتنی نظموں کے عنوان، کتنی غزلوں کے اشعار، کتنے افسانوں کے کردار، ذہن و دل کو گھیر لیتے ہیں کیسی کیسی تصویریں بنتی ہیں۔ یہ بجھتا ہوا روزنِ زنداں، وہ شانۂ بام پہ چاندنی کا دستِ جمیل۔ یہ کسی مفلس کی جوانی، وہ کسی بیوہ کا شباب۔ یہ کالو بھنگی کے چہرے پر درد کی لکیریں، وہ کسی ٹیڑھی لکیر کی طرح بڑھتی شمن کی بے ڈھنگی سی زندگی۔ یہ جلتا ہوا پنجاب، وہ کشمیر کے پھول سے بدن پر لگے ہوئے زخم۔ یہ اودھ کے ایک کچے آنگن میں بیٹھی تنہا لڑکی، جس کی چوتھی کا جوڑا سیاست کے صندوق میں بند ہے۔ وہ بمبئی کے فٹ پاتھوں پر جوتا پالش کرتے، اخبار بیچتے بے گھر، بے در بچے۔ پتھر کی دیوار سے سر ٹکراتے انقلاب کے نعرے، وہ کوئی خاموش آواز سے پکارتا ہے کوئی پھر اسی دیوار سے ٹکراتا ہے، جسے کل وہ توڑ چکا ہے۔ کہیں شہیدوں کے جسم موم کی طرح پگھل رہے ہیں۔ یہ نئی جگہ ہے، یہاں سے آج تک تاج محل کو کس نے دیکھا تھا۔ کوئی اکیلا ہی جانب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

منزل چلا، اور کارواں بنتا گیا۔

اس انجمن، اس تحریک کے بارے میں سوچنا تو ہوگا۔کون لوگ اس سے منسلک تھے۔وہ کیا کرنا چاہتے تھے۔وہ کیا کر سکے۔وہ کہاں کتنے کامیاب ہوئے۔وہ کہاں اور کیوں ناکام ہوئے۔سوچنا ہوگا۔

راوی اکثر مشہور زمانہ ''انگارے'' کی اشاعت، اور بعدازاں چند روشن خیال نوجوان ادیبوں کی لندن کے ایک ریستوران میں منعقدہ ایک میٹنگ کو اس تحریک کی ابتداء بتاتے ہیں۔میرا خیال ہے کہ کسی بھی شے کی ابتداء اس کے ہونے کا سبب نہیں ہوتی۔ ابتداء تو ہوتی ہی تب ہے جس کے ہونے کے اسباب فراہم ہو چکے ہوں۔ہمیں اس تحریک اور اس تحریک کے مزاج کو سمجھنے کے لیے ان حالات کو بھی سمجھنا ہوگا، جو اس کے ہونے کی وجہ بنے، اور اس کام کے لیے ہمیں تاریخ کے کچھ صفحات الٹنے ہونگے۔

ایک طرف ہمیں ہندوستان پر برطانوی استبداد، اور اس کے ردِعمل پر نظر ڈالنی ہوگی، اور دوسری طرف یورپ میں بدلتے نظام، اور دنیا پر اسکے اثرات کا جائزہ لینا ہوگا۔

انگلستان میں صنعتی انقلاب کے بعد جاگیردارانہ نظام اپنا تسلط کھو رہا تھا۔ سرمایہ داری کا دور دورہ تھا۔سرمائے، پیداوار اور مزدور کے رشتوں میں نمایاں تبدیلیاں آ رہی تھیں۔یوں تو جاگیردارانہ نظام بھی ایک ایسا ہی معاشرہ تھا، جس کی بنیاد استحصال پر تھی۔استحصال کے جو مواقع تھے وہ پوری طرح استعمال کیے جاتے تھے، کوئی کسر نہیں چھوڑی جاتی تھی۔مگر یہ صنعتی نظام اس معاملے میں اس سے بھی چار جوتے آگے تھا۔اس نئے نظام نے مزدور کے استحصال کے ان گنت نئے مواقع فراہم کیے۔جاگیردارانہ نظام کے مزدور یعنی کسان کا بہر حال پیداوار سے ایک رشتہ تھا۔صنعتی نظام میں مزدور اور پیداوار کا کوئی رشتہ باقی نہیں رہا۔جاگیردارانہ نظام جو زراعتی نظام تھا وہاں عملاً دو ہی طبقات تھے، جاگیردار اور کسان، استحصال بھی براہ راست اور سادہ تھا مگر سرمایہ دارانہ نظام کو اپنے معاشی استحصال کا کارخانہ چلانے کے لیے مزدور کے علاوہ کچھ پڑھے لکھے لوگوں کی بھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضرورت تھی۔لہٰذا سرمایہ دار اور مزدور کے بیچ ایک نیا طبقہ ابھرا، جسے ہم متوسط طبقہ کہتے ہیں۔یہ طبقہ تعلیم یافتہ تھا۔یہ الگ بات ہے کہ بعد میں اسی طبقے سے ایسے لوگ اٹھے جنھوں نے سرمایہ دارانہ استحصال کے خلاف مزدور کی آواز سے آواز ملائی۔لیکن یہ بات بہت بعد کی ہے۔

صنعتی دور کی ابتداء میں مزدوروں کے مفادات کے لیے قوانین نہیں تھے، اور سرمایہ دار پوری شدت سے اس خیال کے مخالف تھے کہ اس قسم کا کوئی قانون بنے۔ایک مزدور اٹھارہ گھنٹے کام کرتا تھا اور اس کی اجرت صرف اتنی تھی کہ وہ زندہ رہ سکے۔اور اگلے چھ گھنٹے بعد پھر اٹھارہ گھنٹے کے لیے کام کر سکے۔کسی فنڈ یا پنشن کی بات تو جانے دیجیے کوئی چھٹی کا دن بھی نہیں تھا اور طرہ یہ کہ اس بدترین استحصال کو فلسفیانہ وقار دیا جا رہا تھا۔

Adam Smith (1723-1790) نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف The Wealth of Nations میں اس بات پر زور دیا کہ اقتصادی امور کو سیاسی مسائل سے مکمل طور پر علیحدہ کر دینا چاہیے، کیوں کہ بہتر یہی ہے کہ بزنس اور دیگر معاشی سرگرمیوں پر سیاست کا کوئی انگش نہ ہو۔Adam Smith بزنس پر مملکت کے کسی بھی طرح کے کنٹرول کا سخت مخالف تھا۔

ایک اور ماہر اقتصادیات David Ricardo(1772-1823) نے یہ نظریہ پیش کیا کہ سرمایہ دار کو اختیار ہونا چاہیے کہ وہ صرف اسی شے کی پیداوار جاری رکھے، جس کے لیے اسکے پاس وافر ذرائع اور مزدور موجود ہیں۔اس طرح پیداوار کی لاگت میں کمی ہوگی۔سرمایہ دار کو یہ اختیار بھی ہونا چاہیے کہ وہ اپنی پیداوار کسی بھی ملک میں بلا روک ٹوک فروخت کر سکے۔Ricardo عالمی سطح پر کھلے بازار کا حامی تھا۔آجکل اس نقطۂ نظر کا تخلص گلوبلائزیشن ہے، کہیں کہیں سے یہ قصہ سُنا سا لگتا ہے۔

اس ضمن میں بات تب تک پوری نہیں ہوگی جب تک انگلستان کے ایک مفکر Herbart Spencer(1820-1903) ہربرٹ سپنسر کا ذکر نہ کیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جائے۔ سپنسر بزنس میں کسی بھی قسم کی مملکتی مداخلت کا سخت مخالف تھا اس نے ایسے قانون اور تصور کی بھرپور مخالفت کی ہے جو فیکٹری میں کام کرنے والے مزدور کی کسی بھی طرح کی حفاظت کی خاطر ہو۔

صورتِ حال یہ تھی کہ نہ صرف یہ کہ مزدور کا بدترین استحصال ہو رہا تھا بلکہ اس استحصال کی ڈھٹائی سے حمایت بھی کی جارہی تھی اس کا ردِ عمل تو ہونا ہی تھا اور وہ ہوا ۱۸۴۸ء میں جب ایک کتابچہ شائع ہوا تو معلوم نہیں کتنے لوگوں کو یہ احساس یا علم تھا کہ یہ کتابچہ انسانی تہذیب و تمدن کے تقریباً ہر گوشے کو متاثر کرنے والا ہے۔ دنیا کا تقریباً ہر ایک ملک اس کتابچے کی موافقت یا مخالفت میں، لیکن بہر حال اس کتابچے کے باعث اپنے اندر کوئی تبدیلی لائے گا۔ کون جانتا تھا کہ اس کتابچے کے الفاظ کی گونج صدیاں سنیں گی۔ یہ کمیونسٹ مینی فیسٹو تھا۔

یہی کمیونسٹ مینی فیسٹو تقریباً نوے برس بعد ایک نوجوان اُردو شاعر نے بھی پڑھا جو اس وقت تک محض رومانی شاعری کر رہا تھا جس کا ذکر وہ اپنے ایک ایک خط میں یوں کرتا ہے،

> ''ایک دن صاحب زادہ محمود الظفر نے ایک پتلی سی کتاب میرے حوالے کی اور کہا، ''یہ پڑھو لیکن غیر قانونی کتاب ہے۔'' اس لیے ذرا احتیاط سے رکھنا یہ کتاب تھی 'کمیونسٹ مینی فیسٹو'، جو میں نے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی۔ یوں محسوس ہوا کسی نے پورے خزانہ اسرار کی کنجی تھما دی ہے۔ یوں سوشلزم اور مارکسزم نے اپنی دلچسپی کی ابتداء ہوئی۔ پھر لینن کی کتابیں پڑھیں۔ پھر سوویت معاشرے کے بارے میں دوسرے انقلابی ادیبوں کی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اسی زمانے میں ہندوستانی ترقی پسندی مصنفین کی انجمن قائم ہوئی۔ یہ سب پڑھ کے ہم نے اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوسری تصویر میں رنگ بھرنا شروع کیا۔"

یہ واقعہ اُنیس سو پینتیس کا ہے جس کا ذکر فیض احمد فیض نے ایک عرصے بعد اپنے ایک خط میں کیا ہے۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد اٹلی میں فسطائیت اور جرمنی میں نازی ازم کے سائے پھیلنے لگے تھے۔ جنگ کے آخری مراحل کے دوران ہی روس میں بولشیوک انقلاب رونما ہو چکا تھا۔ یہ بحث کہ اس تعمیر میں ہی ایک خرابی صورت مضمر تھی، ہوتی ہے، اور ہوتی رہے گی۔ اس سلسلے میں مختلف نقطۂ نظر ممکن ہیں لیکن بہر صورت اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے کہ انقلاب روس کے باعث دنیا بھر کے مزدوروں تہی دستوں اور سامراج کے شکنجے میں مجبور دبے کچلے سسکتے لوگوں کو ایک نیا حوصلہ ملا۔ نئے خواب دیکھنے کی جرات ملی۔ زندگی کو بہتر بنانے کا مثبت جذبہ ایک قد آور شجر کی مانند بلند سے بلند تر ہو رہا تھا اور اس کی شاخوں سے نئی شاخیں پھوٹ رہی تھیں۔ ترقی پسند تحریک بھی ایسی ہی ایک شاخ کا نام ہے۔

ترقی پسند تحریک کا یہ بین الاقوامی پس منظر انتہائی اہم ہے لیکن محض پس منظر مکمل تصویر نہیں ہوتا۔ ہم ہندوستانی ترقی پسند تحریک کو اس کی اپنی زمین کے تاریخی، سماجی، سیاسی اور معاشی سیاق و سباق میں رکھے بغیر پوری طرح پرکھ نہیں پائیں گے۔

ہندوستان پر برطانوی تسلط کے سبب ہندوستانی دانشوروں اور مصلحین قوم نے دو مختلف بلکہ یوں کہیے کہ دو متضاد نظریات کو اپنایا۔ ایک نظریہ تو وہ تھا جس کے داعی راجہ رام موہن رائے جیوتی با پھلے اور بعد کے کئی مصلحین تھے۔ یہ لوگ انگریزی تعلیم کی پر زور حمایت میں تھے۔ یہاں ایک بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ راجہ رام موہن رائے نے انگریزی تعلیم کی بات اس وقت کی تھی جب انگریز حکمرانوں نے اس بارے میں سوچا تک نہیں تھا۔ لارڈ میکالے کی مشہور زمانہ Minutes of Education راجہ رام موہن رائے کے انتقال کے دو برس بعد یعنی ۱۸۳۵ء میں شائع ہوئی۔ راجہ رام موہن رائے اور میکالے کی نیت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ راجہ رام موہن رائے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انگریزی تعلیم کے ذریعے ایک سائنٹیفک اور معروضی طرزِ فکر رائج کرنے اور مذہبی توہم پرستی اور دوسری سماجی برائیوں کو مٹانے کی کوشش میں تھے۔ جب کہ میکالے انگریزی تعلیم سے ایک ایسے متوسط طبقے کا فروغ چاہتا تھا جو حکمرانوں کی مشین کا پُرزہ بن سکے۔

دوسرا نظریاتی اسکول ان قدامت پرستوں کا تھا جنھوں نے راجہ رام موہن مخالفت کی انہیں غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس مخالفت کا سبب نہ انگریز حکمران تھے نہ انگریزی زبان بلکہ وہ اصلاحات تھیں جن کے لیے راجہ رام موہن رائے کوشاں تھے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ راجہ رام موہن رائے نے انیسویں صدی کے آغاز میں ہی جدید انگریزی تعلیم کے لیے کوشش شروع کر دی تھی۔ جب کہ مسلمانوں میں اس کا خیال بھی ۱۸۵۷ء تک نہیں آیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہی سر سید اور ان کے رفقاء کی علی گڑھ تحریک اس راستے پر گامزن ہوئی۔ مسلمانوں میں بھی احیاء پسندوں کا مکتب فکر موجود تھا جس کی ابتداء تو وہابی تحریک سے ہی ہو چکی تھی۔ سر سید اور ان کے رفقاء کی پرزور مخالفت بھی ہوئی۔ ان کے ہم عصروں میں اکبر الہ آبادی بھی انھیں اکثر اپنے طنزیہ اشعار کا نشانہ بنائے رکھتے تھے:

کیا جانیے سید تھے حق آگاہ کہاں تک
سمجھے نہ کہ سیدھی ہے مری راہ کہاں تک

اکبر الہٰ آبادی کا ایک قطعہ بہت مشہور ہے جو انھوں نے اپنے بیٹے عشرت کے لیے لکھا ہے:

عشرتی گھر کی محبت کا مزا بھول گئے
کھا کے لندن کی ہوا عہدِ وفا بھول گئے
پہنچے ہوٹل میں تو پھر عید کی پروا نہ رہی
کیک کو چکھ کے سویوں کا مزہ بھول گئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پھر موقع ملے نہ ملے ایک سوال پوچھتا چلوں میں، جو میرے ذہن میں ایک عرصے سے ہے اس کا جواب آپ بھی سوچیے گا۔ وہ اکبرالہٰ آبادی جو مغربی تعلیم کو اتنے شک اور اتنی ہی حقارت آمیز نظروں سے دیکھتے تھے ان کا اپنا لاڈلا عشرتی لندن کی ہوا کیسے کھا رہا تھا۔ جہاں وہ کیک چکھ چکھ کے سویوں کا مزہ بھول رہا تھا آخر اکبرالہٰ آبادی کا بیٹا لندن پہنچا کیسے؟ انھوں نے جانے کیوں دیا۔ یہ کوئی ایک اکبرالہٰ آبادی کی بات نہیں ہے یہ دورخی رویہ لوگوں میں آج بھی پایا جاتا ہے۔ آج ہمارے ملک میں جو لوگ ہندی کے علم بردار ہیں اور انگریزی کو غلامی کا آخری نشان بتا کے اسے مٹا دینے کی ترغیب دوسروں کو دیتے ہیں ان کے اپنے بچے انگریزی سکول میں پڑھتے ہیں۔ انگلینڈ، امریکا یا پھر آسٹریلیا جا کے فارغ التحصیل ہوتے ہیں۔ وہ حضرات جو مدرسوں کے نصاب میں کسی بھی طرح کی تبدیلی کے لیے تیار نہیں ہیں ان میں سے زیادہ تر کے بچے مدرسوں میں نہیں دوسرے سکولوں میں تعلیم پاتے ہیں۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ آیئے علی گڑھ تحریک کی طرف واپس چلیں۔

مسلمانوں میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ سرسید اور ان کے رفقاء نے اسلام کے بعض اصولوں پر ازسرِ نو سوچنے کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ اس ضمن میں سرسید، محسن الملک اور چراغ علی کی تحریریں آج بھی دستیاب ہیں جن میں اسلامی عقائد کی لبرل اور سائنٹیفک تشریحات ملتی ہیں۔ تاہم اس محاذ پر علی گڑھ تحریک کو کوئی کامیابی نہیں ملی مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس تحریک نے کہیں مسلمانوں کے اونچے اور متوسط طبقے میں ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا جو آگے چل کے ترقی پسند خیالات اور نظریات کے لیے سازگار ثابت ہوا۔

حالی کا شمار بھی سرسید کے رفقاء میں ہوتا ہے ان کا مقدمہ شعر و شاعری اُردو کی ایک نہایت اہم دستاویز ہے۔ گو کہ اس کے کئی معروضات کچھ لوگوں نے قابل قبول نہیں پائے پھر بھی مقدمے کی تاریخی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ حالی نے اس میں اُردو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شاعری اور خصوصاً غزل میں اصلاح کی بات کی ہے۔ وہ اُردو کی کلاسیکی شاعری کے گھسے پٹے موضوعات شمع پروانہ، گل وبلبل، عاشق ومعشوق، جام ومینا وغیرہ پر مسلسل طبع آزمائی کے مخالف تھے مقدمہ شعروشاعری میں ادب میں مقصدیت اور ادب کے افادی پہلو کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ ان معنوں میں حالی اور ان ہی کے ساتھ ساتھ محمد حسین آزاد کو بھی ترقی پسند تحریک کا پیش رو کہا جاسکتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد یہ دونوں حضرات لاہور میں اقامت پذیر ہو گئے تھے اور وہاں انھوں نے ایسے مشاعرے منعقد کیے جن میں مصرعہ طرح کے بجائے موضوعات دیے جاتے تھے اور ہر شاعر کو دیے گئے موضوع پر نظم لکھنی ہوتی تھی۔ اس قسم کا پہلا مشاعرہ ۱۸۷۴ء میں ہوا تھا۔ اس طرح اُردو شاعری کے موضوعات، لفظیات، تشبیہات اور استعاروں میں قابل قدر اضافہ ہونے لگا۔ شاعر اپنی ان حسرتوں اور تمناؤں سے پرے دیکھنے کا بھی عادی ہونے لگا جو صرف اس کی اپنی ذات سے وابستہ تھیں۔ کسی غلط فہمی کا امکان نہ رہے اس لیے ضروری ہے کہ دو باتیں پوری طرح واضح کردی جائیں۔ ایک یہ کہ حالی اور آزاد ترقی پسند تحریک کے پیش رو ہونے کے باوجود ترقی پسند تحریک کے بانی کسی بھی طرح سے نہیں تھے۔ حالی اور آزاد کی نیچرل شاعری اور ترقی پسند شاعری کے مزاج اور ماہیت میں جو فرق ہے اس کے بارے میں بھی ہم بات کریں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حالی اور آزاد کے دور میں بھی سماجی موضوعات اور ان پر اظہار خیال اُردو شاعری کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ قلی قطب شاہ سے غالب تک تقریباً ہر شاعر نے اپنے دور کے سماجی حالات پر کچھ نہ کچھ کہا ہے بلکہ اُردو شاعری کی ایک صنف شہرِ آشوب ہے جس میں شہر کے معاشرے کے حالات اور اس وقت کے مسائل کو منظوم کیا جاتا تھا بیشتر کلاسیکل شعراء نے شہر آشوب کہے لیکن اس صنف میں سودا اور نظیر کا بہت نام ہوا۔ سودا اپنے مخمس شہر آشوب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس
کہ جن کے دیکھے سے جاتی رہی تھی بھوک اور پیاس
اوراب جو دیکھو تو دل ہوئے زندگی سے اُداس
بجائے گل چمنوں میں کمر کمر سے گھاس
کہیں ستون پڑا ہے کہیں مرغول

اسی صنف میں نظیراکبرالہٰ آبادی کا ایک بند: ؎

مارے ہیں ہاتھ ہاتھ پہ سب یاں کے دست کار
اور جتنے پیشہ دار ہیں روتے ہیں زار زار
کوٹے ہے تن لوہار تو پیٹے ہے سر سُنار
کچھ ایک دو کے کام کا رونا نہیں ہے یار
چھتیس پیشے والوں کا ہے کاروبار بند

اس کے علاوہ میلوں ٹھیلوں ،تیج تیوہاروں ،ہولی ،دیوالی، بسنت پراُردو میں شروع سے ہی ان گنت نظمیں لکھی گئی ہیں ۔یہ اس بات کی علامت ہے کہ شاعر اپنے سماج سے بے تعلق تو کبھی نہیں تھا۔قومی یگانگت اور وسیع النظری شروع سے ہی اُردو شاعری کا مزاج رہے ہیں ۔کلاسیکل اُردوشاعری اپنے وقت کی سیاست پر بھی گاہے بہ گاہے نظر ڈالتی رہی ہے۔ میر کے دوایک شعرسنتے چلیے ۔میر کے دور میں مغل بادشاہ احمد شاہ کوتخت سے بے دخل کر کے اندھا کردیا گیا تھا: ؎

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاکِ پا اُن کی
اُنھیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

احمد شاہ ابدالی کے حملے کے بعد دہلی کی تصویر اس شعر سے جھلکتی ہے: ؎

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دل کی بربادی کی اس حد بے خرابی کو نہ پوچھو
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر گزرا

ایک اور شعر:

فصلِ گل آئی تو نخل دار پہ میرؔ
سرِ منصور ہی کا بار آیا

یا اور کھل کر بات کر لیتے ہیں: ؎

امیر زادوں سے دلی کے مت ملا میر
کہ ہم خراب ہوئے ہیں انھیں کی صحبت میں

غالب کا یہ شعر ۱۸۵۷ء کے قتل و غارت گری کے پس منظر کے ساتھ: ؎

قد و گیسو میں قیس و کوہ کن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

مجروحؔ کہتے ہیں: ؎

جنونِ دل نہ صرف اتنا کہ اک گلِ پیرہن تک ہے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

سردار جعفری کا ایک شعر: ؎

حکایت دل کی کیا، دار و رسن کی اک کہانی ہے
قد و گیسو کی لیکن داستان معلوم ہوتی ہے

غالبؔ کا شعر: ؎

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

فیضؔ کہتے ہیں: ؎

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پر مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقہ زنجیر میں زباں میں نے

نجانے کس کا مصرعہ ہے لیکن ایسے مواقع پر یاد آتا ہے:

سلطنت دست بہ دست آئی ہے

سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ اگر سلطنت دست بہ دست ہی آئی ہے تو ادب کو سماج سے جوڑنے کا سہرا ترقی پسند تحریک کے سر کیوں باندھا جائے۔ حالی اور آزاد کی نیچرل شاعری کی تحریک کے سر کیوں نہیں؟ اسکا جواب پانے کے لیے ان دونوں تحریکوں میں جو فرق ہے اسے سمجھنا ہوگا۔

ایک حالی اور آزاد کی ادبی تحریک میں سماجی شعور، افادی ادب اور تعلیمی بیداری کا چرچا تو خوب رہا لیکن سیاسی بیداری کا نام نہیں لیا گیا۔ اس کے برعکس ترقی پسند تحریک ایک سوشلسٹ معاشرے کو اپنا نصب العین مانتی رہی۔ حالی اور آزاد کی تحریک نے اپنے وقت کے حکمرانوں سے ٹکر نہیں لی۔ جب کہ ترقی پسند تحریک نے کھل کر انگریز سامراج کے خلاف لکھا۔ اس کے مصنفین نے اپنی اس جرات کے باعث قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلیں۔

دوسرے حالی اور آزاد کی تحریک کا تخاطب دراصل اونچے اور متوسط طبقے کے ان افراد سے ہی تھا جن کا شمار اشراف میں ہوتا تھا۔ اس تحریک کے دامن میں نائیوں، نان بائیوں، تانگے والوں، کسانوں اور معمولی مزدور پیشہ لوگوں غرض کہ محنت کش عوام کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے برعکس ترقی پسند تحریک نے بچھڑے ہوئے نادار، بے کس اور مفلس انسانوں کے مسائل کو اپنی ادبی تخلیقات کا موضوع بنایا۔

تیسرے، حالی اور آزاد کی تحریک نے ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کو یہ بتایا کہ دنیا کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عزت ان سے ہے مگر دنیا کو یہ نہیں بتایا کہ ماؤں بہنوں بیٹیوں کی کیا عزت ہے، اور کیا حقوق ہیں۔ وہ عزت جو بغیر حقوق کے دی جائے وہ عزت تو بس نام ہی کی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ترقی پسند تحریک کا شاعر مجاز ۱۹۳۷ء میں عورت کو پیغام دے رہا تھا کہ:

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

کچھ عرصے بعد ترقی پسند تحریک کے ایک دوسرے نوجوان شاعر کیفی نے عورت کو یوں مخاطب کیا:

نبضِ ہستی کا لہو کانپتے آنسو میں نہیں
اُڑنے کھلنے میں ہے نکہت، خمِ گیسو میں نہیں
جنت ایک اور ہے جو مرد کے پہلو میں نہیں
اُس کی آزاد روش پر بھی مچلنا ہے تجھے
اُٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

یورپ اور امریکہ میں Women's Liberation اور Women's Empowerment کی تحریک بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں Betty Friedman اور Germaine Greer جیسی باحوصلہ خواتین کی تحریروں سے پیدا کردہ بیداری کا نتیجہ تھی۔ افسوس یہ ہے کہ دنیا نہیں جانتی کہ ان سے کوئی بیس برس پہلے سے ہندوستان کی ایک خاتون افسانہ نگار یہی تمام باتیں بے خوف و خطر لکھ رہی تھی اور اس جرم کی پاداش میں اسے کئی بار عدالت کا منہ بھی دیکھنا پڑا مگر اسکے قلم کی دھار کند نہیں ہوئی۔ اس خاتون ادیب کا نام تھا عصمت چغتائی یہ نام ہندوستانی ترقی پسند تحریک کا ایک مضبوط ستون ہے۔

چوتھا اہم فرق حالی اور آزاد کی نیچرل شاعری کی تحریک اور ترقی پسند تحریک میں دیکھا جاسکتا ہے وہ یہ کہ نیچرل شاعری کی تحریک درحقیقت کوئی منظم تحریک نہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

تھی۔ انگریزی نظموں کے اُردو تراجم پڑھ کر حالی اور آزاد نے اُردو شعراء کو مناظر قدرت اور اصلاحی موضوعات پر سادہ زبان میں نظمیں لکھنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس تحریک کا دائرہ بہت محدود سا تھا۔ لاہور کے علاوہ دہلی کے کچھ گنے چنے شعراء نے اس طرف توجہ کی۔ اس کے برخلاف ترقی پسند تحریک کا دائرہ کسی ایک زبان کسی ایک ملک تک محدود نہیں تھا یہ ایک عالمگیر تحریک تھی ہندوستان میں بھی ساری ہی زبانوں پر اس کے اثرات مرتب ہوئے اور اُردو میں بھی یہ تحریک اس توانائی سے ابھری کہ اُردو زبان کے سارے ہی اہم مراکز دہلی لکھنو، علی گڑھ، حیدر آباد، بمبئی اور لاہور ہر جگہ کے صفِ اول کے شاعر و ادیب کسی نہ کسی حد تک اس سے متاثر ہوئے۔

ان حقائق کی روشنی میں نیچرل شاعری کی تحریک اور ترقی پسند تحریک کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔

۲۴ نومبر ۱۹۳۴ء کی شام چند نوجوان مصنفین اور دانشور لندن کے ایک ریستوراں میں ملے اس میٹنگ میں ایک دستاویز پر غور کیا جانا تھا جسے سجاد ظہیر نے تیار کیا تھا اس کا مقصد ہندوستانی زبانوں کے ادب کو نئے موضوعات اور نئی جمالیات سے آشنا کرانا تھا۔ اس میں جو افراد شامل تھے ان میں سے بعض بعد میں مختلف زبانوں کے انتہائی اہم ادیب بن کے ابھرے۔ سجاد ظہیر کے علاوہ جیوتر میا گھوش، ملک راج آنند اور محمد دین تاثیر بھی وہاں تھے جو بالترتیب بنگلہ، انگریزی اور اُردو کے معتبر مصنفین کی حیثیت سے جانے گئے۔ میٹنگ میں طے پایا کہ کُل ہند ترقی پسند مصنفین نام کی ایک انجمن کی تشکیل کی جائے۔ اسے عملی شکل دینے کی ذمے داری سجاد ظہیر کو دی گئی۔ ۱۹۳۵ء کے وسط تک تحریک کا مینی فیسٹو تیار کر لیا گیا جسے لے کر سجاد ظہیر ہندوستان آئے اور ہندوستان کے اہم مصنفین کی رائے جاننے کی خاطر یہ مینی فیسٹو ان کے سامنے رکھا۔ منشی پریم چند جیسے اُردو ہندی کے صفِ اول کے ادیب نے نہ صرف اس کی ستائش کی بلکہ اس کا ہندی ترجمہ اپنے رسالے 'ہنس' میں چھاپا بھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس ۱۳ اپریل ۱۹۳۶ء کو لکھنو میں ہوئی اور اس میں اس اعلان نامے کو منظوری دی گئی۔ اس اعلان نامے میں ایک جگہ ان الفاظ میں ہندوستانی ادیبوں کی سماجی ذمے داری پر روشنی ڈالی گئی تھی۔

''ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں اور ادب میں سائنسی عقلیت پسندی کو فروغ دیتے ہوئے اس قسم کے انداز تنقید کو رواج دیں جس سے خاندان، مذہب، جنس، جنگ اور سماج کے بارے میں رجعت پسندی اور ماضی پرستی کے خیالات کی روک تھام کی جا سکے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ ایسے رجحانات کی نشو ونما کو روکیں جو فرقہ پرستی، نسلی تعصب اور انسانی استحصال کی حمایت کرتے ہیں۔''

منشی پریم چند نے اس کانفرنس کی صدارت کی تھی۔ اپنے خطبہ صدارت میں انھوں نے کہا تھا:

''ادب محض بہلاؤ کی چیز نہیں ہے دل بہلنے کے سوا اس کا اور بھی کچھ مقصد ہے۔ وہ اب محض عشق و عاشقی کے راگ نہیں الاپتا بلکہ حیات کے مسائل پر غور کرتا ہے۔''

اسی خطبہ صدارت میں انھوں نے یہ بھی کہا:

''ہماری انجمن ادب کو خمریات اور شبابیات کا دست نگر نہیں دیکھنا چاہتی۔ وہ ادب کو سعی و عمل کا پیغام اور ترانہ بنانے کی مدعی ہے اسے زبان سے بحث نہیں آئیڈیل کی وسعت سے زبان خود بخود سہل ہو جاتی ہے حسن معنی آرائش سے بے نیاز رہ سکتا ہے۔ جو ادیب امراء کا ہے وہ امراء کا طرز بیان اختیار کرتا ہے۔ جو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عوام الناس کا ہے وہ عوام کی زبان لکھتا ہے۔‘‘

پریم چند کے اس خطبے کے بیشتر معروضات ہمیشہ کے لیے ترقی پسند ادب کی خصوصیات رہے۔ اس خطبہ صدارت میں جہاں ادب کو زندگی کی سچائیوں سے جوڑنے اور ان کا اظہار کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ وہیں حسن کا معیار تبدیل کرنے کی بات بھی کی گئی ہے۔ ایک ترقی پسند فنکار اپنی محبوبہ کی مدح سرائی کے علاوہ اس دوڑتی بھاگتی گرتی سنبھلتی، محنت کرتی زندگی کے دوسرے روپ پر بھی نظر کرتا ہے۔ اسے اپنی تخلیقات میں اجاگر کرتا ہے۔ پریم چند کے اس نکتے کا بہترین شعری اظہار فیض احمد فیضؔ کی مقبول نظم میں یوں ہوتا ہے:

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے

محبوبہ کی حسن کی ثنا خوانی کے بعد شاعر کی نظر ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم کی طرف بھی جاتی ہے۔ وہ کوچہ بازار میں بکتے ہوئے جسم بھی دیکھتا ہے خاک میں لتھڑے ہوئے اور خون میں نہلائے ہوئے یہ جسم اسے یوں متاثر کرتے ہیں کہ وہ کہتا ہے:

لوٹ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے
اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

ترقی پسند تحریک کے کچھ ایسے بھی مخالفین ہوئے ہیں، جن کا کہنا تھا کہ یہ صرف کمیونسٹ پارٹی سے منسلک شعراء اور اُدباء کی تحریک تھی اور تحریک بھی کیا تھی دراصل یہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کمیونسٹ پارٹی کی پراپیگنڈہ مشینری کا ہی ایک حصہ تھی۔نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم۔ترقی پسند تحریک کے بارے میں اس طرح کی رائے بنانے کے لیے آدمی میں کم سے کم ایک کمی ہونی چاہیے۔یا تو علم کی یا ایمانداری کی اور اگر خوش قسمتی سے دونوں ہوں تو آدمی تا حیات پوری مضبوطی سے اس غلط رائے پر قائم رہ سکتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ سجاد ظہیر کے ساتھ ان کے جن رفقاء نے ادب کا رشتہ سماجی مسائل اور خصوصاً پس ماندہ اور کمزور طبقات سے استوار مضبوط کرنے کی بات کی تھی ان میں سے کئی کمیونسٹ پارٹی سے منسلک تھے۔کمیونسٹ ہونا نہ تو کوئی جرم ہے نہ کوئی عیب لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کئی ایسے بھی تھے جن کا کمیونسٹ پارٹی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔خود منشی پریم چند نظریاتی لحاظ سے گاندھی وادی تھے اور ترقی پسند تحریک کی پہلی کانفرنس میں ان کا صدارتی خطبہ ایک انتہائی اہم دستاویز ہے کہ اس غیر کمیونسٹ ادیب کے خطبے نے بڑی حد تک ترقی پسند تحریک کی غرض وغائیت زبان واسلوب کی سمت کو متعین کیا اس تحریک کو گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور کا بھی آشیرواد حاصل تھا۔انجمن ترقی پسند مصنفین کو انھوں نے اپنا پیغام بھیجا تھا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ:

> ”آج ہمارا ملک ایک لق ودق صحرا ہے جس میں شادابی اور زندگی کا نام ونشان نہیں ہے۔ملک کا ذرا ذرا دکھ کی تصویر بنا ہوا ہے۔ہمیں اس غم واندوہ کو مٹانا ہے اور از سرِ نو زندگی کے چمن میں آبیاری کرنا ہے۔ادیب کا فرض یہ ہونا چاہیے کہ ملک میں نئی زندگی کی روح پھونکے،بیداری اور جوش کے گیت گائے ہر انسان کو امید ومسرت کا پیغام سنائے اور کسی کو ناامید اور ناکارہ نہ ہونے دے۔ملک اور قوم کی بہی خواہی کو ذاتی اغراض پر ترجیح دینے کا جذبہ ہر چھوٹے بڑے میں پیدا کرنا ادیب کا فرض عین ہونا چاہیے۔قوم،سماج اور ادب کی بہبودی کی قسم جب تک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہر انسان نہ کھائے گا اس وقت تک دنیا کا مستقبل روشن نہیں ہو سکتا۔"

میرا خیال ہے کہ اس بات سے کوئی انکار نہیں کرے گا کہ ٹیگور سیاسی پارٹیوں سے بلند تر ہیں۔ حسرت موہانی کانگریس کے ایک سرگرم رکن جیل بھی گئے چکی بھی پیسی ترقی پسند تحریک کے حامی تھے۔ فرماتے ہیں:

نہ سرمایہ داروں کی نخوت رہے گی
نہ حکام کا جورِ بے جا رہے گا
زمانہ وہ جلد آنے والا ہے جس میں
کسی کا نہ محنت پہ دعویٰ رہے گا

ٹیگور، حسرت موہانی، پریم چند کے علاوہ بھی ترقی پسند تحریک کی حمایت ایسے ان گنت ادیبوں اور دانشوروں نے کی ہے جو کمیونسٹ نہیں تھے پنڈت جواہر لال نہرو، مولوی عبدالحق، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، عزیز احمد، حیات اللہ انصاری، احمد ندیم قاسمی، تیلگو کے شاعر سری سری، گجراتی شاعر اوما شنکر جوشی، پنجابی ادیب گربخش سنگھ، مراٹھی قلم کار رانا بھاؤ ساٹھے ترقی پسند کے زبردست حامی تھے مگر ان کے سیاسی نظریات کمیونسٹوں سے مختلف تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے بہت ہی سرگرم اور اہم ادیبوں اور شاعروں میں بھی ایسی شخصیات شامل تھیں۔ سردار جعفری، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر کمیونسٹ پارٹی کے ممبر تھے لیکن خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، ساحر لدھیانوی، عصمت چغتائی، کمیونسٹ پارٹی کے رکن نہیں تھے۔ پھر بھی انجمن ترقی پسند مصنفین سے ان کا اتنا ہی گہرا تعلق تھا جتنا کسی اور کا۔ بہر کیف یہ بھی حقیقت ہے کہ ترقی پسند تحریک میں ایسے لوگ تھے جن کے سیاسی عقیدے میں لوچ کی کمی تھی اور انھوں نے اپنا نقطہ نظر تحریک میں دوسروں سے منوانا بھی چاہا جو کہ ایک فطری سی بات ہے مگر ایسا ہوا نہیں۔ ترقی پسند تحریک کے ایک جلسے میں خاتون ادیب اختر جمال نے جب اپنی پُر جوش تقریر میں کہا کہ آج ہمارا پرچم سرخ ہے، ہمارے ارادے سرخ ہیں، ہمارے قلم سرخ،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہماری روشنائی سرخ ہونی چاہیے ہمارے افسانے سرخ ہونے چاہئیں ہماری نظمیں بھی سرخ ہونی چاہئیں ہماری غزلیں بھی سرخ ہونی چاہئیں تو مجاز جو اس جلسے میں موجود تھے کھڑے ہو گئے عرض کیا، ''محترمہ! کم سے کم گلابی کی اجازت تو دے دیجیے۔'' مجھے معلوم نہیں کہ محترمہ نے اجازت دی کہ نہیں لیکن ترقی پسند تحریک میں جہاں سرخ رنگ تھا وہاں ہلکے گہرے گلابی کے بہت سے شیڈز تھے۔ نیاز حیدر اور فیض، مجاز اور کیفی، جاں نثار اختر اور مجروح، مخدوم اور ساحر ان سب کی شاعری کو یک رنگی نہیں کہا جا سکتا۔ کرشن چندر عصمت چغتائی اور بیدی کے افسانے کسی ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے نہیں تھے۔

مسئلہ یہ ہے کہ اگر آپ سماجی مساوات اور انصاف کی بات کیجیے اقلیتوں اور خواتین کے حق میں بات کیجیے فرقے واریت اور مذہبی جنون کے خلاف بات کیجئے کمزور طبقوں کسانوں اور مزدوروں کے معاشی استحصال کی بات کیجئے تو آپ ہوں نہ ہوں مگر آپ کو میرا یقین ہے کہ کسی کے ترقی پسند ہونے کے لیے کمیونسٹ ہونا ضروری نہیں ہے لیکن کمیونسٹ کا ترقی پسند ہونا ناگزیر ہے۔

یہاں کوئی پوچھ سکتا ہے کہ دراصل ترقی پسندی کی تعریف ہے کیا۔ پریم چند، کرشن چندر اور کئی معتبر مصنفین کی تحریروں اور تحریک کے مختلف جلسوں میں ان کے خطبات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ترقی پسندی کا مطلب روایات سے یکسر انکار نہیں ہے بلکہ روایت کی غلامی کے بجائے تجربات سے بھی سبق حاصل کرنے پر اصرار کرنا ہے۔ تغیر کو تسلیم کرنا روایت کی توہین کرنا نہیں ہے۔ ترقی پسندی کا مطلب ہے ایک عقلی اور سائنسی طرز فکر اور طرز معاشرت کی ترغیب آرٹ اور ادب کو محض ذہنی عیاشی کی چیز نہ سمجھنا اور اسے بامقصد اور افادی بنا کے معاشرے کی خرابیوں کے خلاف آواز اٹھانا اور مثبت قدروں کو مستحکم کرنے کی کوشش ترقی پسندی ہے۔

ریت رواج کے نام پر سماج میں جن نام نہاد اخلاقی ضابطوں کے تحت بھی آج عورت ظلم اور ناانصافی کی شکار ہوتی ہے ان کی مخالفت ترقی پسندی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معاشرے کے بچھڑے ہوئے طبقات کے مسائل ادب کے موضوعات بنانا سرمائے اور محنت میں استحصال کا جو رشتہ رہا ہے اور آج بھی ہے اس پر سوالیہ نشان لگانا ترقی پسندی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ترقی پسند مصنفین کی تخلیقات کیا ان سماجی ذمے داریوں کی کسوٹی پر کھری اُترتی ہیں۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں نے ترقی پسند اقدار کی تشہیر میں ایک بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ پریم چند کے علاوہ علی عباس حسینی کا افسانہ (میلا گھومنی) کرشن چندر (کالو بھنگی، زندگی کے موڑ پر) عصمت چغتائی (گیندا۔ چوتھی کا جوڑا، ننھی کی نانی) منٹو (ٹوبہ ٹیک سنگھ، نیا قانون، ہتک) راجندر سنگھ بیدی (لاجونتی، اپنے دکھ مجھے دے دو)، حیات اللہ انصاری (آخری کوشش) احمد ندیم قاسمی (گنڈاسا، پرمیشر سنگھ) خواجہ احمد عباس (ابابیل، ٹڈی) اوپندر ناتھ اشک (کاکڑاں کا تیلی) غلام عباس (آنندی) بلونت سنگھ (جگا) طوالت سے بچنے کی غرض سے میں صرف کچھ ناموں صرف کچھ افسانوں کا ذکر رہا ہوں ورنہ فہرست تو ظاہر ہے کہ بہت طویل ہے ان افسانوں نے اس سماجی ذمے داری کو نبھایا ہے جس کا تقاضا پریم چند نے اپنے خطبے میں کیا تھا جس کا مشورہ گرو دیو رابندر ناتھ ٹیگور نے ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کی پہلی کانفرنس کے موقع پر بھیجے گئے پیغام میں دیا تھا۔ شاید پریم چند کے اسی تقاضے ٹیگو کے اسی مشورے کی روشنی میں کرشن چندر نے ترقی پسند مصنفین کے ایک اجلاس میں کہا تھا۔

”ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہماری شاعری اور ہماری افسانہ نگاری چند ایک کاوشوں کو چھوڑ کر ابھی تک آسمان سے نہیں اتری۔ ہماری شاعری میں ابھی تک جاگیرداری دور کی خوشبو نفاست پسندی ہے اس کی لے اسی طرح دھیمی دھیمی سوگواری ہے۔ اس میں ابھی زمین کی سوندھی سوندھی بو نہیں ہے۔ کسان کے پسینے سے بھرے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوئے مضبوط ہاتھ نہیں ہیں۔ اس میں اور اسی طرح ہمارے ادب کی دوسری اصناف میں مجھے اپنے غریب گھروں کا نقشہ نہیں ملتا۔ اپنے کسانوں کے گیت نہیں ملتے۔ اپنے مزدوروں کے دن رات کی جاں سوز کاوشیں نہیں ملتیں۔ اس میں اس مزدور عورت کی ٹوٹی ہوئی کنگھی کا ذکر نہیں ہے جس کے دندانوں میں بال پھنسے ہوئے ہیں۔ اس ڈبوکتے کا ذکر نہیں ہے جسے منوہر اپنے ساتھ صبح سویرے ہل چلانے کے وقت کھیتوں میں اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ اس میں اس شوخ نڈر، بے باک محبت کے گیتوں کا ذکر نہیں ہے۔ جو گاؤں کی عورتیں اپنے پیاروں کے لیے دوپہر کے وقت کھیتوں میں کھانا لے جاتے ہوئے منڈیروں پر چڑھتے اترتے گاتی ہیں۔ اس میں ان لباسوں کا ذکر نہیں جن سے گوبر کی بو آتی ہے۔ ہمارے ادب میں کہیں باتھو کے ساگ کا ذکر نہیں ہے۔ اس وقت ہمارے ادب کو بوئے ختن اور گیسوئے تتار کی ضرورت نہیں۔ اسے باتھو کے ساگ کی ضرورت ہے اور یہی ہمارے ادب کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ مجھے اس میں اپنے ملک کے مکان نہیں ملتے۔ اپنے جانے پہچانے چہرے نہیں ملتے۔ اپنے گھروں کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور غم نہیں ملتے۔ اپنے پیڑ نہیں ملتے۔ پھل، پھول، چرند پرند کسی ایک شے کی وہ گہری جانی پہچانی تصویر نہیں ملتی جسے آدمی سو برس کے بعد بھی دیکھ کر بھونچکا رہ جائے جب تک ہم لوگ زمین پر نہیں اتر آئیں گے محنت اور کاوش سے کسانوں اور مزدوروں کے گھروں میں جا جا کر ان کی زندگیوں کا مطالعہ نہیں کریں گے سچائی اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دیانت داری دلی خلوص اور اپنی سوچ کی پوری کرب نا کی سے
اس کی تصویر نہیں اتاریں گے۔اس وقت تک ہمارا ادب عظمت
کے اس معیار کو نہیں چھو سکتا جسے پڑھ کر دنیا کے کسی حصے میں رہنے
والا انسان یہ کہہ سکے کہ یہ ہندوستان کے لوگ تو میری ہی طرح
کے انسان ہیں یہ بہت مشکل کام ہے لیکن ہمیں اسے پورا کرنا ہوگا۔''
یہ بات اس طرح شاید کرشن چندر ہی کہہ سکتے تھے۔

میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آج بھی ہندوستان میں نہ جانے کتنے لوگ ہیں جن کے دلوں میں طبقاتی کش مکش ،معاشی استحصال اور سماج میں عدم مساوات کے تئیں جو خلش ہے وہ کسی سیاست داں کی تقریر سے نہیں آئی ہے کسی ماہر اقتصادیات کے مضمون سے نہیں جاگی ہے کسی سماجیات کے عالم کے مقالے کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ان ترقی پسند افسانوں کی دین ہے جنھوں نے اپنے قاری کو سماجی شعور دیا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد ہونے والے ہولناک فسادات کے بارے میں جو ان گنت افسانے اور ناول منٹو، کرشن چندر، راما نند ساگر اور متعدد ترقی پسند ادیبوں نے لکھے وہ آج بھی ضمیر کو جھنجھوڑ دیتے ہیں۔ یہاں میں کرشن چندر کے ناول ''غدار'' کا ذکر کرنا چاہوں گا جس میں ناول کا مرکزی کردار دینا ناتھ لاہور کے قریب ایک گاؤں کے ہندو زمیندار گھرانے کا فرد ہے۔اسکی حویلی جلادی جاتی ہے۔سارا خاندان قتل ہو جاتا ہے اور وہ کسی طرح جان بچا کر بھاگتا ہے راستے میں تشدد اور بربریت کے دل سوز مناظر دیکھتا ہوا کسی طرح امرتسر تک پہنچتا ہے۔وہاں بھی وہی عالم ہے۔انسانیت اسی طرح قتل ہو رہی ہے۔اس قتل و غارت گری سے گھبرا کر دینا ناتھ سوچتا ہے کہ انسان اپنی تہذیب پر بڑا ناز کرتا ہے مگر انسانی تہذیب آج بھی ایک جھلی کی طرح ہے اور تاریخ کے ناخن کی ایک خراش سے وہ جھلی چاک ہوگئی ہے اور اندر سے ہزاروں سال پرانا جنگل نکل آیا ہے۔ناول کے آخر میں دینا ناتھ رات کے وقت اکیلا اس میدان میں کھڑا ہے جہاں دن میں مسلمانوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ایک قافلے کو قتل کیا گیا تھا۔ میدان میں لاشیں ہی لاشیں ہیں۔ دینا ناتھ ایک بچے کے رونے کی آواز سنتا ہے اسے ڈھونڈتا ہے اور مردہ ماں کے سینے سے لپٹے بچے کو اٹھا کر گلے لگاتا ہے اور اپنے آپ سے پوچھتا ہے کہ اب تو کہاں جائے گا دینا ناتھ تو توان دونوں ملکوں کی نفرتوں میں غدار ہو گیا ہے۔

اب میں آپ کو یہ بتانا چاہوں گا کہ اس طرح کے ادب کے بارے میں ترقی پسند تحریک کے معترضین نے کیا لکھا ہے۔

جو ترقی پسند ادب کے دشمنوں کے بارے میں ذرا بھی جانتے ہیں وہ یقیناً گوپال متل صاحب کے نام سے واقف ہوں گے وہ ترقی پسند ادب کے دشمنوں کی صفِ اول میں تھے۔ ان کے رسالے تحریک کے سلور جوبلی نمبر میں پاکستان کے انور سدید صاحب کا ایک مضمون ہے جس میں ایک جگہ وہ ترقی پسند افسانہ نگاروں کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''ان افسانہ نگاروں نے اپنے ادبی فریضے کو طاق نسیاں پہ رکھ دیا اور سیاسی فریضہ انجام دینے کے لیے فسادات کے المیے کو تجربہ بننے سے پہلے ہی افسانے میں پیوند کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ تاثر کی شدت بڑھانے کے لیے افسانے میں ایسے واقعات بھی ٹھونس دیے گئے جو درحقیقت وقوع پذیر ہی نہیں ہوئے تھے۔''

انور سدید صاحب ملتے تو میں ان سے پوچھتا کہ ۱۹۴۷ء کی بربریت اور حیوانیت نے کہاں گنجائش چھوڑی تھی کہ کوئی تاثر کی شدت بڑھانے کے لیے کسی مبالغے کی نہ ضرورت محسوس کرے۔

آگے لکھتے ہیں:

> ''ترقی پسند افسانہ نگاروں نے فسادات کو شعوری سطح پر برتنے کی کوشش کی اور یوں غیر جانبداری کا تاثر دینے کے باوجود ان کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ریا کاری جانب داری اور سیاست پسندی چھپ نہ سکی۔"

یہ تجزیہ خود کتنا غیر جانبدار ہے۔ آپ سمجھ رہے ہیں اس بارے میں مجھے ایک لفظ بھی کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

احمد ندیم قاسمی کے شاہکار افسانے ''پرمیشر سنگھ'' میں فسادات کے دوران ایک بے اولاد سکھ کو ایک سات آٹھ برس کا مسلمان بچہ مل جاتا ہے وہ اسے سکھ بنا کے پالنے کی سوچتا ہے کوشش بھی کرتا ہے مگر پھر اس کا ضمیر اس سے کہتا ہے کہ یہ غلط ہوگا اور وہ بچے کو واپس اس کے خاندان تک پہنچانے کے لیے سرحد تک جاتا ہے۔ بچہ تو سرحد پار چلا جاتا ہے مگر بارڈر پولیس پرمیشر سنگھ کو گولی مار دیتی ہے۔

ترقی پسند ادب کے مخالف نقاد انور سدید صاحب لکھتے ہیں:

''احمد ندیم قاسمی نے پرمیشر سنگھ میں غیر جانب داری کا مصنوعی تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی اور یوں انسان کے فطری جذبے میں تصنع کا رنگ بھرا۔''

یعنی انور سدید صاحب کے نزدیک اگر پرمیشر سنگھ اس بچے کا قتل یا تبدیلی مذہب کر ہی دیتا تو یہ فطری بات ہوتی اور اگر افسانہ نگار یہ کہتا ہے کہ پرمیشر بچے کو اس کے گھر والوں تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے تو یہ ناقابل یقین ہے اس لیے کہ ایسا کوئی کام انسانی فطرت کے خلاف ہے معلوم ہوا کہ موصوف کی رائے ترقی پسند تحریک کے بارے میں ہی نہیں انسان کے بارے میں بھی اچھی نہیں ہے اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے میں تو نہیں جانتا لیکن اپنے بھائی ڈاکٹر سلمان اختر سے پوچھوں گا وہ ماہر نفسیات ہے۔

ترقی پسند تحریک نے اُردو ادب کو اتنے قد آور شاعر دیے کہ ایسی مثال نہ تو کوئی دوسری تحریک پیش کر سکتی ہے نہ کوئی ادارہ۔

فیض، مجاز، مخدوم، جعفری، مجروح، جاں نثار اختر، کیفی، ساحر اور ایسے کتنے ترقی پسند شاعر ہیں جن کے بغیر اُردو شاعری کی تاریخ کو مکمل نہیں مانا جائے گا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۹۳۵ء سے ۱۹۷۵ء تک یہ شاعری ہر قدم پر اپنے معاشرے کے ہردکھ ہر شکوے اور ہر احتجاج کی آواز بنی ہے۔یہ شاعری گلستانوں، عشرت کدوں اور خواب گاہوں کی شاعری نہیں ہے۔ یہ شاعری ملوں اور فٹ پاتھوں کی شاعری ہے۔یہ شاعری کسانوں کے ہاتھوں سے لگی مٹی اور مزدور کے ماتھے کے پسینے کے بارے میں ہے۔یہ بااقتدار طبقے کے ظلم کے خلاف اعلان جنگ کی شاعری ہے ۔یہ ڈھلتی ہوئی رات اور آنے والے سویرے کی شاعری ہے۔

ترقی پسند شعراء پر یہ الزام لگایا جاتاہے کہ انھوں نے اکثر ہنگامی موضوعات پر شاعری کی ہے کبھی کبھی سیاسی تقریروں کو منظوم کرکے انھیں شاعری کا نام دیاہے پروپیگنڈہ اورنعرے بازی کے ہاتھوں فنی تقاضوں اورادبی نزاکتوں کا گلاگھونٹا ہے۔

سچ کہوں گا اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔ایسا نہیں ہے کہ یہ الزام پوری طرح غلط ہے لیکن یہ الزام پوری طرح صحیح بھی نہیں ہے۔اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ سوائے ایک آدھ کے تقریباً ہر ترقی پسند شاعر نے کبھی نہ کبھی ایسی کوئی غلطی کی ہے لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ ہراہم ترقی پسند شاعر نے ایسی بھی شاعری کی ہے جو اُردو ادب کا انتہائی اہم اور قیمتی سرمایہ ہے۔اچھی اور بُری شاعری تو ہر دور میں ہوئی ہے اور ہر شاعر نے کی ہے۔لیکن ہم شاعر کو اس کی اچھی شاعری سے یاد رکھتے ہیں اور اس کی کمزور شاعری کو فراموش کردیتے ہیں یارد کردیتے ہیں یامعاف کردیتے ہیں۔

دور بیٹھا غبار میرؔ اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

اس خدائے سخن میرؔ نے ایک شعراور بھی کہا: ؎

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سنا جاتا ہے اے گھیتے ترے مجلس نشینوں سے
کہ تو وارد سے ہے رات کو مل کر کمینوں سے

یا:

میرؔ کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب

اسکا دوسرا مصرعہ شریفوں کی محفل میں دُہرایا بھی نہیں جاسکتا

لیکن ہم میرؔ کے پرستار ہیں کہ انھوں نے کہا تھا:

چشم خوں بستا سے کل رات لہو پھر ٹپکا
ہم تو سمجھے تھے کہ اے میرؔ یہ آزار گیا

پر تو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

سے لگائیں گے یا اس شعر سے کہ

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

جس غالب نے کہا ہے:

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینہ بادِ بہاری کا

اس نے یہ بھی تو کہا ہے:

اسدؔ خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

وہ مجروحؔ جس پر یہ الزام لگتا ہے کہ اس کا یہ شعر ہے:

امن کا جھنڈا اس دھرتی پر کس نے کہا لہرانے نہ پائے
یہ بھی کوئی ہٹلر کا ہے چیلا، مار لے ساتھی جانے نہ پائے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسی مجروح نے یہ ترقی پسند اشعار بھی تو کہیں ہیں ؎

دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن، جوشِ بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ
شبِ ظلم نرغۂ راہزن سے پکارتا ہے کوئی مجھے
میں فرازِ دار سے دیکھ لوں کہیں کاروانِ سحر نہ ہو
روک سکتا ہمیں زندانِ بلا کیا مجروح
ہم تو آواز ہیں دیوار سے چھن جاتے ہیں

سردر جعفری جن پر یہ انتہائی مبلغہ آمیز الزام لگتا ہے کہ انہوں نے صرف سٹالن اور روس کے قصیدے لکھے ہیں ہم ان کی ایسی نظمیں کیسے بھلا سکتے ہیں جیسے کہ: ؎

سفید آٹا سیاہ چکی سے راگ بن کر نکل رہا ہے
سنہرے چولہوں میں آگ کے پھول کھل رہے ہیں
پتیلیاں گنگنا رہی ہیں
دھوئیں سے کالے توے بھی چنگاریوں کے ہونٹو سے
ہنس رہے ہیں
دوپٹے آنگن میں ڈوریوں پر ٹنگے ہوئے ہیں
اور ان کے آنچل سے دھانی بوندیں ٹپک رہی ہیں
سنہری پگڈنڈیوں کے دل پر
سیاہ لہنگوں کی سرخ گوٹیں مچل رہیں ہیں
یہ سادگی کس قدر حسیں ہے
(اودھ کی خاک حسیں)

جمالیات کا کونسا معیار ہے، جو ان مصرعوں کی داد نہں دے گا۔

پتیوں کی پلکوں پر / اوس جگمگاتی ہے / املیوں کے پیڑوں پر / دھوپ پر سکھاتی ہے /

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آفتاب ہنستا ہے / مسکراتے ہیں تارے / چاند کے کٹورے سے /
چاندنی چھلکتی ہے / جھیل کی فضاؤں میں / پھر بھی اک اندھیرا ہے /
جیسے ریت میں گر کر / دودھ جذب ہو جائے / روشنی کے گالوں پر /
تیرگی کے ناخن کی / سینکڑوں خراشیں ہیں

ترقی پسند تحریک کے ہر شاعر نے کچھ ایسی نظمیں کچھ ایسے شعر اُردو ادب کو دیے ہیں جو اُردو کے شاہکار ادب کا حصہ ہیں۔ فیض کی ''ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے''۔ ''تنہائی''۔ ''زنداں کی ایک صبح''۔ مخدوم کی ''چاند تاروں کا بن'' اور ''اندھیرا''۔ مجاز کی ''آوارہ'' اور ''خواب سحر''۔ ساحر کی ''تاج محل'' اور ''پرچھائیاں''۔ جعفری کی ''میرا سفر'' اور ''پتھر کی دیوار''۔ جاں نثار اختر کی ''خاک دل'' اور ''آخری ملاقات'' وامق کی ''مینا بازار'' اور ''زمین'' کیفی کی ''ابن مریم'' اور ''عورت''۔ جذبی کی ''موت'' اور مجروح کے ان گنت اشعار جو ضرب المثل بن چکے ہیں ان تمام شعراء کی شاعری انسان سے محبت اور مستقبل پر یقین کی شاعری ہے زندگی کی عظمت کی شاعری ہے یہاں مجھے جاں نثار اختر کے وہ مصرعے یاد آتے ہیں: ؎

جینے کی ہر طرح سے تمنا حسین ہے
ہر شر کے باجود یہ دنیا حسین ہے
دریا کی تند باڑھ بھیانک سہی مگر
طوفاں سے کھیلتا ہوا تنکا حسین ہے
صحرا کا ہر سکوت ڈراتا رہے تو کیا
جنگل کو کاٹتا ہوا رستا حسین ہے
دل کو ہلائے لاکھ گھٹاؤں کی گھن گرج
مٹی پہ جو گرا وہی قطرہ حسین ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وحشت دلا رہی ہیں چٹانیں تو کیا ہوا
پتھر میں جو صنم ہے وہ کتنا حسین ہے
راتوں کی تیرگی ہے جو پُر ہول غم نہیں
صبحوں کا جھانکتا ہوا چہرا حسین ہے
ہوں لاکھ کوہسار بھی حائل تو کیا ہوا
پل پل چمک رہا ہے تو تیشا حسین ہے
لاکھوں صعوبتوں کا اگر سامنا بھی ہو
ہر جہد ہر عمل کا تقاضا حسین ہے

(آخری لمحہ)

تمام ترقی پسند شعراء کا ایک دوسرے سے رنگ، لہجہ، مزاج الگ ہے مگر سب نے اپنی شاعری کا انتساب وہی کیا ہے جو فیض نے کیا ہے:

آج کے نام
اور آج کے غم کے نام
آج کا غم کہ ہے زندگی کے بھرے گلستان سے خفا / زرد پتو کا بن
زرد پتو کا بن جو میرا دیس ہے / درد کی انجمن جو مرا دیس ہے /
کلرکوں کی افسردہ جانوں کے نام / کرم خوردہ دلوں اور زبانوں کے نام /
پوسٹ مینوں کے نام / تانگے والوں کے نام / ریل بانوں کے نام
کارخانوں کے بھوکے جیالوں کے نام /
بادشاہ جہاں والیِ ماسوا نائب اللہ فی الارض / دہقاں کے نام
جس کے ڈھوروں کو ظلم ہنکا لے گئے / جس کی بیٹی کو ڈاکو اُٹھا لے گئے
ہاتھ بھر کھیت سے ایک انگشت پٹوار نے کاٹ لی
دوسری مالیے کے بہانے سے سرکار نے کاٹ لی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جس کی پگ زور والوں کے پاؤں تلے / دھجیاں ہو گئی / ان دُکھی

ماؤں کے نام / رات میں جن کے بچے بلکتے ہیں اور /

نیند کی مار کھائے ہوئے بازوؤں سے سنبھلتے نہیں / دکھ بتاتے نہیں

منتوں زاریوں سے بہلتے نہیں / ان حسیناؤں کے نام / جن کی آنکھوں کے گل /

چلمنوں اور دریچوں پہ بیکار کھل کھل کے / مرجھا گئے / ان بیاہتاؤں کے نام /

جن کے بدن / بے محبت ریا کار سیجوں پہ سج سج کے اکتا گئے

بیواؤں کے نام / کٹڑیوں اور گلیوں محلوں کے نام /

جن کی ناپاک خاشاک سے چاند / راتوں کو آ کے کرتا ہے اکثر وضو

جس کے سایوں میں کرتی ہے آہ و بکا / آنچلوں کی حنا / چوڑیوں کی کھنک /

کاکلوں کی مہک / آرزو مند سینوں میں اپنے پسینے میں جلنے کی بُو /

پڑھنے والوں کے نام / وہ جو اصحاب طبل و علم کے دروں پر کتاب اور قلم

کا تقاضا لیا ہاتھ پھیلائے پہنچے / اور لوٹ کر گھر نہ آئے / وہ معصوم جو بھولپن میں /

وہاں اپنے ننھے چراغوں میں لو کی لگن / لے کے پہنچے جہاں /

بٹ رہے گا گھٹا ٹوپ بے انت راتوں کے سائے / ان اسیروں کے نام /

جن کے سینوں میں فردا کے شب تاب گوہر /

قید خانوں کی شوریدہ راتوں کی صرصر میں / جل جل کے انجم نما ہو گئے /

آنے والے دنوں کے سفیدوں کے نام / وہ جو خوشبوئے گل کی طرح /

اپنے پیغام پر خود فنا ہو گئے

(انتساب)

یہ تمام شاعر جن کی ہم نے بات کی ہے آج دنیا میں نہیں ہیں لیکن

بقول ساحرؔ:۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہ منہ چھپا کے جیے ہم نہ سر جھکا کے جیے
ستم گروں کی نظر سے نظر ملا کے جیے
اب ایک رات اگر کم جیے تو حیرت کیوں
کہ جب تلک بھی جیے مشعلیں جلا کے جیے

ترقی پسند ادب کے بارے میں سو باتوں کی ایک بات مجازؔ کے الفاظ میں یہ ہے

ذہن انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں
زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں
کچھ نہیں تو کم سے کم خواب سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک ادھر دیکھا تو ہے

اور کون ہے جو اتنا دعویٰ بھی کر سکے۔

☆☆☆☆

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترقی پسند افسانے کی روایت اور نیا افسانہ

شہزاد منظر

ترقی پسند ادبی تحریک ایک ایسی ہمہ گیر تحریک ہے جس سے صرف اُردو ہی نہیں، برصغیر جنوبی ایشیا کی تقریباً تمام بڑی اور چھوٹی زبانوں کے ادب نے گہرا اثر قبول کیا ہے اور ادب کے تمام شعبوں پر اس کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ ترقی پسند تصورات سے جو اصناف خاص طور پر متاثر ہوئے۔ اُن میں افسانہ، شاعری اور تنقید شامل ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ترقی پسندی صرف ایک رجحان نہیں، ایک نقطہ نظر بھی ہے۔ جس کے تحت، مصنف نہ صرف زندگی کے عملی، بلکہ معاشرے کے ارتقاء کے قانون کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کی روشنی میں زندگی کی تفہیم تعبیر کرتا ہے۔ اس لیے ترقی پسندی کو صرف ادب تک محدود سمجھنا درست نہیں۔ ترقی پسند رجحان نے اُردو میں سب سے پہلے جس صنف کو متاثر کیا وہ تنقید اور شاعری ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اُردو میں شاعری کی رویت سب سے قدیم اور جاندار ہے۔ اس لیے اس رجحان سے سب سے پہلے شاعری متاثر ہوئی اور جوش اور ان کے قبیل کے دوسرے شعرا منظر عام پر آئے، اس کے ساتھ تنقید نے ترقی پسندی خصوصاً مارکسزم کے اثرات کو قبول کیا اور اس کی روشنی میں ادب کی نئی تعبیر کی۔ اُردو افسانے نے ترقی پسندی کے رجحان کو اس کے بعد قبول کیا اس لیے کہ اُردو میں جب ترقی پسند تصورات عام ہونے شروع ہوئے تو اُردو افسانہ پر پریم چند کی مثالیت پسندی اور سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری کی روحانیت کا رجحان پہلے سے غالب تھا۔ ایک جانب پریم چند اور ان کے رفقاء اصلاحی طرز کے افسانے لکھ رہے تھے۔ دوسری جانب یلدرم اور نیاز وغیرہ نے روحانیت کے رجحان کو پروان چڑھانا شروع کر دیا تھا، جس کے تحت حسن کی جستجو، مسرت اور آسودگی کے حصول، جمالیاتی کیف و سرور اور خیالی بہشت کی تخلیق جاری تھی۔ برصغیر میں اس صدی کی دوسری دہائی سے قبل کسی قسم کی انقلابی یا بائیں بازوں کے تصورات کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سراغ نہیں ملتا۔ اس لیے کہ روس کے ۱۹۱۴ء کے انقلاب کے بعد ہی برصغیر میں انقلابی رجحانات عام ہوئے۔ اس سے قبل اگر کوئی رجحان عام تھا تو وہ قوم پرستی اور اصلاح پسندی کا رجحان تھا۔ پریم چند نے ۱۹۰۵ء سے افسانے لکھنے شروع کر دیئے چنانچہ وہ ترقی پسند تصورات سے تیسری دہائی کے وسط میں متعارف ہوئے۔ اس دور میں پنڈت نہرو اور روبندر ناتھ ٹیگور اور ایم۔ این۔ رائے کی مختلف تحریروں کے ذریعے ہندوستان میں سوشلزم کا پرچار شروع ہوا اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا اور آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کے قیام کے بعد سوشلزم کا تصور عام ہو گیا۔ اسی دور میں روحانیت اور مثالیت پسندی کے ساتھ ساتھ اُردو افسانے پر ایک اور رجحان اثر انداز ہوا۔ وہ حقیقت نگاری کا رجحان تھا، خصوصاً روسی اور فرانسیسی حقیقت نگاری کا واضح رہے کہ یہ وہ دور ہے جب پروفیسر خواجہ منظور احمد، پروفیسر ایم۔ اے۔ مجیب، سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، عبدالقادر سروری، جلیل قدوائی، حامد علی خاں، شاہد احمد دہلوی، مولوی عنایت اللہ اور سعادت حسن منٹو وغیرہ نے روسی فرانسیسی، انگریزی، ترکی اور بنگلہ زبانوں کے بہترین افسانوں کا اُردو میں ترجمہ کیا اور اُردو قارئین اور مصنفین نے چیخوں اور موپساں، ٹالسٹائی، ترگنیف گوگول، ہارڈی آسکو وائلڈ اور میکسم گورکی وغیرہ کی تخلیقات سے متعارف و متاثر ہونا شروع کر دیا تھا۔ پریم چند اس دور میں مغرب اور مشرق کے جن مصنفین نے خاص طور پر متاثر ہوئے ان میں ٹالسٹائی کے روبندر ناتھ ٹیگور، بنکم چند اور مسرت چند وغیرہ شامل ہیں۔ تیسری دہائی میں ترقی پسند تصورات کے عام ہونے سے قبل ہی حقیقت نگاری نے اُردو افسانے کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اس دور کے جو افسانہ نگار مغرب کی حقیقت نگاری سے متاثر ہوئے۔ ان میں پریم چند، سدرشن، اعظم کریوی اور بعد کی نسل میں احمد علی، اختر حسین رائے پوری اور نیوی اور سجاد ظہیر وغیرہ شامل ہیں۔ اختر حسین رائے پوری اور احمد علی، پریم چند کے نوعمر ہم عصر تھے۔ احمد علی کا پہلا افسانہ مہارت کی ایک رات ۳۳۔ ۱۹۳۲ء میں اور اختر حسین رائے پوری کا پہلا افسانہ "زبانِ بے زبانی" ۱۹۳۳ء میں شائع

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور اختر اور نیوی کا پہلا افسانہ بھی لگ بھگ اسی زمانے میں شائع ہوا۔ انگارے کے مصنفین سجاد ظہیر اور احمد علی میں اور اس دور کے دوسرے افسانہ نگاروں میں فرق یہ تھا کہ یہ دونوں مغربی تعلیم یافتہ تھے اور انھوں نے مغربی ادب کا براہ راست اور گہرا مطالعہ کیا تھا چنانچہ انھوں نے افسانے کی تکنیک میں حقیقت نگاروں کے بجائے اس دور کے سب سے بڑے روایت شکن جمیز جوائس کا اثر قبول کیا اور اس کے اسلوب اور تکنیک سے متاثر ہو کر افسانے لکھے اس طرح سجاد ظہیر اور احمد علی دوسرے افسانہ نگاروں کی نسبت دو قدم آگے نظر آتے ہیں لیکن یہ اثر تکنیک کی حد تک صرف ''انگارے'' کے افسانوں میں نظر آتا ہے اس کے بعد انہوں نے سیدھی سادی حقیقت نگاری شروع کر دی اس طرح اُردو میں ترقی پسند افسانے کے آغاز سے قبل حقیقت پسند افسانے لکھنے کا رواج عام ہوا۔

یہاں حقیقت پسند اور ترقی پسند افسانے کا فرق واضح کر دینا ضروری ہے تاکہ بحث میں آسانی ہو۔ حقیقت نگاری کی روایت بہت پرانی ہے اور اس کا عرصہ تقریباً ڈیڑھ سو سال پر محیط ہے۔ حقیقت نگاری کی بنیادی خصوصیت واقعہ کی ہو بہو عکاسی ہے۔ بقول عزیز احمد،

> ''سائنس جس طرح سچائی سے اشیاء اور اجسام کے حقائق کا معائنہ کرنا چاہتی ہے حقیقت نگاری ادب اور آرٹ کے ذریعے ہی کام کرنا چاہتی ہے۔ حقیقت نگاری میں ذاتی وجدان اور انفرادی نظر کی اہمیت نہیں ہوتی۔ حقیقت نگاری نقطہ نظر قطعی غیر شخصی ہوتا ہے۔ اس کا اولین مقصد زندگی کی عکاسی ہے۔ وہ کچھ نہیں چھپاتا البتہ وہ غیر متعلق تفصیلات کو کم کر دیتا ہے۔ اس کا اندازِ بیان بہت صاف اور سیدھا ہوتا ہے۔ اس کا اسلوب اس کے موضوع سے پوری طرح ہم آہنگ ہوتا ہے اور وہ اپنی ذاتی رائے کا بہت کم اظہار

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرتا ہے۔ مصنف ہستی زندگی سے جتنا قریب ہوتا ہے وہ اتنا ہی بڑا حقیقت نگار ہوتا ہے۔"

ہم جسے ترقی پسند افسانہ کہتے ہیں وہ دو عنصر ترکیبی سے مل کر وجود میں آیا ہے۔ ان میں ایک حقیقت نگاری اور۔۔۔ انقلابی شعور ہے۔ ترقی پسند افسانے کے بارے میں میرا خیال ہے کہ اگر حقیقت ہماری انقلابی اور طبقاتی شعور کے ساتھ کی جائے تو ترقی پسند افسانہ وجود میں آتا ہے۔ جس میں سماجی تنقید خود بخود شامل ہوتی ہے۔ حقیقت نگاری کی طرح ترقی پسند افسانہ نگار ذاتی رائے کے اظہار سے گریز نہیں کرتا۔ البتہ وہ افسانے میں اپنی رائے کا اظہار فنی حدود و قیود میں رہ کر بھی جمالیاتی پیرائے میں کرتا ہے۔ اسی طرح ہم ترقی پسند افسانے کو سماجی حقیقت نگاری کی ایک قسم قرار دے سکتے ہیں لیکن سماجی حقیقت نگاری اور ترقی پسند افسانے میں بنیادی فرق یہ ہے کہ سماجی حقیقت نگاری خود کو صرف نثر کی تنقید تک محدود رکھتی ہے۔ جبکہ ترقی پسند افسانہ قاری کو معاشرے کو بدلنے کے لیے متحرک کرتا ہے۔ اس طرح ترقی پسند افسانہ سماجی حقیقت نگاری سے آگے کی شے ہے۔ ہم اس موقع پر مارکس کے اس تاریخی جملے کا حوالہ دینا چاہتے ہیں۔ جب اس نے کہا تھا کہ فلسفی آج تک دنیا کی تعبیر کرتے رہے ہیں۔ اصل کام دنیا کو بدلنے کا ہے۔ سماجی حقیقت نگار صرف دنیا کی تعبیر اور تنقید کرتا ہے، جبکہ ترقی پسند افسانہ نگار کا مقصد معاشرے کو بدلنا اور انصاف اور مساوات پر مبنی زیادہ بہتر معاشرہ قائم کرنا ہے۔ اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ترقی پسند افسانہ نگار وہ ہے جو معاشرے کی تنقید کے ساتھ ساتھ اسے بدلنے کا بھی قائل ہو۔

ترقی پسند افسانے کی روایت سے بحث کرتے ہوئے قیام پاکستان کے بعد اُردو افسانے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا تذکرہ ضروری ہے، جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں۔ حصولِ آزادی کے بعد برصغیر جنوبی ایشیا کا سیاسی اور تاریخی تناظر بالکل بدل گیا۔ اسی کے ساتھ ادب کے موضوعات اور لب ولہجہ میں بھی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ اس سے قبل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ادیبوں کے ساتھ آزادی کا حصول سب سے بڑا مقصد تھا اس لیے ادب میں قومی آزای کی جدو جہد سے متعلق موضوعات کے بیان میں بلند آہنگی اور راست گوئی عام تھی اور یہ ضروری بھی تھی۔ اس لیے کہ سیاسی اور سماجی انقلاب کی باتیں سرگوشی یا دھیمے لہجے میں نہیں کی جاسکتیں۔ اس کے لیے جوش و ولولے کے ساتھ بلند آہنگی لازم و ملزوم تھی۔ لیکن حصولِ آزادی کے بعد یہ ساری باتیں بے معنی ہوگئیں۔ یہ درست ہے کہ سیاسی آزادی کے حصول کے باوجود معاشرے میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی اور اقتصادی اور طبقاتی استحصال اور سیاسی وسماجی استبداد حسب سابق جاری رہا۔ لیکن غیر ملکی حکمرانوں کے جانے اور قومی حکومت کے قیام کے باعث نئے حالات پیدا ہو گئے اور عوام کے سوچنے کا انداز بدل گیا۔ اب پاکستان جیسی نئی مملکت میں ادیبوں کو بالکل نئے مسائل سے دو چار ہونا پڑا۔ جن میں فسادات اور ہجرت کے مسائل سب سے نمایاں تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ افسانے کے موضوعات کے بدل جانے کا پیرایہ اظہار پر اثر پڑنا لازی تھا۔ چنانچہ اب بلند آہنگی اور راست گوئی (جسے برہنہ گفتاری کہنا زیادہ درست ہے) خوبی کی بجائے عیب تصور کیا جانے لگا۔ قیام پاکستان کے بعد پرانے ترقی پسند ادیبوں نے کچھ دنوں تک اپنا سابق لب ولہجہ طرز اظہار جاری رکھا۔ اس لیے کہ وہ انقلاب کے مخصوص تصور کے تحت پاکستان میں فوری طور پر اشتراکی انقلاب کا خواب دیکھ رہے تھے اور انہوں نے نئی مملکت کے مخصوص اور معروضی حالات کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ انہیں یہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا کہ پاکستان جس خطہ ارض کو لے کر قائم ہوا ہے وہاں سرمایہ دارنہ معیشت کا نام ونشاں تک نہیں ہے اور صدیوں پرانے فرسودہ جاگیردارانہ اور قبائلی نظام کی جڑیں بہت گہری ہیں اور جہاں جمہوری انقلاب ہی وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ انکی نا سمجھی، غلط سوچ، انتہا پسندی اور حکومت کے جبر و استبداد کے باعث ترقی پسند مصنفین کی گرفتاری اور انجمن ترقی پسند مصنفین پر پابندی کے نتیجے میں ترقی پسندوں کی تنظیم تو ختم ہوگئی لیکن تحریک فکری سطح پر مختلف صورتوں میں جاری ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ چند افراد کو گرفتار یا انہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تختہ دار پر لٹکا دینے سے ان کے افکار ختم ہو جاتے ہیں وہ احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں مارکس کے بقول جب نئے اور انقلابی تصورات ایک دفعہ عوام میں سرایت کر جاتے ہیں تو وہ مادی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور وہ ظلم و استبداد کے ذریعے کبھی ختم نہیں ہوتے۔ پاکستان میں ترقی پسند ادبی تحریک کے ساتھ یہی کچھ ہوا اور پابندیوں کے باوجود ترقی پسند اور بائیں بازو کے تصورات عام ہوتے گئے۔

قیام پاکستان کے وقت جو بزرگ اور کمیٹڈ ترقی پسند افسانہ نگار تھے۔ ان میں احمد ندیم قاسمی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور اور شوکت صدیقی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ بعض ایسے سینئر ترقی پسند افسانہ نگار بھی تھے جو اگرچہ احمد ندیم قاسمی اور شوکت صدیقی کی طرح کمیٹڈ نہیں تھے، لیکن جو ترقی پسند افکار اور نظریات بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر متاثر تھے جن میں سعادت حسن منٹو، غلام عباس، عزیز احمد، قرۃ العین حیدر اور سید نور وغیرہ شامل ہیں۔ ترقی پسندوں نے قیام پاکستان کے ابتدائی دنوں میں انتہا پسندی کے باعث اگرچہ منٹو کو اپنی صف سے خارج کر دیا تھا۔ لیکن اس سے قبل تک منٹو اپنے افکار کے باعث ترقی پسند تصور کیا جاتا تھا اور عزیز احمد نے اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب'' میں اسی حیثیت سے اس کا ذکر کیا ہے۔ ان افسانہ نگاروں نے قیام پاکستان کے بعد کچھ عرصے تک افسانہ نگاری جاری رکھی۔ لیکن بعد میں تھک کر بیٹھ گئے۔ صرف قرۃ العین اور غلام عباس تواتر کے ساتھ افسانے لکھتے رہے۔ آزادی سے قبل کے افسانہ نگاروں کے منظر عام سے رفتہ رفتہ اوجھل ہو جانے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ افسانہ نگاری رک گئی۔ اس دوران اشفاق احمد اور خلیل احمد نے کچھ عرصے تک رومانی طرز کے افسانے لکھ کر لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کی۔ لیکن وہ کوئی نیا رجحان پیدا نہ کر سکے۔ اس دوران اُردو افسانے میں غیر محسوس طور پر تبدیلیاں رونما ہونے لگیں اور ۱۹۶۰ء کی دہائی میں نئے طرز اور نئے اسلوب میں افسانے لکھے جانے لگے۔ یہ علامتی اسلوب تھا جس کی ابتدا انتظار حسین اور انور سجاد نے کی۔ انتظار حسین کی افسانہ نگاری کی ابتداء قیام پاکستان کے ساتھ ہوئی۔ ابتداء میں وہ روایتی اور وضاحتی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طرز کے افسانے لکھتے رہے لیکن بعد میں انہوں نے اپنا پیرایہء اظہار بدل کر علامتی طرز بظاہر اختیار کرلیا اور رفتہ رفتہ یہ اسلوب عام ہو گیا۔

ترقی پسند افسانہ نگاروں نے قیام پاکستان سے قبل اور قیام پاکستان بعد افسانہ نگاری میں جو روایت قائم کی اور نئی نسل کے افسانہ نگاروں نے کس حد تک قبول کیا؟ انہوں نے اس روایت کو ہو بہو اختیار کیا یا اس میں ترمیم و توسیع سے کام لیا؟ اس سوال پر بحث کرنے سے قبل بعض دوسری باتوں پر بحث کرنا ضروری ہے۔ میں نے محولا بالا سطور میں ترقی پسند افسانے کے ضمن میں لکھا تھا کہ ترقی پسند افسانہ حقیقت نگاری کو انقلابی اور طبقاتی شعور کے ساتھ پیش کرنے کا نام ہے۔ میں یہاں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ حقیقت نگاری حقیقت کو پیش کرنے کے صرف ایک طریقے کا نام ہے۔ حقیقت کا اظہار دوسرے طریقوں مثلاً استعارات اور علامات کے ذریعے بھی ہو سکتا ہے۔ استعارات و علامات دراصل اظہار کے مختلف پیرائے ہیں جن کے ذریعے بھی حقیقت کی عکاسی ہوسکتی ہے۔ حقیقت کو بیان کرنے کے لئے بیانیہ وضاحتی یا حقیقت پسندانہ پیرایہ واحد ذریعہ اظہار نہیں ہے۔ ابتداء میں بعض ترقی پسند ناقدین نے اس امر کو نہیں سمجھا اور علامت نگاری کو ترقی پسندی کے خلاف تصور کیا جو میرے خیال میں درست نہیں ہے۔ پاکستان کے زیادہ تر نئے ترقی پسند افسانہ نگاروں نے ترقی پسند افسانے کی بنیادی روایات مثلاً انسان دوستی، طبقاتی استحصال اور سماجی بے انصافیوں کے خلاف عقلیت پسندی، خرد افروزی، جمہوریت پسندی اور روشن خیالی وغیرہ کو اختیار کرتے ہوئے وضاحتی طرز کے ساتھ ساتھ علامتی اور استعارتی اسلوب کو بھی ذریعۂ اظہار بنالیا ہے اور یہ پاکستان کے معروضی حالات کا تقاضا بھی ہے۔

ترقی پسند افسانے سے بحث کرتے ہوئے میں یہاں شعوری اور غیر شعوری ترقی پسند یا کمیٹڈ اور نا کمیٹڈ افسانہ نگاروں کے بارے میں بھی چند باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ میں اس ضمن میں ترقی پسندی کی دو قسموں کی جانب توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ ایک شعوری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترقی پسندی اور دوسرے غیر شعوری ترقی پسندی، جن کی جانب سجاد ظہیر نے اپنے مقالے ''ترقی پسند ادب کا تجزیہ'' میں اشارہ کیا ہے۔ شعوری ترقی پسندی وہ ہے جس کے تحت ترقی پسند ادیب انقلابی نظریے کو قبول کرتا ہے اور اپنی تخلیقات کے ذریعے معاشرے کو تبدیل کرنے کی شعوری کوشش کرتا ہے۔ وہ سماجی ارتقا اور اس کے قانون سے واقف ہوتا ہے۔ وہ یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ پیداواری نظام کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ سماجی نظام بدل جاتا ہے اور اسی کے ساتھ پیداواری اور دوسرے سماجی رشتے بدل جاتے ہیں۔ غیر شعوری ترقی پسندی وہ ہے جس کے تحت ادیب معاشرتی برائیوں، ظلم، استحصال اور سماجی ناانصافیوں کو محسوس کرتا اور اس کی عکاسی کرتا ہے۔ لیکن وہ سماجی ارتقا اور تبدیلی کے قانون سے واقف نہیں ہوتا اور نہ وہ یہ جانتا ہے کہ جاگیردارانہ معاشرے کی جگہ سرمایہ دارانہ صنعتی معاشرہ کیسے وجود میں آیا۔ ہم اس کی مثال بالزاک اور میکسم گورگی سے دے سکتے ہیں۔ بالزاک اپنے عہد کا بہت بڑا ناقد تھا۔ جس نے سرمایہ دارانہ معاشرے کی جیسی حقیقت پسندانہ عکاسی اور سفاکانہ تنقید کی اس کی تواریخ ادب میں بہت کم مثال ملتی ہے۔ اسے اس کے مخصوص پس منظر میں اپنے عہد کا ترقی پسند قرار دیا جاسکتا ہے، لیکن وہ اپنے عہد کا صرف ناقد تھا۔ اس سے زیادہ نہیں۔ اس کے برعکس گورگی اپنے عہد کا صرف ناقد نہیں، انقلابی بھی تھا اور معاشرتی تبدیلیوں کا گہرا شعور رکھتا تھا۔ ہمارے ہاں اس کی مثال حالی اور اختر حسین رائے پوری سے دی جاسکتی ہے۔ دونوں اپنے اپنے مخصوص پس منظر میں ترقی پسند ہیں۔ لیکن ایک کی ترقی پسندی غیر شعوری ہے اور دوسرے کی شعوری۔ اس طرح اگر اُردو افسانے میں دیکھا جائے تو ہم منٹو کی غیر شعوری ترقی پسند اور کرشن چندر کو شعوری ترقی پسند کہہ سکتے ہیں۔ روسی ادب سے متاثر ہونے کے باوجود منٹو سماجی انقلاب کا کوئی تصور نہیں رکھتا تھا۔ جبکہ کرشن چندر واضح تصور کا مالک تھا۔ پاکستان میں بھی اس دور کے بہت سے ترقی پسند افسانہ نگار ہیں جو طبقاتی استحصال، سماجی عدم مساوات اور جاگیردارانہ معاشرے کے ظلم کے بارے میں گہرا شعور رکھنے کے باوجود

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سماجی تبدیلی اور معاشرتی انقلاب کا واضح تصور نہیں رکھتے،لیکن جو اپنی فکر اپنی روشن خیالی، انسان دوستی اور لبرل خیالات کی وجہ سے ہر اعتبار سے ترقی پسند کہلانے کے مستحق ہیں اس لیے پاکستان میں ترقی پسند افسانے کی روایت سے بحث کرتے ہوئے اس نقطے کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔سوال یہ ہے کہ ہم پاکستان کے مخصوص پس منظر میں کسے ترقی پسند اور کسے غیر ترقی پسند کہیں گے اس بارے میں غور کرنے سے قبل یہ فیصلہ کرنا ضروری کہ پاکستان میں مخصوص حالات میں ترقی پسندی کا مفہوم کیا ہے؟

ترقی پسندی کا مفہوم ہر دور میں معروضی حالات اور تقاضوں کے تحت بدلتا رہتا ہے۔آج ہمارے حالات وہ نہیں ہیں جو حصولِ آزادی سے قبل تھے۔اس لیے ترقی پسندی کا بھی وہ مفہوم نہیں ہوسکتا جو دورِ غلامی میں تھا۔یہ سمجھنا کہ ترقی پسندی کا ہمیشہ اور ہر دور میں ایک مفہوم ہوتا ہے،غلط ہے اور نہ یہ سمجھنا درست ہے کہ ترقی پسند ہونے کے لیے اشتراکی یا مارکسی ہونا ضروری ہے۔ایک اشتراکی یا مارکسی ترقی پسند ہوسکتا ہے لیکن ایک ترقی پسند کے لیے اشتراکی یا مارکسی ہونا شرط نہیں۔ماضی میں بعض انتہا پسند اور تنگ نظر ترقی پسند ادباء اور ناقدین نے ترقی پسندی کو اشتراکیت کے ساتھ مشروط کر دیا تھا۔جس کے باعث ترقی پسندی اور اشتراکیت کو ہم معنی سمجھ لیا گیا تھا جس سے اگر ایک جانب ترقی پسند ادبی تحریک کو نقصان پہنچا تو دوسری جانب اس کی تنظیم اور مقاصد کو۔پاکستان کے نئے ترقی پسندوں نے اس غلطی کو شدت کے ساتھ محسوس کرلیا ہے۔اس لیے وہ اپنی صفوں میں ایسے لبرل اور روشن خیال ادیبوں کو بھی شامل سمجھتے ہیں جو اشتراکیت سے اتفاق نہیں کرتے لیکن جو آزادی جمہوریت بنیادی انسانی قدروں عقلیت پسندی خیر افروزی لبرزازم اور روشن خیالی پر یقین رکھتے ہیں اور جاگیردارانہ سرمایہ دارانہ استحصال اور ہر قسم کی امریت کے خلاف ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد جو نئے ترقی پسند افسانہ نگار منظرِ عام پر آ گئے ان میں روائتی (کنونیشنل) طرز کے افسانہ نگار بھی ہیں اور جدید طرز کے علامت نگار بھی۔ترقی پسند کنونیشنل افسانہ نگاروں میں قمر عباس ندیم مرحوم،ظہیر بابر،زاہدہ حنا،سعیدہ گزدر،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انور خواجہ اور عظیم آروی وغیرہ شامل ہیں اور علامت نگاروں میں انور سجاد، سمیع آہوجہ، اعجاز راہی، منصور قیصر اور احمد داؤد وغیرہ۔ان کے علاوہ ترقی پسند افسانہ نگاروں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں اگر چہ باقاعدہ طور پر کمٹیڈ تو نہیں لیکن وہ اپنے افکار و نظریات کے اعتبار سے جمہوریت پسند، جاگیر دارانہ اور آمرانہ نظام اور ہر قسم کی جبریت کے مخالف اور ترقی پسندوں کے بہت قریب ہیں۔ایسے افسانہ نگاروں میں رشید امجد، محمد منشایاد، مسعود اشعر، عرش صدیقی، نجم الحسن رضوی، علی حیدر ملک اور اے۔خیام وغیرہ شامل ہیں۔اس ضمن میں انتظار حسین کا ذکر کیۓ بغیر نئے افسانے کی بات مکمل نہیں ہوگی۔ انتظار حسین وہ متنازع افسانہ نگار ہیں جن کے بارے میں ترقی پسندوں نے ابھی تک کوئی قطعی رائے ظاہر نہیں کی ہے۔ابتداء میں ترقی پسندوں نے انہیں رجعت پسند قرار دیا جسے انہوں نے تسلیم کر لیا اور بات ختم ہوگئی۔سوال یہ ہے کہ کیا کسی ادیب کے خود کو ترقی پسند اور رجعت پسند تسلیم کر لینے سے وہ ترقی پسند یا رجعت پسند ہو جاتا ہے یا اس کی تحریریں اس کی گواہی دیتی ہیں؟ انتظار حسین کے بارے میں احمد داؤد نے یہ دلچسپ سوال اُٹھایا ہے اور ان کے افسانوں کے تجزیے کے ذریعے ثابت کیا ہے کہ انتظار خواہ خود کو رجعت پسند ہی کیوں نہ کہیں وہ افسانے کے اعتبار سے ترقی پسند ٹھہرتے ہیں۔ادب میں اصل شے دعویٰ نہیں، تخلیق ہوتی ہے اور اس کے مطالعے اور تجزیے کے ذریعے ہی کوئی افسانہ نگار ترقی پسند یا غیر ترقی پسند قرار پاتا ہے۔یہ درست ہے کہ انتظار حسین کا ترقی پسندی سے کوئی کمٹ منٹ نہیں بلکہ وہ بعض اوقات ترقی پسندوں پر شدید نکتہ چینی کرتے رہے ہیں۔لیکن وہ بنیادی طور پر لبرل، روشن خیال اور ہر قسم کی آمریت اور استبداد کے خلاف ہیں۔مانا کہ ماضی ان کی کمزوری ہے اور وہ ناسٹلجیا کے بھی شکار ہیں لیکن کیا یہ تمام باتیں ترقی پسندی کے بنیادی تصور کے خلاف ہیں؟ اگر نہیں تو انہیں دیگر نان کمٹیڈ ترقی پسند افسانہ نگاروں میں کیوں شامل نہیں کیا جا سکتا؟

☆☆☆☆☆

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریک ترقی پسند مصنفین اور تخلیقی مصنف

پروفیسر احمد علی

ترقی پسند مصنفین کی تحریک کے بارے میں کچھ ہی کیوں نہ لکھا گیا ہو دراصل یہ ایک رومانی تحریک تھی۔ اس میں بغاوت کا عنصر ضرور غالب تھا جو فرسودہ ماضی اور ناگزیر حال کے ان ناقص اور پراگندہ افکار رجحانات کے خلاف بلند ہوئی جو اس دور کے ادب اور زندگی میں نمایاں تھے اور ایک غیر قوم کی محکومیت کی طرف سے لوگوں کی بے حسی اور ان سب عقائد و پابندی رسوم کے خلاف بھی جو جہالت کی پیداوار تھے (جن کی وجہ سے ذہین انسان کی بہترین راہیں جو غور و فکر با تدبیر کی طرف لے جاتی ہیں بند ہو کے رہ گئی تھیں) اور ساتھ ہی ساتھ تشدد اور غربت و افلاس اور ترقی کی طرف سے بے اعتنائی کے خلاف احتجاج تھا۔ اس بغاوت کا محرک وہ جذبہ تھا جو ادب میں بیداری پیدا کر کے اسے زندگی سے ہم آہنگ اور نظم و نثر دونوں کو عوام کے لب و لہجہ اور محاورہ کے قریب تر لا کے انسان کی کاوشوں کو ذہنی و مادی آزادی کے مفہوم سے آگاہ و ہم کنار کر دینا چاہتا تھا اس تحریک کے اصل بانیوں کے ذہن میں اُس وقت کوئی خاص سیاسی و نظریاتی مقصد نہ تھا جب بڑے گرما گرم مباحثوں اور تخلیقی جوش و خروش کے بعد انہوں نے اپنے افسانوں کا مجموعہ ''انگارے'' ۱۹۳۲ء میں شائع کر کے اس تحریک کی داغ بیل ڈالی اور اس کی بنیاد رکھی۔ ہمیں یہ خیال ضرور تھا کہ اس کے شائع ہونے پر مخالفت ہوگی۔ لیکن اس بات کا سان و گمان نہ تھا کہ یہ مخالفت اس قدر شدت اختیار کر لے گی کہ ملک بھر میں تہلکہ مچ جائے گا دراصل نظریاتی مفہوم اس تحریک کے سیاسی کارکنوں نے ۱۹۳۶ء میں اس پر عائد کیا اور چنانچہ یہی لوگ جب سے برابر پیش پیش ہیں اور اس کی نمائندگی بھی اپنے قبضہ میں کر رکھی ہے۔ جب صوبائی حکومت نے ''انگارے'' کو زیر دفعہ ۲۹۵ الف تعزیرات ہند اس بناء پر ضبط کر لیا کہ یہ کتاب ایک خاص فرقہ کے مذہبی عقائد و جذبات کو مجروح کرتی ہے تو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محمود الظفر میرے اور رشید جہاں کے مشورہ سے ۱۹۳۳ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کا اعلان کیا اور چونکہ سجاد ظہیر اس وقت لندن میں تھے ان کی رضامندی کا ذمہ لیا جو بعد میں انہوں نے خود بھی بذریعہ خط بھیج دی۔ چنانچہ ۳۳-۱۹۳۲ء میں اس کے بانی مبانیوں کے سامنے جو اصل مقصد تھا وہ بالکل ادبی تھا اس میں سیاسی رجحانات اس سے زیادہ نہ تھے کہ ہم "ان تمام اہم مسائل زندگی پر آزادی رائے اور تنقید کا "حق چاہتے ہیں" جو نسل انسانی کو بالعموم اور برصغیر کے لوگوں کو بالخصوص درپیش ہیں....." (لیڈر، الٰہ آباد، مورخہ ۵ اپریل ۱۹۳۳ء) اسی زمانہ میں، لیکن اس اعلان کے بعد برصغیر کے ادیبوں کا ایک جلسہ لندن میں منعقد ہوا جس میں ملک رج آنند، راجہ راؤ، اقبال سنگھ اور سجاد ظہیر کے علاوہ دیگر حضرات بھی شامل تھے۔ جنھوں نے ہمارے مقاصد سے ملتے جلتے خیالات سے اتفاق کیا۔

وہ ہنگامہ جو ۱۹۳۶ء کی پہلی ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں ہوا۔ زیادہ تر سیاسی تھا اور اس نے تحریک کی اس شکل و ہیت کو مسخ کر دیا جس پر اس کی بنیاد پڑی تھی اور جسکا اعلان اس کانفرنس کے انعقاد سے تین سال قبل کیا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کانفرنس کے بعد وہ مصنف جو دراصل تخلیقی تھے۔ آخر کار تحریک کے سیاسی گروہ سے دور ہوتے اور کٹتے ہی چلے گئے جس کی بناء پر سجاد ظہیر نے انکا اور اصل واقعات کا ذکر اپنی یکطرفہ تصنیف میں یا تو نکرۂ تعصب سے کیا ہے۔ یا ان کو نظر انداز کر دیا ہے اور ایسی تصانیف کا نام تک نہیں لیا ہے جو ان کے مفاد کے منافی تھیں۔ یا ان کی بساط کے جمے ہوئے نقشہ کو درہم برہم کر دیتیں، حالانکہ یہی تحریریں ادبی ترقی میں مشعلِ راہ قرار دی گئی ہیں۔ سجاد ظہیر کا اندازِ بیاں اکثر تو اس قدر شخصی اور ذاتیاتی ہو گیا ہے کہ ذاتی عناد اور بغض معاویہ کا ثبوت دیتا ہے جس کی اصل وجہ ان کے اپنے ذہن میں ہی پوشیدہ ہے اور ایسی شدت اختیار کر گئی ہے جو ایک مورخ اور ناقد کے لیے حد درجہ ضرر رساں اور باطل ہے جس کا ذکر ہی سجاد ظہیر کے اپنے افتا اور عصمت کے متوازی ہوگا اور جس سے پرہیز اس لیے بہتر ہے کہ دو اغلاط

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک حق بننے کے مصداق نہیں۔

۱۹۳۲ء میں سجاد ظہیر اور اس نظریہ کے حامی چند اور رہرو بنیادی طور پر حسن کے خوگر و دلدادہ تھے جن کی دلی خواہش تھی کہ نظام زمانہ کے فرسودہ جمود میں حرکت پیدا کر کے اس کو اپنی تمناؤں کا آئینہ بنا دیں اور ادب کو بے حسی اور خواب غفلت سے بیدار کر کے زندگی کی گہما گہمی سے دوچار کر دیں۔ یہ نوجوان یورپ اور اس کے نئے ادبی رجحانات سے متاثر ہو چکے تھے اور اپنے ملک میں بھی ادب اور زندگی کی وہی لہر دیکھنی چاہتے تھے جو مغربی ممالک میں دوڑ رہی تھی اور دوسری شائستہ زبانوں کی طرح اُردو اور برصغیر کی دیگر زبانوں میں بھی عظمت اور عروج کے متمنی اور اپنے ہم وطنوں کی آزادی کے دل سے خواہاں تھے۔ یہ تعلیم یافتہ نوجوان اپنے جذبہ حب الوطنی کے جمالیاتی شعور اور اس ادبی تحریک کے حسن و جمال میں دل و جان سے منہمک تھے جو رفتہ رفتہ انگلستان سے لے کر جاپان تک پھیل رہی تھی اور جس نے یورپ کو جگا دیا تھا اور اب ایشیا کو خواب گراں سے چونکا رہی تھی۔ ان کے دلوں میں یہ امنگ بھی تھی کہ وہ بھی اور آزاد قوموں کی طرح اس عقیدے اور اس نظریہ پر کاربند ہو جائیں کہ انسان کے منصب اور اس کی عظمت کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ نئے رجحانات، افکار اور نئے طرز اور اظہار خیال کا بانی رہے۔ یہ وہ رجحان تھا جو ایک نو بیدار اور خوگرِ حسن 'بورژوازی' میں پیدا ہو کر ہر سمت پھیل چلا تھا۔ ہندوستانی نوجوانوں کا یہ محدود حلقہ بھی ایک رنگین اور گہرے تخیل سے لبریز تھا جس میں انسان کی حالتِ زار اور تخلیق کی کاوشوں کا درد برابر کسک بڑھا رہا تھا۔ اس میں شک نہیں یہ ایک ایسی دنیا تھی جسے کسی اور چیز سے سروکار نہ تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ لازمی بھٹی بھی تھی جس میں نئے رجحان اور خیالات پک کر کندن بن جاتے ہیں۔ تاہم اس تحریک کی دو اہم شخصیتیں ۱۹۳۲ء میں بہت چیزوں میں ہم خیال و ہم ذوق تھیں۔ مثلاً شوخ رنگ کی قمیضوں اور متضاد رنگ کی ٹائیوں، چوڑے کنارے کے سیاہ ہیٹ پہننے اوڑھنے اور طرح بہ طرح کے شمدان اور پیرس کی گرجا پر بنے ہوئے شیطانوں کے مجسمے جمع کرنے کا شوق، باخ اور بیتھوون کے سنگیت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے رغبت اور جمیز جوائس، ڈی، ایچ۔ لارنیس، ورجینا وُلف اور ''نیورائٹنگ'' کے شعراء کے ساتھ ساتھ گورکی اور چیخوف کی تصانیف سے لگاؤ اور حالانکہ وہ حد درجہ قوم پرست ہونے کے باعث انگریزی راج کے مخالف تھے۔ تاہم مارکسیت کا جذبہ ان پر اس وقت غالب نہ تھا۔ گوان میں سے بعض اس نظریہ کی طرف مائل ضرور تھے کیونکہ اس کے علاوہ سماجی اور سیاسی دلدل سے نکلنے کا کوئی اور راستہ نظر نہ آتا تھا، مگر کچھ افراد میں یہ جذبہ مبہم تھا۔ گوکئی میں نمایاں حیثیت بھی رکھتا تھا۔ بنیادی طور پر یہ عقائد سیاسی نہیں بلکہ رومانی تھے اور اس خواہش پر مبنی تھے کہ نظام زندگی کو بہتر بنائیں اور اپنے وطن اور اس کے فنونِ لطیفہ کو اسی معیار و تاثر کے برابر پہنچا دیں جو آزادی حاصل کرنے والے ممالک کو حاصل تھا۔ جو نہ صرف لوگوں کو موجودہ زمانہ ہی میں فرسودہ رسوم اور ذہنی قید سے رہائی دلا کر آزادی کے احساسات کا اثبات کر سکے بلکہ ایک تابناک مستقبل کی طرف بڑھنے کی تلقین و رہنمائی بھی کرے تاکہ وہ خود کو ایک آزاد دنیا کے ادیبوں کا ہم پلہ محسوس کر سکیں اور ان کے ہمراہ خود بھی سیاسی، فکری اور ذہنی آزادی سے فائدہ اُٹھائیں اور انسان کی شکستہ عقیدت اور ایقان کی تعمیر نو کر کے اس کو پھر انسانیت اور ہوشمندی کا گرویدہ بنا دیں اور اس طرح سب کے واسطے بلالحاظِ مذہب وملت، رنگ ونسل جدو جہد اور ترقی کی راہیں یکساں کھول کر انسان کی عظمت اور بلندی منصب کو دوبارہ زندہ کر دکھائیں۔

ظاہر ہے یہ سب رجحانات اصلاً رومانی تھے جن کا اثبات تحریک سے منسلک ہونے والے تخلیقی مصنفین کی تحریروں سے آج اور بھی صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے۔ چاہے وہ مجازؔ کی شاعری ہو یا جوشؔ کی یا پریم چند کی تصانیف یا خود سجاد ظہیر کی ناول نویسی کے میدان میں ناکامیاب کوشش یعنی ''لندن کی ایک رات''۔ کبھی کبھی ان میں سے کچھ لکھنے والے تخلیق کے کرب میں اپنی ذات سے ابھر کر انسانی جبلت اور نازک ترین احساسات تک پہنچ جاتے ہیں جیسے ''کفن'' میں جو انسان کی طبعی بے عملی اور جہد مسلسل کی تمثیل بن جانے کا درجہ رکھتا ہے اور کہیں کہیں وہ تھوڑی دور تک ترقی پسندی کی طرف

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رجوع ہوتے ہیں مثلاً کرشن چندر کی ''ایک فرلانگ لمبی سڑک'' یا منٹو کے ''نیا قانون'' میں مجموعی طور پر وہ اس دنیا کا رومانی تصور اور انداز برقرار رکھتے ہیں جو یا تو فرسودہ ہو چکی تھی یا ابھی تک وجود میں نہیں آئی تھی۔

یہ عالم کوئی منجمد اجسام اور ٹھہرے ہوئے خیالات کا مجموعہ نہیں۔فطرت ہمیشہ سے روانی، حرکت اور نت نئی تبدیلیوں کی طرف راجع و مجبور ہے۔یہ لازمی نہیں کہ جو چیز آج حق تصور کی جاتی ہے کل بھی قابل قبول ہو۔نور و ظلمت، حیات و ممات، تعمیر و تخریب لازم و ملزوم ہیں۔یہ سب ایک ہی حقیقت کے دو روپ ہیں۔ہر شے اپنا تضاد ساتھ لے کر وجود میں آتی ہے۔اگر اس تحریک سے منسلک اہل نظر یہ کسی واحد نظریہ اور مقصد کے حصول میں ایقان رکھتے ہیں تو انہیں یہ حقیقت بھی فراموش نہ کرنی چاہیے کہ تخلیق کا وہی کرب جو ان کے مقصد اور نظریہ کے حصول کا سبب بنا ہے، اس نظریہ کو موت کی گھاٹی میں اتارنے کے لیے تخریبی صورت اختیار کرے گا۔اس لیے کہ کبھی کوئی شے ہمیشہ ایک ہی سطح پر برقرار نہیں رہتی۔ثبات صرف تغیر کو ہے۔برصغیر سے برطانوی راج کے خاتمہ کے ساتھ ساتھ اس صدی کے تیسرے دور کی حقیقتیں اور حالات تبدیل ہو گئے۔چنانچہ اس تحریک کے سیاست پسندوں نے اپنے نظریات و مقاصد میں تبدیلی و ترمیم کر کے اشتراکیت کا نعرہ بلند کیا۔ان سیاست پسندوں کو یہ حقیقت بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اگر انہوں نے یہ مہم سر کر بھی لی تو کیا آج کی موجودہ حقیقت ختم نہ ہو جائے گی؟ اور کیا کل جو حقیقت اور مسائل ابھر کر سامنے آئیں گے وہ نئے نظریات، نئے مسائل کو جگہ دینے کے لیے دم نہ توڑ دیں گے؟

ایک تخلیقی مصنف حقیقت کا اظہار ماضی کے گہرے شعور اور آگہی کے ساتھ کرتا ہے اور حال کا احساس اس کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا رہتا ہے۔ان ہی اوصاف کے اجتماع کے بدولت وہ مستقبل کے لیے مشعلِ راہ بن جاتا ہے کیا تحریک کے سیاست پسند آج تحریک کے عفو خواست نہیں ہیں؟ یہ ایک ناقابل فراموش حقیقت ہے کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترقی پسند تحریک مارکسزم یا اشتراکیت کی تحریک نہیں تھی۔اس خاص نظریہ کے حامی یا تو غلطی پر ہیں یا پھر وہ اس تحریک کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے آلہ کار بنانا چاہتے ہیں اور بہ فرضِ محال ایسا تھا بھی تو یہ تصور ان عفو خواست لوگوں کے اذہان ہی میں پوشیدہ اور ان کی ذات سے ہی وابستہ تھا۔لیکن اس نظریہ کو نہ تو قبولِ عام کا شرف حاصل ہوا اور نہ ہی یہ راہ دوسروں نے اختیار کی۔اس صدی کے تیسرے دور کے مشہور تخلیقی مصنفین میں سے کسی نے بھی اشراکیت شعار نہیں کی علاوہ اس واحد ذات کے جو آج مشکوک ہو چکی ہے۔۳۹۔۱۹۳۸ء میں جب اس تحریک کو اشتراکی نظریہ کے تابع کرنے کی کوشش کی گئی تو تخلیقی مصنفین کے ایک حلقہ نے فوراً اس تحریک سے علیٰحدگی اختیار کر لی۔اگر پریم چند زندہ رہتے تو ان کا فیصلہ بھی یہی ہوتا۔کیونکہ وہ کسی طرح بھی اشتراکی نہ تھے۔حالانکہ وہ ان معنوں میں ترقی پسند ضرور تھے جن میں ہم اس لفظ کے مفہوم کو سمجھتے ہیں۔یعنی ادب اور زندگی میں ترقی، وہ ترقی جو آزادی اور خیالات کی ترتیب اور ان کے رجحان میں مسرت انگیزی، صحت مندی اور بہبود کا پیغام لائے ہمارے نزدیک ترقی پسندی کا مطلب عوام الناس کی بہبودی اور بھلائی تھا نہ کہ صرف مزدوروں، مزارعین اور مخصوص نظریات کے حامیوں کی بھلائی کا۔ہمارا مقصد یہ ہرگز نہ تھا کہ کسی مخصوص نظریہ سیاست یا مجموعہ عقائد کے تابع ہو جائیں۔اشکال کی صورت میں اگر اس مسئلہ کو دیکھا جائے جو بیان و تشریح کا ایک ذریعہ ہے لیکن جس سے سجاد ظہیر کو اپنی تصنیف ''روشنائی'' میں اس قدر چڑ ہے، تو شکل اس طرح نظر آئے گی کوئی بھی ایک نقطہ وقت پر کھنچے ہوئے خط پہ کبھی ایک ہی مقام پر برقرار نہیں رہتا۔یعنی الف ب اور ب ج میں تبدیل ہو جاتا ہے۔اس کے ساتھ ہی ساتھ وقت کا وہ خط بھی مسلسل طور پر بدلتا رہتا ہے اور س سے ص اور ے تک بڑھ آتا ہے۔انسانی تہذیبوں میں بھی اسی نوع کی تحریک برابر ہوتی رہتی ہے۔جاگیرداری شہنشاہیت میں تبدیل ہو گئی اور شہنشاہیت دوسری تحریکوں میں اور یہ حرکت مستقلاً جاری ہے۔کسی مخصوص نظریہ اور کسی واحد حقیقت کو قبول کر لینا اور پھر اسی پر قائم رہنا بذات خود ترقی کے منافی ہے۔یہ وہ مقصد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں جس پر ہمارا یقین تھا اور جس کا ہم مطالبہ کر رہے تھے۔ گو یہ دوسری بات ہے کہ آج جو حضرات اس تحریک کے سربراہ اور محافظ ہیں وہ اسی نظریہ پر قائم ہیں اور بضد بھی ہیں۔ لیکن کارواں آگے ہی بڑھتا رہتا ہے۔

ان شعراء کو چھوڑ کر جو دیرینہ روایت کے حامی تھے مثلاً جوشؔ یا وہ شاعر جن کے کلام میں ہمواری پیدا نہیں ہوئی، اس گروہ کے دو ممتاز شاعر اسرار الحق مجاز اور فیض احمد فیض ہیں۔ سوان دونوں کی شاعری بنیادی طور پر رومانی ہے۔ اس میں انسان اور آرٹ کے ایک نوزائیدہ نظریہ اور شعور کے نئے پردوں کے وا ہو جانے پر نت نیا تحیّر اور استعجاب پایا جاتا ہے، اس میں زندگی اور سیاست کا ایک نیا احساس اور پہلو ملتا ہے اور سماجی مسائل اور قیودِ ماضی و رسوم کو سمجھنے کی نئی صلاحیت بھی۔ ان کی تشبیہیں اور استعارے ان کے اپنے گرد و پیش کی زندگی سے ماخوذ، ان کی زبان لوگوں کی فہم کے قریب تر، اور ان کے اشعار احساسِ ذات اور انسانی عظمت کی صفات کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کی شاعری دیرینہ خیالات کو نئے رنگ میں پیش کرتی ہے، اور ان کی تشبیہات اور تاثر کا نیا پن ایک خاص خوشی بخشتا ہے، لیکن مجازؔ جورات میں ریل کے سفر کو سٹیفین سپینڈر سے بھی زیادہ دلکش پیرائے میں بیان کر سکتا تھا۔ یا چاند کو مُلّا کے عمامے اور بنئے کی کتاب سے تشبیہ دے سکتا تھا۔ اپنی ذاتی زندگی میں حد درجہ نجی اور داخلی جد و جہد میں مبتلا تھا اور مستئ شراب میں ایک میخانہ کے اندر ہاتا پائی میں جاں بحق ہوا۔ جو ایک انتہائی رومانی موت تھی۔

فیضؔ حالانکہ زندگی میں سنجیدہ اور متین شخص ہیں اپنی شاعری میں وہ بھی محبت کے جال میں گھرے ہوئے نظر آتے ہیں اور روایاتِ دیرینہ اور وہ ذاتی مسائل جو ایک شاعر کی تمنا ہیں۔ ان کے لیے مزدور، کسان یا عوام الناس کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی آواز یکتا شخصی اور ذاتی ہے جو ماضی کی آوازِ بازگشت کے ساتھ ساتھ بیزاری کی تڑپ اور کم از کم شروع کی نظموں میں تو بغاوت کی اولین جھلک سے تیز ہو جاتی ہے۔ مگر اس کے باوجود نہ تو پیشین گوئی اور نہ تجزیہ میں ان رومانی رجحانات سے ابھر کر آگے بڑھتی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے جو اس میں مضمر ہیں، نہ کسی سیاسی منزل ہی کی نشاندہی کرتی ہے چنانچہ سجاد ظہیر بھی جو اس تحریک کے سیاسی محافظ بنے ہوئے ہیں ۱۹۵۶ء میں فیض کے تیسرے اور آخری مجموعہ کلام ''زنداں نامہ'' کے پیش لفظ میں اقرار کرتے ہیں کہ فیض کے تمام چاہنے والے ان سے یہ توقع اور امید رکھتے ہیں کہ کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے ان کی وہ تخلیقات جو ابھی نہیں ہوئیں، ان کے مقابلہ میں جو وہ کر چکے ہیں زیادہ گراں قدر ہوں گی۔'' اس صالح امید اور توقع کے باوجود فیض کا کوئی اور مجموعہ ابھی تک شائع نہیں ہوا، اور وہ دو چار نظمیں جو کبھی کبھار مختلف رسائل میں وقتاً فوقتاً ''زنداں نامہ'' کے بعد شائع ہوئی بھی ہیں۔ سجاد ظہیر کی امیدوں اور توقعات پر پانی پھیر دیتی ہیں اور ''لینن پرائز'' کے باوجود اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ ان کی شاعری میں اضمحلال پیدا ہو گیا ہے۔

فیض کی شاعری کا جائزہ لینے کے بعد جو صفات ان کے کلام میں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں وہ تغزل کا نغمہ اور محبت کا جوش ہیں۔ ان کی وہ نظم جس کا عنوان ''تنہائی'' ہے ان کے حقیقی موضوع اور اظہارِ خیال کے معراج ہے:

پھر کوئی آیا دلِ زار نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا....

جدید نظموں میں سے چند ہی ایسا تاثر پیدا کر سکی ہیں جو ایک جذبہ کو اس طرح از سرِ نو تخلیق کرتا ہے کہ اس کا نغمہ ذہن میں دیر تک گونجتا رہتا ہے، اس کے باوجود بھی اس نظم میں جو مسئلہ درپیش ہے اور اس کا حل بھی دوسرے درجہ کی رومانیت سے آگے نہیں بڑھتا اور انگریز رومانی شاعروں کے دوسرے گروہ کی رومانی شاعری کے ہم پلہ ہے جو ''پری ریفیلائٹ برادرہڈ'' کے نام سے مشہور ہے۔ ''نقشِ فریادی'' کی کئی اور نظموں میں فیض ان ہی خیالات کا مختلف لہجے اور مختلف اسالیب سے اپنے محبوب سے خطاب کرتے ہوئے پیش کرتے ہیں اور نئی تشبیہوں میں ماضی کا زوال کے افکار غالب کے الفاظ اور جملوں میں ادا کرتے ہیں۔ گو ان میں غالب کی سی گہرائی اور نشتریت پیدا نہیں ہوئی اور نہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

الیٹ ہی کی وہ خالی فضا میں گونج "جوہولو مین" (کھوکھلے انسان) میں سنائی دیتی ہے جن کا شائبہ فیض کی نظموں کے ہیرو میں ملتا ہے۔

اس بات میں شک نہیں کہ فیض اپنی شاعری میں فرسودہ رسوم و رواج اور کہنہ خیالات پر تخلیقی کاوشوں کے دوران چوٹ کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کے نظریہ حسن اور جذبہ عشق میں تحیّر و استعجاب کے احساسات نہ تو ہم کو آگے بڑھاتے ہیں اور نہ رومانی جذبات کے منافی ہی ہیں اور جب وہ رسمی محبت کے بوجھ کو اپنے سر سے اتارنے کی کوشش کرتے ہیں جو ماضی سے اکٹھا ہوتا چلا آیا ہے تو وہ ارنیسٹ ڈاؤسن کی عدمیت سے آگے نہیں بڑھ سکتے جیسا کہ ان کی اس نظم سے ظاہر ہے:

مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ

فیض کے آخری مجموعے "زنداں نامہ" کی ایک غزل کی ابتداء اس طمطراق سے ہوتی ہے کہ ہماری امیدیں بندھ جاتی ہیں کہ فیض اب بغاوت کی آواز بلند کریں گے:

رہِ خزاں میں تلاشِ بہار کرتے رہے
شبِ سیہ سے طلب حسنِ یار کرتے رہے
خیالِ یار کبھی ذکرِ یار کرتے رہے
اسی متاع پہ ہم روزگار کرتے رہے!

مگر اگلے ہی شعر میں بجائے آگے بڑھنے کے وہ خود ہی میں کھو جاتے ہیں اور وہ بغاوت کی آواز جذبہ رقت کی سرد آہ میں ضم ہو جاتی ہے:

نہیں شکایتِ ہجراں کہ اس وسیلے سے
ہم ان سے رشتہ دل اُستوار کرتے رہے

اور سجاد ظہیر کی توقعِ "ترقی" اپنا رُخ یک لخت دوسری سمت میں بدل لیتی ہے۔
اس مجموعہ کی دوسری نظموں اور غزلوں میں جو سب کی سب ایامِ اسیری میں لکھی گئی تھیں۔ یہی حسرتِ حسن اور تمنائے درد و محبت ملتی ہے:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

شاخ پر خونِ گل رواں ہے وہی　　شوخی رنگِ گلستاں ہے وہی
سر وہی ہے تو آستاں ہے وہی　　جاں وہی ہے تو جانِ جاں ہے وہی
اب جہاں مہرباں نہیں کوئی　　کوچہ یارِ مہرباں ہے وہی
برق سوبار گر کے خاک ہوئی　　رونقِ خاکِ آشیاں ہے وہی
آج کی شب وصال کی شب ہے　　دل سے ہر روز داستاں ہے وہی
چاند تارے ادھر نہیں آتے　　ورنہ زنداں میں آسماں ہے وہی

حتیٰ کہ اُس نظم میں بھی جہاں ہمیں ان کے مخصوص لیساری رجحان کے اظہار کی توقع تھی۔صرف رومانیت اور تغزل ہی نظر آتے ہیں:

بول کے لب آزاد ہیں تیرے　　بول زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا　　بول کہ جاں اب تک تیری ہے....

چنانچہ ان نظموں میں بھی جو جیل میں لکھی گئی تھیں اس سے زائد سیاسی فکر نہیں پایا جاتا۔

ایک شاعر کے لیے ان دو میں سے ایک ہی صورت ہو سکتی ہے: یا تو وہ اپنے آپ سے دروغ گوئی نہ کرے، یا پھر اپنے ذاتی اخلاص کو اس تحریک کے سیاسی نگرانوں کو سونپ کے قربان کر دے جس تحریک سے وہ اس بنا پر منسلک تھا کہ اس میں اس کے اپنے خیالوں کا عکس نظر آتا تھا جن کی بنیاد اصولِ انسانیت پر تھی نہ کہ کسی خاص مارکسی سیاسی رجحان پر آج بھی اس تحریک کے قدامت پسند گروہ کی منزلِ مقصود ہے اور جس کی تحریریں سیاسی نظریات میں رنگی ہوئی اور صرف مزدوروں اور کسانوں کے مفاد اور بہبود کے لیے وقف ہیں جن میں نہ تو آفادیت ہی ملتی ہے اور نہ وہ پڑھنے والوں کے دل و دماغ ہی کو آزادانہ طور پر متاثر کر سکتی ہیں۔لیکن فیضؔ آج بھی اس لیے مقبول ہے کہ وہ دھیمے سروں میں جذباتِ محبت کا اظہار اس طرح کرتا ہے کہ اس میں رشتہ ماضی سے استواری کے ساتھ حال سے بھی آگہی ملتی ہے، جس کی شریانوں میں زندگی اور حسن کا لہو دوڑ رہا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فیض کو اس تحریک کے سیاسی نگراں آج بھی بلند پایہ شاعر مانتے ہیں اور تحریک کی نمائندگی کا شرف بھی بخشتے ہیں۔ اس مختصر جائزہ سے وہ وسیع اختلاف واضح ہو گیا ہوگا جو تحریک کے قدامت پسند سیاسی گروہ اور اصلی انجمن ترقی پسند مصنفین کے تخلیقی مصنفوں کے درمیان ۱۹۳۶ء کے بعد موجود رہا ہے۔ میں نے یہاں نثر نگاروں سے اس لیے بحث نہیں کی کہ تحریک کے سیاسی نگرانوں نے ابھی تک کسی افسانہ نویس ناول نگار کو ان معنوں میں "ترقی پسند" ہونے کا اعزاز عطا نہیں کیا جن سے فیض کو سرفراز کر چکے ہیں۔ فاقدین میں مجنوں گورکھپوری کو صفِ اول میں جگہ دی جاتی ہے۔ ان کے اندازِ تنقید کے محاسن سے قطع نظر اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ان کا انداز نظر عمرانیاتی ہے، لیکن وہ بھی اس بات کے داعی ہیں کہ زندگی کو مکمل اور جامع بنانے کے لیے روٹی کے علاوہ اور چیزیں بھی ضروری ہیں۔ مزید براں ان مصنفوں اور نقادوں کو جو ابتداء میں اس تحریک سے منسلک اور اس صدی کے تیسرے دور میں ہر طرح اہم اور صحیح و وسیع معنوں میں ترقی پسند بھی تھے۔ سجاد ظہیر نے یکسر فراموش کر دیا ہے یا انہیں روشنائی میں روسیاہ کرنے کی کوشش کی ہے اور اگر کہیں ان کے قلم سے ان کے لیے کچھ نکلا بھی ہے تو اس قدر بخل و عناد کے ساتھ کہ اگر اس کو درگذر ہی کر دیتے تو ان کی توقیر تنقید میں کمی واقع نہ ہوتی۔

دراصل بنیادی غلطی اس خیال سے پیدا ہوتی ہے کہ یہ تحریک ایک خاص قسم وخیال کی سیاسی تحریک تھی، حالانکہ یہ تحریک اشتراکی نہ تھی بلکہ مصنفوں اور پڑھنے والوں کی ایسی جماعت تھی جو آگے قدم بڑھانے کی ترغیب دلاتی تھی جس کا مقصد ماضی کی غلطیوں اور بے اعتنائیوں کو دور کرنا، مشاہدہ کی صداقت اور حقیقت پسندی تھا (یہ اور ہی بات ہے کہ ان میں سے بیشتر اس اصول پر زیادہ دیر تک کار بند نہ رہ سکے) یہ تحریک اس بات کی خواہش کا اظہار تھی کہ معاشرے اور سماج کو خرابیوں سے پاک کر دیا جائے اور اس عقیدہ کی تجدید نو تھی کہ انسان کا مقصد ایک آزاد اور مہذب مخلوق کی طرح زندہ رہنا اور حب الوطنی کے جذبات اور غور وفکر کے مادے کو فروغ دینا ہے۔ اس کا مقصد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سماجی اور ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ آرٹ اور ادب میں بلند معیار کے قیام کے لیے جدوجہد کرنا تھا۔ ان معنوں میں ''ترقی پسندی'' کا مطلب مختصراً یہ تھا کہ بلالحاظِ امارت وغربت ،مہذب انسانوں کی زندگی کو زیادہ پرمسرت اور مکمل بنانے کے لیے خیالات، معیار اور انداز بیان واظہار کو بلند کیا جائے اور اس منزل کی طرف رہنمائی کی جائے۔ جہاں ہر شخص تفکرات سے آزاد ہو، جہاں انسانی زندگی اس غربت وافلاس کے سایوں میں مبرّا ہو جو محض جہالت کی پیداوار ہیں، جہاں ''انتہائی اہم مسائلِ حیات پر آزادی رائے اور آزادی تنقید کے حقوق حاصل ہوں'' اور ذہن قیودِ رسوم وتوہمات سے آزاد ہوں۔ سیاست پسندوں کے علاوہ اس تحریک کے بیشتر نمایاں اور اہم اراکین فرانسیسی مفکر روسو کی طرح رومانوی یا انقلابی تھے جن کا مسلک ایک نئے اور بہتر معاشرے کی تعمیر وتشکیل کی کرنے کے لیے جدوجہد کرنا تھا کہ ۱۹۴۷ء کے بعد مصنفوں میں اس تحریک کا اثر اور مقبولیت ختم ہوگئی اس امر کا مسلمہ ثبوت ہے اس بے چینی و بیزاری کا اظہار جو ۱۹۴۷ء کے بعد حالات سے پیدا ہوگئی ہے۔ اس صدی کے تیسرے دور کے ترقی پسند مصنفین کی تحریک کے ذریعہ کبھی نہیں ہوگا بلکہ اور ہی ذرائع سے، اور اس تحریک کے اولیں ممبروں کے قلم سے نہیں بلکہ دیگر مصنفوں کی تحریروں سے اس لیے کہ ترقی کے معنی ایک ہی مقام پر ٹھہرے رہنے کے نہیں، اور وہ شے جس کو وقت کی گردش اور فاصلہ کے تقاضہ نے ہم سے دور کر دیا ہے کبھی بھی وقت وفاصلہ کے اسی مقام پر واپس نہیں آسکتی جس سے وہ آگے بڑھ چکی ہے۔

☆☆☆☆

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اُردو ادب کی ترقی پسند تحریک

(ایک تنقیدی جائزہ)

عبادت بریلوی

ادب میں صحت منداور ترقی پسند خیالات کی ترجمانی کوئی عجیب بات نہیں۔ ہر دور کے ادب میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ البتہ ان خیالات کی نوعیت مختلف ہوسکتی ہے۔ یعنی ہوسکتا ہے کہ یہ خیالات سیاسی و معاشی اعتبار سے ترقی پسند اور صحت مند ہونے کے بجائے روحانی مذہبی اور اخلاقی اعتبار سے ترقی پسند ہوں۔ دنیا جہان کے ادبیات میں ایسے مختلف ترقی پسند خیالات کی ترجمانی ملتی ہے۔ لیکن ادب میں سیاسی سماجی و معاشی زندگی سے متعلق ترقی پسند خیالات کی ترجمانی کسی مستقل تحریک کی صورت میں بیسویں صدی سے قبل ہمیں نظر نہیں آتی بیسویں صدی کی ابتداء ہی سے زندگی کے متعلق نقطۂ نظر بدلا۔ عقلیت کی روشنی نے مادیت کے خدوخال نہ زیادہ نمایاں کئے نتیجہ یہ ہوا کہ ماورائی امور مابعد الطبیعاتی باتوں کے بجائے زندگی کے بنیادی مسائل پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ افراد بڑی حد تک زندگی، اسکی ہر بات اس سے متعلق ہر واقعے اور سانحے کو عقل و شعور کی روشنی میں دیکھنے لگے۔ یہ زاویہ نظر کی ایک بڑی اہم تبدیلی تھی۔ اسی نے ادب میں ترقی پسند تحریک کو پیدا کیا جو آناً فاناً بن میں لگ جانے والی آگ کی طرح دنیا کے تمام ممالک میں پھیل گئی۔ زندگی کی عکاسی اور ترجمانی تو اس سے قبل دنیا کے تمام ممالک کے ادبیات ہر دور اور ہر زمانے میں کرتے رہے تھے۔ لیکن اب اس ترجمانی اور عکاسی نے ایک نیا روپ اختیار کیا۔ اب ان میں سے ہر ایک ملک کے ادب نے عکاسی اور ترجمانی کے ساتھ ساتھ زندگی کے لیے کچھ کرنا بھی چاہا۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کو مادی اعتبار سے بلند کردینے کی بھی جی میں ٹھانی چنانچہ اس سلسلے میں ادب کے ذریعے پیام بھی دیے گئے اور جب یہ تمام کوششیں منظم ہوگئیں تو اس کو ترقی پسند تحریک کے نام سے موسوم کیا گیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہمارے اُردو ادب میں بھی زندگی کی ترجمانی اور عکاسی کا سلسلہ ہمیشہ سے جاری رہا۔ قدیم سے قدیم شاعروں کے یہاں بھی ان کے اپنے وقت کی سماجی زندگی کی تصویریں مل جاتی ہیں اُردو کے پرانے شاعروں نے زندگی کے تمام پہلوؤں کو پیش کیا ہے، تاریخ کے مدوجزر کے اثرات کسی نہ کسی صورت میں ان سب کے یہاں نظر آتے ہیں۔ طبقاتی تفریق کی جھلک کا بھی ان کے یہاں پتہ چلتا ہے۔ سماجی کشمکش کے نشیب وفراز بھی دکھائی دیتے ہیں غرض یہ کہ ان کے یہاں وہ سب کچھ موجود ہے جو زندگی میں ہے لیکن فرق یہ ہے کہ پرانے شاعروں نے زندگی اور اس کے مختلف موضوعات کی جو ترجمانی کی ہے اس میں ان کا نقطۂ نظر اجتماعی نہیں۔ وہ ہر چیز کو انفرادی زاویہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان میں اجتماعیت کا شعور نام کو نہیں تھا، کیونکہ اس وقت سماجی زندگی کا جو ڈھانچہ تھا، اس میں اجتماعی زندگی کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی جاتی تھی۔ پس ادب میں اجتماعی شعور کہاں سے آتا۔ چنانچہ قدیم ادب میں اس اجتماعی شعور کے نا ہونے ہی کا یہ اثر ہے کہ اس میں زندگی کی ترجمانی اور عکاسی تو موجود ہے لیکن تنقید نہیں کیونکہ تنقید کا شعور اجتماعی زندگی کے گہرے مطالعے ہی سے پیدا ہو سکتا تھا اور اس کی طرف حالات نے لوگوں کو توجہ ہی نہیں کرنے دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ولؔی اور اس سے قبل کے شاعروں سے لیکر امیؔر اور داغؔ تک کے یہاں زندگی اور خصوصاً سماجی زندگی کی تنقید اجتماعی نقطۂ نظر سے نظر نہیں آتی۔۔۔ان میں سے بعض شاعروں نے بدلتے ہوئے سماجی حالات سے متاثر ہو کر کہیں کہیں اپنی الجھنوں اور پریشانیوں کا رونا ضرور رویا ہے۔۔۔ اور اس میں شک نہیں کہ ان کی اس قسم کی تخلیقات سے اس زمانے کے سماجی حالات پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ لیکن ان کو سدھارنے کا کوئی احساس نظر نہیں آتا۔ مرض کی تکلیف انہیں کراہنے، رونے اور چلانے پر تو مجبور کرتی ہے لیکن وہ اس کا علاج نہیں سوچ سکتے۔ یہ شعور ہی ان کے اندر نہیں تھا۔ چنانچہ میرؔ سوداؔ، غالبؔ، یہ سب کے سب اسی صورتِ حال کے ترجمان ہیں۔ انہوں نے کہیں کہیں حالات کی عکاسی کی ہے۔ لیکن شعوری طور پر وہ کوئی پیام نہیں دے سکے ہیں۔ کیونکہ اس وقت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ لیکن غدر کے بعد جب سرسیّد کی تحریک سماج کے افراد میں ایک اجتماعی شعور پیدا کر دیتی ہے تو اُردو ادب ایک پیام سے بھی روشناس ہوتا ہے۔ چنانچہ ترقی پسند تحریک کا سلسلہ اس تحریک سے ملایا جا سکتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ سرسید کی تحریک اصلاحی تھی اور اس میں بعض بنیادی خامیاں تھیں اس لیے اسے آئیڈیل نہیں کہا جا سکتا۔ پھر بھی سرسید کی تحریک اُردو میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اس کے بعد سے اُردو ادب میں اجتماعی زندگی کی نہ صرف ترجمانی اور عکاسی بلکہ اس کی تنقید کا سلسلہ شروع ہوا سرسید کی تحریک کے بعد عرصے تک کوئی تحریک تو ایسی شروع نہیں ہو سکی جو کسی منظم پروگرام کے ماتحت ادب کو اس راستے پر آگے بڑھاتی، لیکن انفرادی طور پر ان کوششوں کا سلسلہ جاری رہا۔ سرسیدؔ، حالیؔ، شبلیؔ، نذیر احمد وغیرہ تو ایک تحریک کے ستون تھے، لیکن ان کے بعد اقبالؔ، چکبستؔ، سرورؔ جہان آبادی اور پریم چند وغیرہ کسی تحریک کے ستون نہیں تھے، لیکن اپنی اپنی جگہ انہوں نے اپنے اپنے وقت کی تحریکوں کا ساتھ دیا ہے۔ صحیح حالات کی ترجمانی کی ہے۔ حبِ وطن کا نعرہ بلند کیا ہے اور اس وقت کی سیاست پر روشنی ڈالی ہے، ان کے بعد جوشؔ اور کچھ دوسرے لکھنے والے آگے بڑھتے ہیں جن کے پیشِ نظر انقلاب کا ایک واضح تصور اور نئے نظام کی ایک مکمل تصویر ہوتی ہے۔ لیکن یہ سب کوششیں اُردو میں انفرادی طور پر ہوتی رہیں۔ ان کو ایک لڑی میں پرونے کا سہرا ترقی پسند تحریک کے سر ہے۔

ترقی پسند تحریک اُردو میں ۱۹۳۵ء میں شروع ہوئی۔ اس اعلان نامہ جس میں اس تحریک کے اغراض و مقاصد کی وضاحت کی گئی تھی اسی سال شائع ہوا۔ اس وقت اس تحریک کے علم بردار وہ چند نوجوان تھے جنہوں نے یورپ کی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی اور وہاں کے دورانِ قیام میں یورپ کی ادبیات میں چلتی ہوئی مختلف تحریکوں کا بغور مطالعہ کیا تھا، وہ اس ساری کشمکش سے واقف تھے جو یورپ کے ہر ملک کی زندگی اور ساتھ ہی ادب میں جاری تھی اور جس کے اثرات ہندوستان پر بھی پڑ رہے تھے۔ اس وقت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یورپ کی حالت یہ تھی کہ فسطائیت اپنا زور باندھ رہی تھی۔ سرمایہ دارنہ آمریت کے سامنے اپنی بہتری کا خیال تھا۔ بیچارے عوام کی ان دونوں کو کوئی پروانہیں تھی، لیکن اس کے ساتھ ہی بعض ممالک میں اب عوامی تحریکیں بھی چل نکلی تھیں اور عوامی خیالات باوجود مخالفت کے ہر ملک میں عام ہوتے جارہے تھے، کم از کم پڑھا لکھا، ذہین اور باشعور طبقہ ان خیالات سے ضرور متاثر ہورہا تھا اور اس میں ادیب اور فنکار بہت زیادہ پیش پیش تھے۔ ہندوستانی نوجوان جب یورپ سے واپس ہوئے تو انکے ساتھ ان عوامی خیالات کا سرمایہ تھا۔ عوامی تحریکوں کو شروع کرنے اور پروان چڑھانے کی ایک امنگ بھی تھی اور اس سلسلے میں ادب اور فن سے کام لینے کا ایک والہانہ جذبہ تھا۔

ہندوستان کی حالت اس وقت یہ تھی کہ وہ برطانوی سامراج کے پیروں تلے بری طرح روندا جارہا تھا۔ اس کے فکر و خیال پر پہرے تھے سات سمندر پار سے آئے ہوئے ''آقاؤں'' کے پیدا کردہ ایک جاگیردارانہ نظام نے ساری عوامی زندگی کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ سارا نظام زندگی غلط اصولوں پر قائم تھا۔ دولت کی تقسیم ناہموار تھی، جس نے سماجی زندگی میں زبردست تضاد پیدا کر دیا تھا۔ شاہت اور جاگیرداری کے بھوت نوچ کھسوٹ پر تلے ہوئے تھے۔ سیاست میں یہاں کے عوام کو کوئی دخل نہیں تھا۔ وہ صرف متوسط طبقے تک محدود تھی اور اس متوسط طبقے کے افراد انگریزوں کے زیر سایہ اپنے لیے صرف حقوق چاہتے تھے۔ انہیں عوام کے بنیادی مسائل سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس صورتِ حال نے عوام کو بالکل ہی پس منظر میں ڈال دیا تھا۔ چنانچہ متوسط طبقے کے افراد صرف اپنے مفاد کے پیش نظر زیادہ سے زیادہ ہوم رول یا ڈومینین اسٹیٹس کا خواب دیکھتے تھے، انہیں اس کی فکر نہیں تھی کہ ہندوستان تباہ ہورہا ہے، یہاں کے عوام پریشان حال ہیں۔ دولت کی ناہموار تقسیم نے اور سماجی زندگی کی غلط نظام اقدار نے ان کی زندگی موت سے بدتر بنادی ہے۔ وہ صرف اپنے خیال میں مگن تھے، لیکن ان حالات نے نوجوانوں کا ایک ایسا طبقہ بھی پیدا کر دیا تھا جس کی نظر زندگی کے بنیادی مسائل پر پہنچتی تھی۔ وہ انگریزی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سامراج کو اچھا نہیں سمجھتا تھا، اس کے پیش نظر دولت کی تقسیم صحیح اُصول پر ہونی ضروری تھی۔ عوام کو بلند کرنے کے خیالات اس کے پیش نظر تھے۔ اس طبقے کا تعلق بائیں بازو۔۔۔Laftist Group سے تھا اور ۳۵ء تک آتے آتے اس طبقے نے ملک کی سیاست ہی کچھ نہ کچھ اثر ضرور پیدا کر لیا تھا۔ ہر چند قدامت پرست سیاسی رہنما اس وقت بھی اس طبقے کو پس منظر میں ڈالے ہوئے تھے اور ان کا بس نہیں چلتا تھا۔۔۔ لیکن سیاست کے اس رجعت پسندانہ رجحان کے باوجود اس سے بہت پہلے ادب میں ہندوستان کی حالت کے صحیح خدوخال کو بے نقاب کیا جا رہا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے قریب اگرچہ چکبست ''ہوم رول'' کے گیت گا کر متوسط طبقے کی ترجمانی کر رہے تھے لیکن اقبال کے پیش نظر اس وقت زندگی کے بنیادی مسائل تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے مزدور کی حکومت کا ایک خواب دیکھا تھا اور اپنی نظم ''خضرِ راہ'' میں زندگی کے ان مسائل پر روشنی ڈالنے کے بعد خضر کی زبانی بندۂ مزدور کو بیدار ہونے کا ایک پیام دیا تھا۔ اس کو خوابِ غفلت سے جھنجھوڑ کر بیدار کرنے کی کوشش کی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے خیالات انقلاب انگیز اور ترقی پسندانہ تھے۔ سیاست میں جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس نے بہت بعد میں جا کر کانگریس کے اندر ان خیالات کو پیش کیا اور اس مرکز پہ ملک کی سیاست کو لانے کی کوشش کی۔ بہر حال ۳۶ء تک آتے آتے یہ خیالات ادب اور سیاست دونوں میں خاصے عام ہو گئے تھے۔ البتہ انہوں نے کسی منظّم تحریک کی صورت نہیں اختیار کی تھی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے رہنمائی کی ادب کی ترقی پسند تحریک نے!

ادب کی یہ ترقی پسند تحریک جس وقت شروع ہوئی اس وقت ہماری ساری سماجی زندگی میں ایک انتشار تھا۔ زندگی کے کسی شعبے میں بھی کوئی خاص تنظیم نہیں تھی۔ ایسی تنظیم جو زندگی کے بنیادی اصولوں کو سامنے رکھ کر کی گئی ہو۔ سیاست میں تنظیم کو سب سے زیادہ دخل تھا۔ لیکن وہ صرف آزادی حاصل کرنے اور انگریزوں کو دیس سے نکال باہر کر دینے کے خیالات تک محدود تھی۔ اس کے بعد کیا ہو گا؟۔۔۔ اس پر بہت کم رہنماؤں نے غور کیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

تھا۔اس لیے ظاہر ہے یہ تنظیم بھی ناقص تھی ۔۔۔جذبات کو خیر باد کہہ کر اجتماعی زندگی کو بلند کرنے والے بنیادی اصول ایک واضح صورت میں ہمارے رہنماؤں کے سامنے ہونے چاہیے تھے۔کانگریس ہی کے اندر بیچارے چند نوجوانوں کو اس کی فکر ضرور تھی لیکن بزرگوں کے سامنے ان کا بس نہیں چلتا تھا۔کمیونسٹ پارٹی اور سوشلسٹ پارٹی کی تنظیم ہو چکی تھی۔لیکن وہ دونوں سیاست کے اس عام رجحان سے اپنے آپ کو علیحدہ نہیں کر سکتی تھیں۔جو ان دنوں زندگی میں عام تھا۔البتہ ہر ایک کو ان کے خیالات ونظریات بہت سہانے معلوم ہوتے تھے۔چنانچہ افراد کو ان سے جذباتی ہمدردی بھی تھی۔بہر حال سیاسی زندگی میں اس وقت تنظیم ہونے کے باوجود تنظیم نہیں تھی بلکہ ایک انتشار تھا۔ایک افراتفری تھی اور سیاست کے ساتھ ساتھ ادب کا بھی کچھ یہی حال تھا۔ہر باشعور ادیب زندگی کی اسی افراتفری اور انتشار کی ترجمانی کر رہا تھا ان میں ہر ایک کے تخیل کی جولا نگاہ محدود تھی۔وہ سب کے سب اپنے وقت اور ماحول کے اسیر تھے۔بہت کم کو اس سے باہر نکل کر سوچنا آتا تھا۔بنیادی خیالات کے کسی مرکز پر ان میں سے کسی نے بھی اپنی تنظیم نہیں کی تھی۔انجمنیں ضرور موجود تھیں، نیا ادب، گلزارِ ادب، اصلاح سخن کچھ اسی طرح کے نام ادبی انجمنوں کے ہوتے تھے اور ان کا کام شاعروں کو طبع آزمائی کے لیے مصرع طرح دے کر مشاعروں کے اکھاڑے جمانہ تھا چنانچہ مشاعروں کے اکھاڑے جمتے تھے محفلیں منعقد ہوتی تھیں، لیکن انکا مقصد صرف لفظی بازی گری کا مظاہرہ ہوتا تھا۔آپس میں لایعنی باتوں پر بحث کرنی ہوتی تھی۔باشعور ادیب چاہتے تھے کہ ادیبوں کی کوئی باقاعدہ تنظیم ہو اقبالؔ، جوشؔ، پریم چندؔ، عبدالحقؔ، سلیمانؔ ندوی غرض یہ کہ اس طرح کے تمام سماجی شعور رکھنے والے ادیبوں کی خواہش تھی کہ ادیب منظّم ہوں۔ان ادیبوں کا ذکر نہیں جن کے یہاں کوئی سماجی شعور سرے سے تھا ہی نہیں، جو ادب برائے ادب اور فن برائے فن کے قائل تھے جن کی ذہنیت جاگیردارانہ تھی اور جس نے ان کو عینیت پسند اور تصور پرست بنا دیا تھا۔بہر حال ایسے ادیبوں کو چھوڑ کر باقی ہر ادیب کے دل میں ادیبوں اور ادب کی تنظیم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی ایک دبی ہوئی خواہش ضرور موجود تھی۔ چنانچہ جب نوجوان ادیبوں نے اس سلسلے میں اقدام کیا تو ایسے تمام ادیبوں نے اس کو لبیک کہا اور اکثر نے اس تحریک سے نا صرف ہمدردی ظاہر کی بلکہ اس میں شریک بھی ہوئے۔

ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس ۱۹۳۵ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے ماتحت لکھنو میں منعقد ہوئی اور اس میں نوجوان ادیبوں کے ساتھ ساتھ وہ پرانے ادیب بھی شامل ہوئے جو اس کی ضرورت اور اہمیت کو محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ منشی پریم چند نے اس کانفرنس کی صدارت کی تھی۔ مولوی عبدالحق بھی اس میں شریک ہوئے تھے اور انہوں نے بھی ایک خطبہ پڑھا تھا۔ رابندر ناتھ ٹیگور، سروجنی نائیڈو اور پنڈت جواہر لال کی ایسی شخصیتوں نے اس انجمن اور اس کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی کانفرنس کی ہمت افزائی کی تھی اور مبارکباد کے پیغام بھیجے تھے اور نوان لکھنے والوں میں تو سب ہی کی ہمدردیاں اس کے ساتھ تھیں، اسی وجہ سے یہ تحریک بہت مقبول ہوئی۔

اس تحریک کا جو اعلان نامہ شائع ہوا، اس میں اس بات پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا گیا کہ

> ''ہندوستانی مصنفوں کا فرض ہے کہ ملک میں جو نئے ترقی پذیر رجحانات اُبھر رہے ہیں ان کی ترجمانی کریں اور ان کی نشو ونما میں پورا حصہ لیں۔''

اور حقیقتاً اس تحریک اور اس کے علم برداروں نے یہی کیا کہ ملک کے تمام ترقی پسند اور ترقی پذیر رجحانات کو ایک مرکز پر جمع کرنے کی کوشش کی اور اس میں انہیں خاصی کامیابی بھی ہوئی۔ انجمن کے اعلان ناموں میں ایک بات یہ بھی تھی کہ

> ''ادبیات اور فنون لطیفہ کو قدامت پرستوں کی مہلک گرفت سے نجات دلائے اور ان کو عوام کے دکھ سکھ اور جدو جہد کا ترجمان بنا کر اس روشن مستقبل کی راہ دکھائے جس کے لیے انسانیت اس دور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں کوشاں ہے۔"

چنانچہ ان ادیبوں میں سے ہر ایک اس مقصد کے لیے بھی کوشاں رہا اور آج بھی کوشاں ہے۔ اعلان نامے میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ

"ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے یہ بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔"

اور اس میں شک نہیں کہ ہر ترقی پسند ادیب نے ان موضوعات کی طرف خاص طور پر توجہ کی۔ ظاہر ہے یہ تمام باتیں جن پر اعلان نامے میں زور دیا گیا ہے زندگی کے بنیادی مسائل سے تعلق رکھتی ہیں اور انہی راہوں پر چل کر سماجی زندگی ترقی اور ارتقاء کی منزلوں سے ہمکنار ہو سکتی ہے۔

جو ادیب اس کانفرنس میں شریک ہوئے ان میں بوڑھے بھی تھے جوان بھی، قدمت پسند بھی تھے، نئی روشنی کے دلدادہ بھی! روایت پرست بھی تھے اور باغی بھی! مذہبی بھی تھے اور ملحد و بے دین بھی۔۔۔ غرض یہ کہ اجلاس میں شریک ہونے والوں یا انجمن کے بہی خواہوں میں کوئی کسی قسم کی تخصیص نہیں تھی۔ صرف اس کے لیے انسانیت پرست اور ہندوستان دوست ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ ان مختلف الخیال اور مختلف العقائد لوگوں نے نہ صرف انجمن میں شرکت کی بلکہ اس کو اپنا سمجھا۔ پریم چند جی اگر مہاتما گاندھی اور ان کے اصولوں کے پرستار تھے اور انہوں نے اپنی تمام تخلیقات کو ان کے پیام کے لیے وقف کر دیا تھا، لیکن انہوں نے بھی فخر کے ساتھ اپنے صدارتی خطبے میں انسانیت کی کشمکش میں ترقی پسندی کا ذکر کرتے ہوئے صاف صاف کہا کہ

"ہماری انجمن نے کچھ اسی طرح کے اصولوں کے ساتھ میدانِ عمل میں قدم رکھا ہے۔ وہ ادب کو خمریات اور شبابیات کا دستِ نگر نہیں دیکھنا چاہتا۔ وہ ادب کو سعی اور عمل کا پیغام اور ترانہ بنانے کا مدعی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے، اسے زبان سے بحث نہیں۔ آئیڈیل کی وسعت کے ساتھ زبان خود بخود سلیس ہو جاتی ہے۔ حسنِ معنی آرائش سے بے نیاز رہ سکتا ہے۔ جو ادیب امراء کا ہے وہ امراء کا طرز بیان اختیار کرتا ہے جو عوام الناس کا ہے وہ عوام الناس کی زبان لکھتا ہے۔ ہمارا مدعا ملک میں ایسی فضا پیدا کرنا ہے جس میں مطلوبہ ادب پیدا ہو سکے اور نشو ونما پا سکے ہم چاہتے ہیں کہ ادب کے مرکزوں میں ہماری انجمنیں قائم ہوں اور وہاں ادب کے تعمیری رجحانات پر باقاعدہ چرچے ہوں مضامین پڑھے جائیں، مباحثے ہوں تنقیدیں ہوں جبھی وہ فضاء تیار ہوگی جبھی ادب کی نشاۃ الثانیہ کا ظہور ہوگا۔ ہم ہر ایک صوبے میں ہر ایک زبان میں ایسی انجمنیں کھولنا چاہتے ہیں تاکہ اپنا پیغام ہر ایک زبان میں پہنچائیں۔ یہ سمجھنا غلطی ہوگی کہ ہماری یہ ایجاد ہے ملک میں اجتماعی جذبات ادیبوں کے دلوں میں موجزن ہیں ہندوستان کی ہر ایک زبان میں اس خیال کی تخم ریزی فطرت نے اور حالات و روزگار نے پہلے ہی سے کر رکھی ہے۔ جا بجا اس کے آنکھوے بھی نکلنے لگے ہیں۔ اس کی آبیاری کرنا اس کے آئیڈیل کو تقویت پہنچانا ہمارا مدعا ہے۔ ہم ادیبوں میں قوتِ عمل کا فقدان ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے مگر ہم اس کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے ابھی تک ہم نے ادب کا جو معیار اپنے سامنے رکھا تھا، اس کے لیے عمل کی ضرورت نہ تھی۔ فقدان عمل ہی اس کا جوہر تھا کیونکہ بسا اوقات عمل اپنے ساتھ تنگ نظری اور تعصب بھی لاتا ہے۔ اگر کوئی شخص پارسا ہو کر اپنی پارسائی پر غرہ کرے، اس سے کہیں اچھا ہے کہ وہ پارسا نہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہو بلکہ رند ہو رند کی شفاعت کی تو گنجائش ہے۔ پارسائی کے غرور کی تو کہیں شفاعت نہیں۔ بہر حال جب تک ادب کا کام تفریح کا سامان پیدا کرنا محض لوریاں گا کر سلانا، محض آنسو بہا کر غم غلط کرنا تھا۔ اس وقت تک ادیب کے لیے عمل کی ضرورت نہ تھی۔ وہ دیوانہ تھا جس کا غم دوسرے کھاتے تھے۔ مگر ہم ادب کو محض تفریح اور تعیش کی چیز نہیں سمجھتے۔ ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اُترے گا جس میں تفکر ہو آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت اور ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے سلائے نہیں کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔''

اس طویل اقتباس کو نقل کرنے کی ضرورت صرف اس وجہ سے محسوس کی گئی کہ ایک حقیقت واضح ہو جائے اور اس کی وجہ سے بعض بے بنیاد غلط فہمیا دور ہوں، پریم چند اشتراکی نہیں تھے، انہوں نے ان خیالات میں اشتراکیت کے پرچار کو پیش نظر نہیں رکھا ہے۔ وہ انجمن کے پہلے غیر اشتراکی صدر تھے اور انہوں نے صرف ان چند باتوں کو پیش کیا ہے جس کے بغیر ترقی پسندی کی عمارت کھڑی نہیں ہو سکتی۔ پریم چند جی کے ساتھ ساتھ پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی انجمن ترقی پسند مصنفین کا خیر مقدم کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔

''ابھی تک ایسے ادیب کم پیدا ہوئے ہیں جو ملک کو زیادہ آگے لے جا سکیں اسی لیے انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کرتا ہے اور اس سے ہماری بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہیں''۔۔۔

غرض یہ کہ اس طرح نہ جانے کتنے رہنماؤں، سیاستدانوں، ادیبوں اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فنکاروں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی تحریک کو سراہا تھا۔

ترقی پسند تحریک نے وجود میں آ کر ایک نئی صورتِ حال کو پیدا کی۔ جس طرح ٹھہرے ہوئے پانی میں ایک بڑا پتھر گر کر کھلبلی سی مچا دیتا ہے۔ اسی طرح ہماری ٹھہری ہوئی سماجی زندگی میں اس نے بھی ایک ہنگامہ پیدا کر دیا۔ جاگیردارانہ دور کی یادگار ابھی کچھ ایسے لوگ باقی تھے جن کے ایمان کی بنیادیں عنیت پسندی اور تصور پرستی پر استوار تھیں۔ وہ ادب میں اتنی زبردست تبدیلی کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان کے خیال میں سوائے تفریحِ طبع کے ادب کا اور کوئی مقصد نہیں ہونا چاہیے تھا۔ چنانچہ ادب کے متعلق ترقی پسندوں کے بنیادی خیالات و نظریات نے انہیں آتش زیر پا کر دیا۔ وہ چیخنے لگے، چلانے لگے رونے لگے آنسو بہانے لگے، یہاں تک کہ انہوں نے ساری دنیا کو سر پر اٹھا لیا۔ انہوں نے ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند ادیبوں کی مخالفت کی، انہوں نے کہا کہ یہ لوگ ملحد ہیں، لامذہب ہیں، انہیں اخلاق سے کوئی سروکار نہیں۔ زندگی کی اعلیٰ قدروں کا یہ کوئی پاس لحاظ نہیں رکھتے یہ زندگی کے ہر شعبے میں نراج چاہتے ہیں۔ ادب کبھی مقصدی ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کو افادیت سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ تو محض ایک دل خوش کرنے کی چیز ہے۔ اس سے تو ایک روحانی سرور حاصل کیا جا سکتا ہے، اور بس! ۔۔۔ وہ بھلا کہاں زندگی کے اجتماعی مسائل سے اپنے دامن کو آلودہ کرتا پھرے گا۔ وہ تو شرفاء کی چیز ہے۔ اس کو تو راج محلوں میں بسیرا لینا چاہیے غرض یہ کہ کچھ اسی طرح کی باتیں ایک خاص طبقے کے افراد نے ترقی پسندوں کے خلاف کہنی شروع کیں۔ لیکن یہ کوئی عجیب باتیں نہیں تھیں۔ اس طبقے کے افراد اس کے سوا اور کہہ ہی کیا سکتے تھے۔ یہ باتیں خود ان کے قلم اور زبان سے نہیں نکل رہی تھیں بلکہ وہ طبقہ وہ ماحول ان کے قلم سے یہ باتیں نکلوا رہا تھا جس کی آغوش میں انہوں نے آنکھ کھولی اور پرورش پائی تھی ۔۔۔ انہیں یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ ترقی پسندوں کے بنیادی خیالات و نظریات سے ان کے تصورات کو ٹھیس لگ رہی ہے اور وہ چکنا چور ہوئے جا رہے ہیں۔ اس کشمکش کو رونما ہونا ہی چاہیے تھا کیونکہ یہ دو طبقات کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کشمکش تھی۔ چنانچہ اس نے زور پکڑا۔ یہاں تک کہ ایک اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

افسوس اس بات کا نہیں کہ اس قسم کی ہنگامہ آرائیاں کیوں ہوئیں بلکہ افسوس اس بات کا ہے اس طبقہ کے افراد نے ترقی پسندوں پر بعض ایسے بے بنیاد اور غلط الزامات لگائے جن کا کوئی سر پیر نہیں تھا جن میں کوئی صداقت نہیں تھی جن کی بنیادیں کسی اصلیت پر استوار نہیں تھیں۔۔۔ مثال کے طور پر سب سے پہلا حربہ جو انہوں نے تحریک کے خلاف استعمال کیا وہ یہ تھا کہ ترقی پسند تحریک کو چلانے والے تمام ادیب کمیونسٹ ہیں۔ اشتراکی ہیں۔ یہ سارے نظام کو توڑ پھوڑ کر رکھ دینا چاہتے ہیں۔ ان کا مقصد صرف تخریب ہے۔ یہ سماج میں نراج پیدا کرنے کے خواہشمند ہیں چنانچہ آج تک یہ الزام ترقی پسند ادیبوں پر لگایا جا رہا ہے بلکہ آج تو اس معاملے میں کچھ اور بھی زیادہ شدت پیدا ہو گئی ہے اور نہ صرف ترقی پسند ادیبوں سے نظریاتی اختلاف رکھنے والے ادیبوں ہی نے اس کا ڈھنڈورہ پیٹا ہے بلکہ حکومتوں کے محکمہ سراغ رسانی کے افسر بھی ''شہر کے اس اندیشے'' سے [illegible] ہوئے جا رہے ہیں۔ بیچاروں کی راتوں کی نیندیں حرام ہو گئی ہیں۔

''گندم نما جو فروش'' رہنماؤں نے بھی اس پر یقین کر لیا ہے انہیں اتنی فرصت کہاں ہے کہ حالات کی تہ تک پہنچ کر حقیقت کا پتہ لگائیں۔ وہ ایک نشے میں سرشار ہیں، ان کی نظروں میں دنیا رنگین ہے لیکن سامنے انہیں کچھ بھوت بھی ناچتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ جن کو بڑی حد تک ان کے دلوں کے چور نے پیدا کیا ہے۔ جن کی تخلیق کی ہے ان کے مسخ شدہ ذہنوں نے جن میں وسوسے ہیں، خوف ہے، ڈر ہے، اور جو دلالت کرتے ہیں ان کے کردار کی کمزوری پر!

لیکن یہ حقیقت نہیں ہے۔ ترقی پسند تحریک میں نہ صرف کمیونسٹ شامل ہیں اور نہ صرف غیر کمیونسٹوں کے شامل ہونے پر اس میں کوئی پابندی ہے۔ اگر یہ حقیقت ہوتی تو پریم چند جی انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کی صدارات نہ کرتے، پنڈت جواہر لال نہرو اس سے بہت سی امیدیں نہ لگاتے اور ڈاکٹر عبدالحق کے ایسے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بزرگوں کو اس سے ہمدردی نہ ہوتی۔ قاضی عبدالغفار اور خواجہ احمد عباس کٹر قسم کے قوم پرست ہوتے ہوئے بھی اس میں شامل نہ ہوتے اور مرحوم سروجنی نائیڈو یوپی کے گورنمنٹ ہاؤس میں آئے دن ترقی پسند ادیبوں کے جلسے منعقد نہ کیا کرتیں۔

انجمن ترقی پسند مصنفین میں شامل ہونے کے لیے کبھی بھی کمیونسٹ ہونے کی ضرورت نہیں تھی، آج بھی نہیں ہے، آئندہ بھی نہیں ہوگی۔ اس میں ہر سیاسی خیال کے لوگ شریک ہوسکتے ہیں۔ البتہ اس میں شریک ہونے کے لیے چند بنیادی باتوں پر ان کا متفق ہونا ضروری ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ انسانیت کی قدروں کو آگے بڑھانے میں مدد کریں گے۔ جبر و استبداد کی مخالفت ان کا فرض ہوگا سرمایہ دارانہ نظام نے سماجی زندگی میں جو افراتفری مچا رکھی ہے جو ہنگامہ برپا کر رکھا ہے اس کو فنا کرنا ان کے نزدیک ازبس ضروری ہے آزادی تحریر وتقریر ان کے نزدیک انسان کا بنیادی حق ہے اگر ایسا نہ ہو تو اس کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے۔ اگر حکومت اپنے آپ کو برقرار رکھنے کے لیے ادب وتہذیب کلچر و سماج کی چھاتی پر مونگ دلتی ہے تو انکا فرض ہے کہ وہ ایسی حکومت کی مخالفت کریں۔ دنیا میں جو سرمایہ دارانہ نظام قوتیں اپنے جال پھیلا کر عوامی اور انسان دوست طاقتوں کو اس میں اسیر کرنا چاہتی ہیں ان کے خلاف آواز اٹھانی ترقی پسند ادیبوں کے نزدیک لازمی ہے۔ وہ اپنے ملک میں سرمایہ داری اور جاگیرداری کے مظاہرے نہیں چاہتے۔ وہ صحیح معنوں میں عوام کی حکومت کے خواہاں ہیں۔ عوام کی زندگی کو بلند کرنا اس کے پیش نظر ہے۔ ان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ کاٹ پیچ کی باتوں کو پوری طرح سمجھ سکیں۔ حالات کا صحیح جائزہ لے سکیں اور عوام کے نقطۂ نظر کی ترجمانی، ان کے حق کا حصہ بن سکے۔ اگر ان بنیادی باتوں سے کوئی ادیب اتفاق رکھتا ہے، تو وہ ترقی پسند ہے، وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا ممبر ہوسکتا ہے۔ اس کے لیے کسی سیاسی جماعت سے وابستہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ فروعی باتوں میں اختلافات کے باوجود مختلف ادیب انجمن ترقی پسند مصنفین میں شامل ہوسکتے ہیں، لیکن ان بنیادی باتوں پر ان سب کا متفق ہونا ضروری ہے جن کا بیان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اوپر کیا جا چکا ہے۔

خیر تو اس بے بنیاد مخالفت کا سلسلہ شروع ہوا اور جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے اس میں پیش پیش تھے وہ لوگ جو ایک مخصوص ماحول کی پیداوار ہونے کے باعث ایک مخصوص ماحول کی پیداوار ہونے کے باعث ایک مخصوص زاویہ نظر سے ہر چیز کو دیکھتے تھے آگے چل کر یہ مخالفت دوسرے لوگوں کے ہاتھوں بھی ہوئی اور اس نے مختلف روپ بھی اختیار کیے۔ لیکن انجمن کے قیام کے ابتدائی زمانے میں جو مخالفت ہوئی اس میں جاگیر دارانہ نظام کے زیر سایہ پرورش پائے ہوئے قدامت پرست ہی پیش پیش رہے۔ اس مخالفت کی سب سے بڑی وجہ تو زندگی اور ادب کے بارے میں بنیادی نظریات کا اختلاف تھا لیکن اس کے ساتھ ہی اس مخالفت کی تہ میں ذاتی مفاد کا مسئلہ بھی تھا۔ قدامت پرست اور رجعت پسند یہ جانتے تھے کہ ترقی پسندی کے اس طوفان، اس آندھی اور اس سیلاب کے سامنے ان کی بنیادوں کا ہل جانا یقینی ہے۔ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ ترقی پسندوں کی ذہانت اور فطانت کے سامنے ان کا بازار سرد ہو جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے اس تحریک کی مخالفت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور اس سلسلے میں طرح طرح کے حربے استعمال کیے۔ لیکن ان کی ایک بھی پیش نہ گئی۔ ترقی پسندوں کی مقبولیت روز بروز بڑھتی گئی۔

ذاتی مفاد کے خیال سے جو مخالفت کی گئی اور اس سلسلے میں جو بے بنیاد الزامات لگائے گئے وہ تو خیر درخورِ اعتنا نہ کبھی تھے نہ اب ہیں ان کی وضاحت اسی وقت کر دی گئی تھی اور باشعور حضرات کو اصل حالات کا علم بھی ہو گیا تھا، لیکن چونکہ بنیادی نظریات کے اختلافات میں کچھ جان تھی۔ اس لیے کہ ترقی پسندوں نے اسطرف سنجیدگی کے ساتھ توجہ کی۔ کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ ایک غلط نظام نے ادب اور فن کے بارے میں جو غلط باتیں پھیلا دی ہیں اور عوام کے ذہنوں کو چند مفروضہ بتوں کا پرستار بنا دیا ہے، ان سب کی حقیقت کو واضح کر دیا جائے تا کہ عوام کو اصل صورت حال کا علم ہو اور وہ خود اپنے لیے کوئی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

راستہ بنا سکیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں بڑی ہی گرما گرم بحثیں ہوئیں۔ کئی سال تک اس کا سلسلہ جاری رہا۔ اگر چہ اب ان مباحث میں وہ شدت تو باقی نہیں رہی پھر بھی کبھی کبھی اس قسم کے مباحث نظر ضرور آ جاتے ہیں۔

نظریاتی اختلافات کی یہ بحث ان موضوعات سے متعلق ہے کہ ادب کیا ہے؟ کس لیے ہے؟ کس کے لیے ہے؟ وہ اب تک کیا رہا ہے؟ اور اسکا کیا ہونا چاہیے۔ رجعت پرست اور قدامت پسندوں کے نظریات اس سلسلے میں عینیت پرستانہ ہیں۔ انہیں حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ ادب کا کوئی مقصد نہیں۔ وہ صرف تفریح طبع کی چیز ہے۔ اسی کے لیے وہ تخلیق کیا جاتا ہے، افادیت سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ سیاسی اور سماجی مسائل کو ادب کے دامن میں جگہ دینا اس کا خون کرنا ہے۔ ظاہر ہے ترقی پسندوں کو ان خیالات و نظریات سے اختلاف تھا۔ انہیں خیالات کو فنا کرنے کے لیے تو انہوں نے اپنی تنظیم کی تھی۔ کیونکہ ان خیالات نے ادب کو ایک زمانے تک ترقی اور ارتقاء سے محروم رکھا تھا۔ عوام اس کے وجود، اس کی اہمیت اور اس کی ضرورت سے واقف ہی نہیں تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ محدود ہو کر ایک مخصوص طبقے کی ملکیت اور جاگیر بن گیا۔ چنانچہ زندگی کی جولانیاں اس سے مفقود ہو گئیں۔ عینیت پسند چاہتے تھے کہ وہ اسی ڈگر پر چلتا رہے۔ لیکن حقیقت پسندوں نے اس صورت حال کو جلد از جلد ختم کرنا چاہا۔۔۔ کیونکہ ان کے خیال میں یہ صورت حال سماجی زندگی کے لیے انتہائی مضر تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تحریک کی بنیاد ہی ان خیالات پر رکھی تھی کہ ادب مقصدی ہوتا ہے۔ انسانی زندگی اس کا موضوع ہے۔ وہ نہ صرف انسانی زندگی کا ترجمان اور عکاس ہے بلکہ نقاد بھی ہے۔ وہ زندگی کے انفرادی مسائل ہی کی طرف توجہ نہیں کرتا بلکہ اجتماعی زندگی سے متعلق ہو کر طبقاتی کشمکش میں بھی حصہ لیتا ہے۔ عوام اس سے براہ راست مخاطب ہوتے ہیں۔ وہ ان سے کچھ کہتا بھی ہے، پیام بھی دیتا ہے۔ غرض یہ کہ ترقی پسندوں کے خیال میں اس کو بعض مخصوص نظریات کا پروپیگنڈا بھی کرنا چاہیے لیکن اس سلسلے میں ادب کی فنی اہمیت کو کوئی ترقی پسند

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھی نظر انداز کرنے کے لیے تیار نہیں۔ان میں سے ہر ایک کے نزدیک ادب کو پہلے ادب ہونا چاہیے ورنہ اس میں تاثر کا وہ جادو پیدا نہیں ہوسکتا جو اس کی اصل خصوصیت ہے اور جس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔

ترقی پسندوں کے ان خیالات ونظریات کی بنیادیں حقیقت پر استوار تھیں، لیکن ان نظریات کی بڑھتی ہوئی مخالفت اور تحریک کے خلاف بے بنیاد الزام تراشی نے بعض ترقی پسندوں کو انتہا پسند بھی بنا دیا۔چنانچہ انجمن کے قیام کے ابتدائی زمانے میں بعض جذباتی قسم کے ترقی پسند ادیب اس طرح کے خیالات کے اظہار کرنے سے بھی باز نہیں رہے کہ ادب میں پروپیگنڈا ہی بہت کچھ ہے۔فنی حیثیت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔حالانکہ انجمن کا اعلان نامہ اور رجحان اس خیال سے متفق نہیں تھا۔نتیجہ یہ ہوا کہ اس خیال پر ترقی پسندوں میں آپس ہی میں خاصی بحث رہی چنانچہ احمد علی کے ایسے ادیب جو ترقی پسندی کے علم برداروں میں سے تھے اس خیال کے اظہار پر مجبور ہوئے کہ ادب کی فنی حقیقت مقدم ہے۔ اس لیے وہ بذات خود ادب میں نعرہ بازی کرنے کے لیے تیار نہیں اور ان کا یہ خیال ٹھیک تھا۔اگر نعرہ بازی ہی کرنی ہے تو اس کے لیے سیاست کا پورا میدان موجود ہے۔بیچارہ ادب ان ہنگامہ آرائیوں کی جولانگاہ کیوں بنے؟ کچھ عرصے کے بعد اصل حقیقت کو انتہا پسند محسوس کرنے لگے اور ان کے خیالات ونظریات راہ راست پر ہو لیے۔اب بھی اگر اس خیال پر ایمان رکھنے والے ادیب موجود ہیں تو ان کی کوئی خاص اہمیت باقی نہیں۔

اس انتہا پسندی نے ادب کے اس نظریاتی پہلو ہی تک اپنے آپ کو محدود نہیں رکھا بلکہ اس نے بعض معاملات میں جذباتیت سے اپنی سرحدیں ملا دیں۔مثال کے طور پر انجمن کے قیام کے وقت بعضوں نے اس خیال کا بھی اظہار کیا کہ قدیم کلاسیکی اور ادبی روایات ترقی پسندوں کے کسی کام کی نہیں۔انہیں دریابُرد کر دینا چاہیے۔کلاسیکی ادب چونکہ جاگیردارانہ دور کی پیداوار ہے اور اس میں اسی تہذیب کے اثرات موجود ہیں اس لیے اس کا نذر آتش کر دینا ہی بہتر ہے۔اس قسم کے خیالات کا اظہار ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے ان دنوں کیا تھا۔حالانکہ یہ بات اس اعلان نامے کے بالکل خلاف تھی جو انجمن ترقی پسند مصنفین نے شائع کیا تھا۔اس میں یہ بات صاف صاف کہی گئی تھی کہ۔ ''ہم ہندوستانی تمدن کی اعلیٰ ترین روایتوں کے وارث ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں''۔۔۔یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے کلاسیکی ادب میں جاگیردارانہ دور کی بہت سی خامیاں موجود ہیں لیکن وہ سرے سے ہی نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں۔اس نے ہماری تاریخ اور تہذیب کی پرخلوص ترجمانی کی ہے۔اسی سلسلے میں ڈاکٹر اختر حسین قدیم شاعروں پر بھی برسے تھے،انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا تھا۔ ''تمام ہندوستانی شعراء زندگی سے کتنے بے خبر اور بے پروا تھے۔ان کے جذبات کتنے اوچھے اور بے حقیقت تھے۔اس کا اندازہ لگانے کے لیے چشمِ عبرت کی ضرورت ہے۔پلاسی کی لڑائی کتنا بڑا قومی سانحہ تھا۔پانی پت کی تیسری لڑائی ہندوؤں کے لیے پیام موت تھی۔ٹیپو سلطان کی شکست مسلمانوں اور ہندوستانیوں کے تنزل کا اعلان تھا اور ان سب سے اہم ۵۷ء کا سانحہ تو ہندوستانی سماج کی بربادی کا پیش خیمہ تھا۔کتنے شاعروں نے ان خونچکاں واقعات کو نظم کیا ہے کتنے نوحے لکھے گئے۔کہاں تھے وہ رجز گو،مرثیہ خواں،جنکی جادو بیانی سے محرم کی ہر مجلس ماتم کدہ بن جاتی تھی۔کسی بڑے شاعر نے پلاسی کی لڑائی پر ایک نوحہ نہ لکھا۔واقعہ ۵۷ء پر داغ کا شہر آشوب اور غالب کے خطوط پڑھئے اور سر پیٹ لیجئے کہ پورے ملک کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا،یہ حضرات اپنی روٹیو کے سوا اور کچھ نہ سوچ سکتے تھے اور سوچتے تھے تو ایسے بزدلانہ اور رجعت پسندانہ طریقوں سے جو زندگی اور شاعری کے لیے باعث ننگ ہیں''۔۔۔یہ جذباتیت کی انتہا تھی۔قدیم شاعروں کے متعلق یہ کہنا کہ انہوں نے زندگی کی ترجمانی نہیں کی ہے غلط ہے۔اپنے شعور کے مطابق اپنے نقطۂ نظر کے مطابق انہوں نے ترجمانی کی ہے۔وہ زندگی کو انفرادیت کے زاویہ نظر سے دیکھتے تھے۔اجتماعیت کا کوئی شعور ان کے اندر نہیں تھا۔سیاست چند مخصوص افراد کا حصہ تھی،اس لیے وہ بیچارے ان حالات کی ترجمانی کیسے کرتے؟ان کی نظر محدود تھی ان کی پرواز فکر محدود تھی۔غرض یہ کہ وہ آج کے ادیب کی طرح

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اجتماعیت کا شعور نہیں رکھتے تھے۔ یہ شعور تو اس وقت خود زندگی میں نہیں تھا۔ بیچارے شاعروں کے یہاں کیسے پیدا ہوتا؟ لیکن اس قسم کی جذباتیت زیادہ دنوں چل نہیں سکتی تھی۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں اس کے بادل چھٹ گئے اور ترقی پسندی نکھر کر اپنے اصل رنگ روپ کے ساتھ جلوہ گر ہوئی کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔

جذباتیت اور انتہا پسندی نے ترقی پسند تحریک کو خاصا نقصان پہنچایا۔ اس نے تحریک کو بدنام کیا۔ ترقی پسندوں کے متعلق غلط فہمیاں پھیلائیں اور اسی طرح مخالفت بڑھی اگرچہ اب بڑی حد تک یہ جذباتیت اور انتہا پسندی ختم ہوگئی ہے لیکن آج بھی اس کے اثرات کسی نہ کسی صورت میں نظر ضرور آتے ہیں۔

ایک واقعے سے اسکا اندازہ ہوگا۔ گذشتہ اپریل میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی صوبائی کانفرنس لکھنو میں منعقد ہوئی۔ میں اس کانفرنس میں شریک نہ ہوسکا کیونکہ میں دہلی میں تھا اور وہاں یونیورسٹی میں امتحانات کے سلسلے میں مصروفیت بہت زیادہ تھی۔ کانفرنس کے بعد جب میں اس مصروفیت سے فراغت حاصل کر کے لکھنو پہنچا تو احباب سے کانفرنس کی روداد معلوم ہوئی۔ ان کی زبانی یہ سن کر خوشی ہوئی کہ کانفرنس کامیاب ہوئی، لیکن ان ادیبوں میں جو ترقی پسند تحریک سے تعلق نہیں رکھتے تھے ایک ہنگامہ دیکھا ان میں جس سے بھی ملاقات ہوئی اس کو یہی کہتے ہوئے پایا کہ صاحب انجمن ترقی پسند مصنفین بالآخر بے نقاب ہوگئی۔۔۔ صاف صاف اس بات کا اظہار کردیا گیا کہ ترقی پسند ادیب اشتراکی ہیں اور اشتراکیوں کے علاوہ کوئی دوسرا ادیب ان کی انجمن میں شریک نہیں ہوسکتا۔ میں نے کہا یہ کیسے؟ جواب ملا۔

> ”اس کانفرنس میں طے کردیا گیا، اس بات کی صاف صاف وضاحت کردی گئی کہ ترقی پسند ہونے کے لیے اشتراکی ہونا لازمی ہے۔“

میرے پاس ان باتوں کا جواب نہیں تھا۔ کیونکہ ابھی تک کانفرنس کی تفصیلات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مجھے معلوم نہیں ہو سکی تھیں۔ بعض ترقی پسند دوستوں سے پوچھا تو انہوں نے یہی کہ کانفرنس نے اس طرح کا کوئی فیصلہ نہیں کیا۔۔۔ خیر چند ہی روز میں مقامی ترقی پسندوں کا ایک جلسہ ہوا۔ میں نے بھی اس میں شرکت کی۔ ڈاکٹر عبدالعلیم جو اس کانفرنس میں سب سے پیش پیش رہے تھے انہوں نے اس جلسے میں شریک ہونے والوں سے یہ دریافت کیا کہ کانفرنس میں جو کچھ ہوا اس کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہیں تو پوچھ سکتے ہیں۔ میں نے فوراً یہ سوال پوچھا کہ کیا کانفرنس نے اس طرح کا کوئی فیصلہ کیا ہے کہ سوائے اشتراکیوں کے اور کوئی انجمن ترقی پسند مصنفین میں شریک نہیں ہو سکتا؟ علیم صاحب نے پوچھا۔ یہ بات آپ کو کیسے معلوم ہوئی؟ میں نے کہا ''لکھنو آنے کے بعد بعض ادیبوں نے مجھ سے وثوق کے ساتھ یہ بات کہی''۔۔۔ کہنے لگے۔ ''وہ ادیب کون ہیں؟ میں نے کہا۔

''وہ جو ہمیشہ سے ترقی پسند تحریک کے مخالف رہے ہیں۔''

انہوں نے کہا۔

''پھر آپ ان سے ہمدردی کی توقع کیوں رکھتے ہیں؟ وہ تو اس موقع کی تلاش میں رہتے ہیں کہ ترقی پسندوں کو بدنام کریں۔ اس کے بعد انہوں نے کانفرنس کی روئداد سنائی اور اس سلسلے میں انہوں نے بتایا کہ کانفرنس میں بعض تقریریں ایسی ضرور ہوئیں جو جذباتی تھیں اور ان تقریروں کے کرنے والے اشتراکی تھے، لیکن ہر ممبر کو اظہار خیال کا حق ہے اس لیے کسی ممبر پر پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ لیکن اس سلسلے میں کانفرنس کے پلیٹ فارم سے کوئی تجویز نہیں پاس کی گئی۔۔۔ ایک نیا اعلان نامہ ضرور مرتب کیا گیا ہے۔ جس میں دنیا کے موجودہ حالات میں پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اس میں یہ ضرور کہا گیا ہے کہ ترقی پسند ادیب سرمایہ دار قوتوں کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں۔ وہ عوام دوست ہیں۔ اس لیے عوام دوست قوتوں کا ساتھ
دینا ان کے لیے ضروری ہے۔ اس بنیادی خیال پر ہر ترقی پسند کو
متفق ہونا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ کیسے ہوا کہ ہر ترقی پسند کے
لیے اشتراکی ہونا ضروری ہے؟۔۔۔ اور یہ کہ صرف کمیونسٹ پارٹی
کے ممبر ہی اس میں شریک ہو سکتے ہیں۔۔۔"

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ ساری غلط فہمی دو آدمیوں نے پھیلائی۔ دونوں اپنے آپ کو اشتراکی کہتے ہیں۔۔۔ دونوں میں جذباتیت بلکہ عصبیت پائی جاتی ہے۔ ان میں سے ایک نقاد ہیں اور دوسرے افسانہ نگار۔ نقاد یہ کہتے رہے کہ ترقی پسندوں کو سوائے اشتراکی کے اور کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ اشتراکیت سب سے زیادہ ترقی پسند نظریہ ہے، جو لوگ اشتراکی نہیں، ان کی انجمن ترقی پسند مصنفین میں کوئی جگہ نہیں۔۔۔ اور افسانہ نگار اپریل کے مہینہ میں "۹ مارچ کو ریل کو پہیہ جام کرنے" کی تلقین فرماتے رہے۔ حالانکہ ۹ مارچ کا دن اس کانفرنس سے ڈیڑھ مہینہ پہلے گزر چکا تھا اور اس روز بھی وہ ریل کے پہیے کو جام نہیں کر سکے تھے۔

ترقی پسند تحریک کے لیے ایسے ہی لوگ "نادان دوست کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے ہاتھوں تحریک کو جو نقصان پہنچ رہا ہے، اور آئندہ پہنچنے کے امکانات ہیں۔ وہ اس نقصان سے کہیں زیادہ ہے جو مخالفین کی مجموعی کوششیں اس کو پہنچانے کے درپے ہیں۔ ان کے ہاتھوں تحریک بدنام ہوتی ہے۔ اس کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پھیلتی ہیں اور بہت سے ادیب جو تحریک میں شامل ہو کر اس کی استواری کا باعث بن سکتے ہیں، اس سے بدکتے ہیں۔ اگر یہی صورتِ حال جاری رہی تو تحریک کا محدود ہو کر رہ جانا یقینی ہے۔ چاہیے تو یہ کہ ترقی پسند تحریک کے دائرے کو زیادہ سے زیادہ وسیع کیا جائے۔ جن ادیبوں کو انجمن سے کچھ فروعی اختلافات ہیں وہ تبادلہ خیالات کے ذریعے ختم کیے جائیں۔ اپنے آپ کو محدود کر لینے میں کامیابی نہیں۔ کامیابی اس میں ہے کہ مخالفین

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تک اپنا پیغام پہنچایا جائے۔ اپنا نقطۂ نظر ان کے سامنے رکھا جائے تا کہ غلط فہمیاں دور ہوں اور تحریک کے پھیلنے اور بڑھنے کے لیے زمین تیار ہو۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہندستان اور پاکستان کی ہر زبان کے ادیبوں کی ایک خاص تعداد ایسی ہے جو انجمن کے بنیادی اصولوں سے اتفاق رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کو انجمن میں شامل ہونے میں جھجک محسوس ہوتی ہے کیونکہ وہ ڈرتے ہیں۔ ان کے کانوں میں یہ آوازیں گونجی ہوئی ہیں کہ ترقی پسند تحریک ایک ''ہوّا'' ہے۔ اس میں شامل ہونا کسی بہت بڑی مصیبت کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کو چاہیے کہ ایسے جذباتی آدمیوں پر سختی سے احتساب کرے۔ اگر کوئی غیر ذمہ دارانہ حرکت ان سے سرزد ہو تو ان کو مجرم قرار دے کر ان کے خلاف خاطر خواہ کاروائی کی جائے ورنہ تحریک محدود ہو کر رہ جائے گی اور ساتھ ہی اس میں انتشار ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے گا اور یہ انتشار صرف ترقی پسند تحریک ہی تک محدود نہیں رہے گا بلکہ اس کے جراثیم ادیبوں میں پھیلیں گے اور یہ صورتِ حال ادب اور تہذیب، کلچر اور سماج کے لیے سم قاتل ثابت ہوگی۔ خیال ہے ڈاکٹر رام بلاس شرما کے جنرل سیکرٹری ہو جانے سے انجمن کو ان معاملات کی طرف توجہ کرنے کا موقعہ ملے گا اور وہ اس سلسلے میں خود کوئی قدم بڑھائے گی۔ یہ اُمید اس وجہ سے بندھتی ہے کہ ڈاکٹر بلاس شرما مخلص ہونے کے ساتھ نہایت ہی ہوشیار انسان ہیں۔ انہوں نے اس قسم کی جذباتی تقریروں کو لکھنو کانفرنس ہی کے موقع پر تحریک کے لیے ضرر رساں بتایا تھا۔

بالفرض اگر اس وقت بھی ایسا نہ ہوا تو پھر خدا ہی حافظ ہے۔ ابھی تک ہم فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس برعظیم میں ادیبوں اور فنکاروں کا صرف ایک ہی ادارہ ہے جس میں چوٹی کے صحت مند اور باشعور ادیب شامل ہیں، لیکن اگر ترقی پسند تحریک کے جذباتی علمبرداروں کا منہ بند نہ کیا گیا تو وہ دن دور نہیں جب ترقی پسند انجمن کے دوش بدوش ایک اور انجمن کی بنیاد کھڑی کی جائے گی۔ اس انجمن کا خاکہ بہت دنوں سے بعض ایسے ادیبوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ذہنوں میں موجود ہے جو ترقی پسند تحریک کے مخالف ہیں۔ انہیں اس وقت موقع ملے گا ترقی پسند تحریک کو بدنام کرنے کا اور وہ اسی پر اپنی تحریک کی بنیاد رکھ لیں گے اور اس طرح ادیبوں کی صفوں میں انتشار پیدا ہوگا۔ چنانچہ آج اس طرح کی کوششیں جاری ہیں۔ میں ایک دوبار پہلے بھی اس کی طرف اشارہ کر چکا ہوں۔ آج میں پھر یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ لکھنو کانفرنس کے بعد اس تحریک میں پھر جان ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کا مینی فسٹو تک تیار ہو چکا ہے۔ حکومت اس کو مدد دینے کے لیے بھی تیار ہے۔ کیونکہ ترقی پسند تو اس جال میں پھنس نہیں سکتے ہیں۔ وہ اس کی کارفرمائیوں کا صحیح جائزہ لے رہے ہیں۔ اس لیے وہ ایسے ادیب چاہتی ہے جو اس کی ہر بات کو سراہیں اور اس طرح اسکا بھرم قائم رہے۔ جو لوگ اس تحریک میں پیش پیش ہیں ان کا نام لینے میں بھی مجھے کوئی باک نہیں۔ سب سے بڑے علم بردار اس کے علی جواد زیدی ہیں جن کے ساتھ علی عباس حسینی، حیات اللہ انصاری اور شمیم کرہانی وغیرہ شریک ہیں اور ہندی کے ادیبوں کی تو خاصی تعداد ان کے ساتھ ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ جس تحریک کی عمارت یہ تعمیر کریں گے۔ اسکی بنیادیں ریت پر قائم ہوں گی۔ اس کا پنپنا مشکل ہے۔ لیکن ترقی پسندوں کے لیے تھوڑی سی پریشانی کا باعث ضرور بن جائیں گے اور ادب میں بھی سیاست کی طرح ایک اکھاڑہ بن جائے گا۔ اس صورتِ حال کو درست کرنے کے لیے ہمیں اپنی صفوں کو مضبوط کرنا چاہیے۔ اپنی خامیاں دور کرنی چاہئیں۔ اپنے آپ کو اس قابل بنانا چاہیے کہ ہمارے سامنے کسی کی کچھ بھی پیش نہ جائے۔

اور یہ سب کچھ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ہاتھ میں ہے۔ اس نے جس طرف اب تک توجہ نہیں کی ہے اس طرف اسے اب توجہ کرنی چاہیے اگر اب تک اس میں بعض افراد کی وجہ سے کسی حد تک تنگ نظری کو دخل رہا ہے تو اب اس تنگ نظری کے ختم ہونے کی ضرورت ہے اگر اب تک کہیں کہیں اس میں جذباتیت کے مظاہرے ملتے ہیں تو اب اس کو فنا کرنا لازمی ہے۔ تنگ نظری کی جگہ فراخ دلی اور جذباتیت کی جگہ عقلیت سے جب تک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کام نہیں لیا جائے گا اس وقت تک ترقی پسند تحریک کو اپنا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ ادب اور سیاست ترقی پسند ادب کی تحریک اور کمیونسٹ پارٹی میں ایک خط کھینچنا پڑے گا۔ سیاست ایک گندی چیز ہے۔ وہ انسان کو فروعی باتوں میں اُلجھا کر اس سے ایسی ایسی حرکتیں سرزد کراتی ہے جس پر خلوص حیران رہ جاتا ہے۔ سچائی شرم سے سر جھکا لیتی ہے۔ ادب اور ادیب عملی سیاست میں خواہ مخواہ سیاسی بازیگروں کی طرح صرف اپنا اُلو سیدھا کرنے کے لیے شریک نہیں ہو سکتے۔ وہ اپنی طاقت سے سیاست کو صحیح راستے پر چلانے کی کوشش کرتے رہیں گے۔ قوم اور ملک کی بہتری اسی میں نہیں ہوگی کہ ادیب سیاست کے میدان میں اتر کر الیکشن لڑنے لگے یا جھنڈا ہاتھ میں لے کر دو دو گز اونچا اچھل کہ نعرے لگانے لگے۔ یہ کام دوسروں کا ہے۔ خارجی حالات سے ادیب متاثر ہوگا۔ وہ یہ تو کر سکتا ہے کہ اپنی تخلیقات سے جھنڈے کو ہمدوشِ ثریا کر دے۔ نعروں کو فلک شگاف بنا دے۔ لیکن خود اپنے کام کو چھوڑ کر نعرہ بازی میں کیوں لگ جائے! ہر کسے را بہر کارے ساختند۔۔۔ مجھ سے اگر کوئی کہے کہ "مزدوروں میں جا کر اسٹرائک کراؤ" "۹ مارچ کو ریل کا پہیہ جام کر دو"۔۔۔ تو یہ میرے بس کی بات نہیں۔ اگر مجھے ایسا کرنا ہوگا تو میں کسی ٹریڈ یونین کا ممبر ہو جاؤں گا اور پھر جی بھر کے اسٹرائک میں حصہ لوں گا۔ ادیب کا کام خارجی حالات سے اثر لے کر اپنی تخلیقات کو پیش کرنا ہے۔ اگر یہ حالات اسے متاثر کرتے ہیں تو وہ ان کو اس طرح اپنی تخلیقات میں جگہ دے گا کہ سماج کے عام افراد جو اس تحریک میں حصہ لے رہے ہیں، وہ ان سے متاثر ہوں گے وہ ان تحریکوں کو نئے ولولے، نئی زندگی اور نئی روح بخش سکتا ہے۔ خود اتنا نیچا نہیں گر سکتا کہ تخلیقی کام کو خیر باد کہہ کر اس میں خود حصہ لینے لگے۔ اگر وہ حصہ لینا چاہتا ہے تو ایک عام فرد کی حیثیت سے حصہ لے سکتا ہے۔ ادیب کی حیثیت سے نہیں۔ ادیب ان باتوں سے بہت بلند ہے۔ اس کی منزل چرخ نیلی فام سے بھی پرے ہے۔ اس کا مقام ستاروں سے بھی آگے ہے۔ اس کا مرتبہ آسمانوں سے بھی اُونچا ہے۔

ترقی پسند ادیب کی سیاست سیاسی لیڈر کی سیاست سے مختلف ہونی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چاہیے۔اس کی اشتراکیت اور ایک اشتراکی کارکن کی اشتراکیت میں امتیاز ہونا لازمی ہے۔ادیب بہت بلندی سے وہی کام کرتا ہے جو سیاسی رہنما ہیر پھیر سے کرتے ہیں۔منزل تک پہنچنے کے سلسلے میں ادیب کے یہاں خلوص اور سچائی ہوتی ہے اور سیاسی رہنما کے یہاں مقابل کے توڑ کے لیے داؤں پیچ!اس لیے عملی سیاست سے ترقی پسند تحریک کو حتی الامکان علیحدہ رکھنے کی ضرورت ہے۔اگر کسی ترقی پسند ادیب کو سیاست سے گہری دلچسپی ہے تو وہ اس سیاسی جماعت کا ممبر بن سکتا ہے۔پوری ترقی پسند تحریک اور ساتھ ہی ادب کو اس میں سان لینے سے کیا حاصل!

اتنا سب کچھ سننے کے بعد بھی اگر وہ نوجوان ادیب جو اپنے آپ کو ترقی پسند سمجھتے ہیں،لیکن ترقی پسند مصنفین کی انجمن کو شبہ کی نظروں سے دیکھتے ہیں اور اس کے بالمقابل ایک دوسری انجمن بنانے کے خیال کو ترک نہیں کرتے تو ان کے لیے دعائے خیر ہی کی جاسکتی ہے ادب اور تہذیب کلچر اور سماج کا مفاد اس میں نہیں کہ نئی انجمن بنائی جائے بلکہ اس میں ہے کہ ترقی پسند تحریک میں جوق جوق شامل ہوا جائے اور اس میں جو خامیاں ہیں ان کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔بہتری اسی میں ہے۔یہ ٹھیک ہے کہ شروع دن سے انجمن ترقی پسند مصنفین میں اشتراکیوں کا زور رہا ہے اور آج بھی ہے لیکن اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔اشتراکیت کوئی ہوّا نہیں ہے وہ ایک بڑا سائنٹفک نظریہ ہے خواہ مخواہ اس سے بدکنا کیا معنی!پھر جب ترقی پسند ادیب کی اشتراکیت کمیونسٹ پارٹی کے ممبر کی اشتراکیت سے مختلف ہو تو اس میں ڈر اور خوف کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہی نہیں۔میں ترقی پسند انجمن میں شامل ہوں لیکن کمیونسٹ پارٹی کا ممبر نہیں۔میں اشتراکیت کو موجودہ سیاسی کشمکش کا واحد حل سمجھتا ہوں۔لیکن اس کے باوجود اشتراکیت کے بعض اصولوں سے مجھے اختلاف ہے،یہ سب فروعی باتیں ہیں۔بنیادی چیز ہے انسان دوستی اور محبت اور ظاہر ہے یہ ایسی چیز ہے جس سے کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا۔ترقی پسند مصنفین کی انجمن اسی کی علمبردار ہے۔اس کا یہی نصب العین ہے۔اگر کوئی اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں شامل نہیں ہوتا اور اس میں اشتراکی زیادہ نظر آتے ہیں تو اس میں قصور کس کا ہے؟۔۔۔اس میں شریک ہونا چاہیے فروعی اختلافات خود بخود دور ہو جائیں گے! نہ دور ہوں گے تو ان کے دور کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے بالمقابل دوسری انجمن بنانے کی کوشش کامیاب بھی ہوگئی تو وہ چاند پر خاک ڈالنے کے برابر ہوگی۔ چاند کی چمک میں کوئی فرق نہیں آئیگا۔ البتہ چاند پر خاک ڈالنے والے کے چہرے کا گرد آلود ہو نا یقینی ہے۔

ترقی پسند تحریک اب بہت بلندی پر پہنچ چکی ہے۔ یہ دور صحیح معنوں میں ادب کی ترقی پسند تحریک کا دور ہے پچھلے پندرہ سال سے وہ ہمارے ادب پر حکمراں ہے۔ ہماری ذہانت و فطانت کے بہترین مظاہرے اسی تحریک میں نظر آتے ہیں۔ چوٹی کے نوجوان ادیب اس تحریک سے وابستہ ہیں۔ ملک کی ساری ذہانت (Intelligenties) اسی تحریک کی بنائی ہوئی راہوں پر چل رہی ہے۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہو کر رہ گئے ہیں۔ انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ ترقی پسند تحریک نے بہت سے ادیبوں کو بنایا ہے، ان کو پروان چڑھایا ہے اور ان کے ہاتھوں ہمارے ادب کی ہر صنف میں بیش بہا اضافے ہوئے ہیں۔

سب سے پہلے اس سلسلے میں ہماری نظر تنقید پر پڑتی ہے۔ اُردو میں ترقی پسند تحریک سے قبل تنقید موجود ضرور تھی، تنقیدیں لکھنے کا سلسلہ بھی جاری تھا لیکن جو نقاد اس وقت تک تنقیدیں لکھ رہے تھے ان کے یہاں وہ گہرائی نہیں تھی۔۔۔ وہ تجزیاتی انداز نہیں تھا جو ترقی پسند نقادوں نے اُردو میں پیدا کیا۔ ترقی پسند تحریک سے پہلے سرسید کے زیر اثر تو ایک زمانے تک تنقید کا شہرہ نظر آتا ہے۔ حالی اور شبلی کے سے نقاد اس تحریک کے علمبردار تھے اور اس میں شک نہیں کہ انہوں نے ہمارے تنقیدی ادب میں بیش بہا اضافے کئے ہیں لیکن حالی اور شبلی کے بعد جو نقاد آئے ان میں زیادہ نے تو ان کی تنقید پر کوئی خاص اضافہ نہیں کیا، بلکہ انہیں کے خیالات و نظریات کو سامنے رکھ کر تنقیدیں لکھتے رہے اور انکے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علاوہ جنھوں نے مغرب سے متاثر ہو کر کچھ لکھا ان کی کوششیں اخذ و ترجمہ تک محدود ہو کر رہ گئیں۔ انہوں نے خود بہت کم سوچا دوسروں کے خیالات پیش کر دیئے اور انہیں اصولوں کی روشنی میں اپنے ادب کا جائزہ لے لیا۔ غور و فکر کے عناصر ان کی تنقید میں بہت کم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں گہرائی نہیں۔ ترقی پسند تنقید نے اس رجحان کو پس منظر میں ڈال دیا اور تنقید میں ذاتی غور و فکر کو بہت زیادہ اہمیت دی۔ چنانچہ ایسے نقاد پیدا ہوئے جنھوں نے مختلف ملکوں کے نقادوں کے خیالات کو سامنے رکھ کر اپنے تنقیدی نظریات کی تشکیل کی اور جو نظریات پیش کئے ان میں حقیقت اور واقعیت کو بہت دخل تھا۔ انہوں نے صرف ادب کو زندگی کا ترجمان اور عکاس سمجھا، بلکہ انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ادب سماجی زندگی کا نقاد ہوتا ہے۔ سماجی کشمکش میں اس کے لیے حصہ لینا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ جو حصہ لیتا ہے اس کو حصہ لینا چاہیے اس کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارۂ کار نہیں۔ بعض ترقی پسند نقادوں نے اس سلسلے میں انتہا پسندی سے بھی ۔۔۔ یا جس کی وجہ سے ان کی تنقید کی حدیں تنقید نگاری کے اشتراکی نظریے سے مل گئیں۔ لیکن مجموعی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو ترقی پسند تنقید کے ان نظریات میں جذباتیت ایسی کچھ زیادہ نظر نہیں آتی۔

ترقی پسند نقادوں نے انہیں بنائے ہوئے اصولوں کی روشنی میں اپنے ادب کا جائزہ بھی لیا۔ چنانچہ کلاسیکی ادب کے بارے میں کچھ بعض اچھے تنقیدی مضامین لکھے گئے۔ جن لکھنے والوں نے ترقی پسد سفید میں اضافے کئے ان میں مجنوں گورکھپوری۔ ڈاکٹر اختر حسین، فیض احمد، احتشام حسین، ڈاکٹر عبدالعلیم۔ وقار عظیم، آل احمد سرور اور سجاد ظہیر وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ان سب نے عموماً رسائل میں مختلف موضوعات پر مضامین لکھے ہیں اور بعضوں نے اپنے مضامین کو کتابی شکل بھی دے دی ہے مجنوں کے دو مجموعے "ادب اور زندگی" اور "تنقیدی حاشیے" چھپ چکے ہیں۔ ڈاکٹر اختر حسین کا مجموعہ ادب اور انقلاب کے نام سے شائع ہوا ہے اور احتشام حسین کے مضامین کے تین مجموعے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''تنقیدی جائزے''، ''روایت اور بغاوت'' اور ''ادب اور سماج'' کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ترقی پسند نقادوں نے زیادہ تر تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ تنقید پر کوئی مستقل تصنیف نہیں پیش کر سکے ہیں۔ اس کی وجہ شاید ہے کہ انہیں مستقل کتابیں لکھنے کا سکون نہیں ہے۔ زمانے کی افراتفری اور انتشار کے باعث وہ کسی بڑی چیز کی طرف توجہ نہیں کر سکے ہیں لیکن اب وہ دن دور نہیں جب اس طرف بھی توجہ کی جائے گی۔ پھر بھی مختلف موضوعات پر ان کے مضامین غور و فکر سے اتنے بھرپور ہیں اور تجزیاتی پہلوان میں اس قدر نمایاں ہے کہ ان میں سے ہر مضمون بعض مستقل تصانیف پر بھاری ہے۔

لیکن ترقی پسند تنقید بالکل بے داغ نہیں ہے۔ اس میں جذباتیت کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ کہیں کہیں بغیر سوچے سمجھے بات کہہ دینے والی خصوصیت بھی نظر آتی ہے۔ ایک دوسرے کو سراہنے کا پہلو بھی دکھائی دیتا ہے۔ تنقید میں ایک نپی تلی اور جچی ہوئی بات کہنے کی جو کیفیت ہونی چاہیے وہ بعض جگہ ان لکھنے والوں کے یہاں مفقود بھی ہو جاتی ہے۔ بعض جگہ اس میں تنقید کا تاثراتی انداز بھی رونما ہو جاتا ہے طوالت کا خوف اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ترقی پسند نقاد کے یہاں جو اس قسم کی خامیاں ہیں ان کو تفصیل سے پیش کیا جائے۔ اس لیے میں صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔ سجاد ظہیر انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانیوں میں سے ہیں ان کے علم اور تدبر، خلوص اور سچائی کی میرے دل میں بڑی عزت ہے۔ انہوں نے خاصے اچھے تنقیدی مضامین لکھے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان میں سے زیادہ غور و فکر کا نتیجہ ہیں، لیکن ان مضامین میں کہیں کہیں وہ بھٹک بھی گئے ہیں۔ مثال کے طور پر کیفی اعظمی کے مجموعے ''جھنکار'' پر جو مقدمہ انہوں نے لکھا ہے اس کو شروع ہی ان الفاظ سے کیا ہے۔ ''اُردو شاعری میں ایک نیا پھول کھلا ہے۔۔۔ سرخ پھول'' اور پھر اس کے بعد انہوں نے کیفی کو ایک اشتراکی شاعر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ کیفی کی نظموں سے ان کا اشتراکی ہونا ثابت نہیں ہوتا، برخلاف اس کے ان کے اس مجموعے کی نظموں میں تو جذباتیت اور نعرہ زنی اپنے شباب پر ہے۔ اس زمانے میں اشتراکی ہونا اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اشتراکی شاعری کا پروان چڑھنا ہی مشکل ہے۔ پھر بیچارے کیفی ''سرخ شاعر کیسے ہو سکتے ہیں۔ اشتراکیت جذبات کے سہارے آگے نہیں بڑھ سکتی اور کیفی جذباتی قسم کے اشتراکی ہیں وہ جذبات ہی کے سہارے اشتراکیت تک پہنچے ہیں۔ اسی طرح کی بعض خامیاں دوسرے ترقی پسند نقادوں کے یہاں بھی نظر آتی ہیں۔ ترقی پسند تنقید کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ بعض بالکل نئے ترقی پسند نقاد بعض مغربی نقادوں کو سامنے رکھ کر تنقید لکھتے ہیں۔ بلکہ ان کی تحریریں ان نقادوں کے نظریات سے ماخوذ ہوتی ہیں۔ کہیں کہیں تو وہ ان کا ترجمہ کر دیتے ہیں۔ چنانچہ انکی تنقیدی تحریروں میں اہمال پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ مشکل سے سمجھ میں آتی ہیں۔ کیونکہ پیش کیئے ہوئے خیالات و نظریات کا مفہوم خود لکھنے والے کے ذہن میں صاف نہیں ہوتا۔ کاڈویل کی تنقیدی تحریروں کو ہمارے بعض نوجوان نقادوں نے خاص طور پر اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی تنقیدیں دیوانے کا خواب بن کر رہ گئی ہیں۔ لیکن یہ رجحان زیادہ دنوں چلنے والا نہیں۔

ان خامیوں کو نظر انداز کر کے اگر مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو ویسے ترقی پسند تنقید نے اُردو کو بہت کچھ دیا ہے۔ نئے انقلابی نظریات عام کئے ہیں۔ نئے تجزیاتی انداز تنقید سے روشناس کیا ہے۔

تنقید کے ساتھ ساتھ شاعری کی ترقی میں بھی ترقی پسند تحریک کو خاصا دخل ہے۔ ترقی پسند تحریک کی ابتداء سے قبل، جیسا کہ پہلے بھی کہا جاچکا ہے، اُردو شاعری میں ترقی پسند رجحانات موجود تھے۔ لیکن ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ ان ترقی پسند رجحانات نے ایک ''رومانی انقلابیت کا روپ اختیار کر لیا تھا۔ جس کے زیر اثر وطن پرستی اور انقلاب کے رومانی تصورات عام ہو رہے تھے، اس وقت شاعروں میں سماجی احساس ضرور موجود تھا، لیکن سماجی مسائل کو سمجھنے کے سلسلے میں ان لوگوں نے عقل و شعور کے بجائے جذبات سے زیادہ کام لیا تھا۔ چنانچہ سماجی مسائل کی تہہ تک یہ لوگ نہیں پہنچ پائے تھے۔ انقلاب صرف ان کے تصور میں پرورش پاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس سلسلے میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بعید از قیاس باتیں کیں جس کے نتیجے میں ہر چیز کو توڑ پھوڑ کر رکھ دینے کے خیال نے جڑ پکڑی۔ سیماب، جوش، احسان، روش، ساغر، الطاف مشہدی۔ غرض یہ کہ اس وقت کے سارے شاعر اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

ترقی پسند تحریک نے شاعری کو حقیقت کا ایک نیا راستہ دکھایا۔ جذباتیت کو خیر باد کہنے کی تلقین کی۔ رومانیت کو ختم کرنے کی طرف شاعروں کو راغب کیا اور اس طرح ایک سائنٹفک نقطۂ نظر کے اثرات شاعری میں نظر آنے لگے۔ جو لوگ اس کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے وہ یا تو تھک کر بیٹھ گئے یا انہوں نے کوئی دوسرا راستہ اختیار کر لیا۔ جو شاعر اس زمانے میں پیش پیش تھے ان میں سے بہت کم نے ترقی پسند تحریک کا ساتھ دیا۔ صرف جوش ایک ایسے تھے جنہوں نے ترقی پسند تحریک کے اصولوں اور خیالات و نظریات کی برتری کو تسلیم کیا اور وہ اس میں شامل بھی ہو گئے۔ چنانچہ بڑی حد تک انہوں نے اپنی سماجی اور انقلابی شاعری کو رومانیت اور جذباتیت سے الگ کرنے کی شعوری کوشش کی دوسرے شاعر ترقی پسند تحریک کو تماشا بنا کر اس کا نظارہ کرتے رہے۔ تحریک میں شامل ہونے کی ان میں ہمت نہیں تھی چنانچہ وہ اپنی بات پر اڑے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بے بضاعتی کے احساس نے تخلیقی کام کی طرف سے بھی ان کا دل پھیر دیا اور وہ صرف ''استاد'' بن کر رہ گئے۔ اپنی بے بضاعتی اور کم مائگی کے احساس نے انہیں ان جذبات اور احساسات کی ترجمانی سے بھی باز رکھا جس کی لہریں ان کے دل میں اُٹھتی تھیں۔۔۔ خیر ایسے شاعروں سے اور توقع ہی کیا ہو سکتی تھی۔ آج بھی وہ ''استادانہ رنگ'' میں شاعری کئے جا رہے ہیں اور اسمیں شک نہیں کہ انہیں نظم کرنے میں ملکہ حاصل ہے۔ وہ اس فن کے ماہر ہیں۔

جوش کے ساتھ ساتھ، ترقی پسند تحریک نے بہت سے نوجوان اُردو شاعروں کو پیدا کیا۔ ان شاعروں میں مجاز، فیض، جاں نثار اختر علی سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، جذبی اور اختر انصاری وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ان شاعروں نے اُردو شاعری میں نئے تصورات کو پیش کیا، نئی روایات قائم کیں۔ فن کے نئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زاویے بنائے، نئی قدروں کے چراغ روشن کیئے ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اس جذباتی رومانیت کو ختم کرنے کی بڑی حد تک کوشش کی جو اُردو شاعری پر ترقی پسند تحریک سے قبل چھائی ہوئی تھی۔ سماجی اور انقلابی خیالات تک کو پیش کرنے کے سلسلے میں اُردو شعراء جس سے کام لے رہے تھے اور اس کی جگہ ان کے ہاتھوں اُردو شاعری ایک ترقی پسند نقطۂ نظر سے روشناس ہوئی۔ انہوں نے حقیقت نگاری کے تصور کو رواج دیا۔ چنانچہ اب سماج اور انقلابی موضاعات پر بھی سائنٹفک نقطۂ نظر سے نظمیں لکھی گئیں۔ جوشؔ کے یہاں رومانیت چونکہ رچ گئی تھی، اس نے وہ تو بڑی مشکل سے اس کو چھوڑ سکے۔ پھر بھی ان کے یہاں مختلف نظموں میں اسکے اثرات ضرور نظر آتے ہیں۔ ان موضوعات سے متعلق ''شعلہ و شبنم'' اور '' حرف و حکایت'' وغیرہ کی بعض نظموں میں جو گہرائی نظر آتی ہے وہ سب اسی اثر کا نتیجہ ہے۔ یوں مجازؔ بھی فطرتاً رومانی ہے لیکن ان کی انقلابی نظموں میں غور و فکر کے عناصر کا پتہ چلتا ہے۔ ''خواب سحر'' اور ''سرمایہ داری'' کی سی نظمیں ان خصوصیات کی حامل ہیں۔ فیضؔ نے بھی اس قسم کے موضوعات پر اگرچہ چند ہی نظمیں لکھی ہیں۔ لیکن ان میں بھی اس رجحان کا احساس ہوتا ہے۔ ''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ۔'' ''چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز۔'' بول کہ لب آزاد ہیں ترے۔'' اور '' رقیب سے'' وغیرہ کی سی نظموں میں یہ خصوصیات نمایاں ہیں۔ سردار جعفریؔ چونکہ عملی طور پر اشتراکی ہیں اس لیے انکی نظموں میں ایک جارحانہ اقدام ہے، لیکن ان میں تفکر اور حقیقت کا فقدان نہیں۔ ''شاہراہ حیات'' اور اسی قبیل کی نظمیں اسی اثر کا نتیجہ ہیں۔ غرض یہ کہ مذکورہ بالا تقریباً تمام شاعروں کی نظموں میں حقیقت نگاری کا احساس ہوتا ہے، غور و فکر کی خصوصیت نظر آتی ہے اور یہ سب ترقی پسند تحریک سے وابستگی کا نتیجہ ہے۔ عشقیہ موضوعات تک میں انہوں نے اس خصوصیت کا رنگ دیا ہے۔ چنانچہ حسن و عشق سے متعلق جو نظمیں ان نوجوان شاعروں نے لکھی ہیں ان میں رومان ہی رومان نہیں ہے بلکہ رومان حقیقت سے ہم آغوش نظر آتا ہے۔۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے ہر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک کی شاعری میں رومان اور حقیقت کا ایک سنگم ملتا ہے۔ انہوں نے جوش اور اختر شیرانی کی طرح حسن کی رعنائیوں اور سرمستیوں میں کھونا ہی پسند نہیں کیا بلکہ اس کے برخلاف انہوں نے سماجی حالات کے پس منظر میں اپنے عشق کی کیفیات کی وضاحت کی۔ حسن و عشق کے سلسلے میں اپنے سماجی فرائض کو وہ سب کے سب پیش نظر رکھتے ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کی عشقیہ شاعری ہوائی اور رومانی نہیں رہی بلکہ وہ موجودہ دور کے ہندوستانی نوجوان کی صحیح ترجمان بن گئی ہے۔

پھر بھی ان شاعروں نے پچھلے چودہ پندرہ سال میں جو نظمیں لکھی ہیں، ان میں سے بعض ترقی پسندی کی کسوٹی پر پوری نہیں اُترتیں۔۔۔ بات یہ ہے کہ وہ فطرتاً رومانی ہیں۔ مجاز۔ فیض اور ندیم ان سب کے یہاں رومانیت غالب نظر آتی ہے ان کے یہاں تفکر کی جھلکیاں ہیں، لیکن ایک ٹھوس انقلابی کی شخصیت کسی کے یہاں بھی نظر نہیں ملتی۔ ترقی پسند تحریک تو ان سے اس بات کی متقاضی تھی کہ وہ آتشیں ترانے گاتے لیکن انہوں نے ایسا کم کیا ہے۔ ان میں سے اکثر کے یہاں انفعالیت اور قنوطیت بھی پیدا ہو جاتی ہے اور اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آس پاس اندھیاریوں کا بسیرا دیکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ روتے ہیں چیختے ہیں چلاتے ہیں۔ مردانہ وار آگے نہیں بڑھتے۔ یوں تو ان سب شاعروں کے یہاں اس خصوصیت کی ایک لہری دوڑی ہوئی ہے۔ لیکن جذبی کی شاعری میں شاید یہ خصوصیت سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ ان کے یہاں سماجی احساس ضرور موجود ہے غور و فکر کے عناصر بھی نظر آتے ہیں، لیکن ان سب کی تہ میں ایک میٹھے میٹھے درد کا پتہ چلتا ہے۔ ایک کرب کی سی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ انہوں نے ''اے سپاہی کھینچ اپنی خونفشاں تلوار کھینچ'' کی سی ایک آدھ نظم بھی لکھ دی ہے۔ لیکن بڑی مشکل یہ ہے کہ ایسی نظموں میں وہ شاعر نہیں رہے ہیں۔ پھر ان شاعروں نے بہت کم لکھا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے زیادہ میں صرف چند نظموں سے زیادہ لکھنے کی سکت نہیں۔ ان کی اس، خاموشی اور کم گوئی کا راز آج تک کم از کم میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ایسا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معلوم ہوتا ہے جیسے وہ بجھ چکے ہیں، جیسے ان کا سرمایہ ختم ہو چکا ہے، جیسے ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ جیسے ان کے احساس کی قوت سلب کرلی گئی ہے۔ اس خامی کے علاوہ ان میں بعض شعراء کے یہاں زوال پسندی کے اثرات بھی کہیں کہیں رونما ہوتے ہیں۔ خیالات میں تو خیر یہ کیفیت کسی کے یہاں نظر نہیں آتی لیکن ہاں پیش کرنے کے انداز میں اس کا احساس کسی کسی کے یہاں کہیں کہیں ضرور ہوتا ہے۔ زوال پسندی کی ایک خصوصیت الہام اور دوراز قیاس میں اشاریت کا استعمال بھی ہے۔ چنانچہ یہ خصوصیت فیض کی دو ایک نظموں میں موجود ہے "سیاسی لیڈر کے نام" اور اسی طرح کی دو ایک اور نظمیں اگرچہ فکر و خیال کے اعتبار سے ترقی پسند ہیں، لیکن انکے طرز اور اسلوب بیان میں ابہام اور دوراز قیاس اشاریت کی وجہ سے زوال پسندی کی جھلک نظر آتی ہے۔ ظاہر ہے یہ رجحان ترقی پسندی کے منافی ہے لیکن ویسے ان شاعروں کا عام رجحان ترقی پسندانہ ہے۔

شاعری کے دوش بدوش اُردو افسانہ نگاری نے بھی ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ترقی کی بہت سی منزلیں طے کی ہیں جتنے بڑے افسانہ نگار اور انکے ہاتھوں جو نئے ترقی پسند رجحانات اُردو افسانہ نگاری میں آئے ہیں، وہ سب کے سب ترقی پسند تحریک کے بعد کی پیداوار ہیں اس تحریک سے قبل دوسری اصناف ادب کی طرح افسانہ نگاری میں بھی جذباتیت اور رومانیت کا دور دورہ تھا۔ افسانہ نگاری حسن و عشق کے موضوعات ہی سے عبارت تھی۔ نیاز، لطیف الدین احمد، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش سب کے سب ایک جذباتی رومانیت کے علمبردار تھے ان کے ساتھ ساتھ پریم چند، سدرشن، علی عباس حسینی اور اعظم کریوی نے اُردو افسانہ نگاری کو زندگی اور حقیقت سے قریب کیا، یہ سب کے سب اصلاحی دور کی پیداوار تھے۔ چنانچہ اپنے افسانوں کو بھی انہوں نے زندگی کے اصلاحی پہلوؤں کی طرح پیش کیا ہے۔ ہندوستان کے گاؤں اور وہاں کی زندگی وہاں کے رہنے والوں کے سماجی مسائل ان کی الجھنیں اور پریشانیاں ان افسانہ نگاروں کے خاص موضوعات ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں انہوں نے کوئی انقلابی کیفیت پیدا نہیں کی۔ یہ انقلابی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیفیت ان افسانہ نگاروں کے بعد میں آنے والے افسانہ نگاروں کے ہاتھوں اُردو افسانہ نگاری میں پیدا ہوئی جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے چنانچہ پچھلے پندرہ سال سے یہ افسانہ نگار اُردو افسانہ نگاری پہ چھائے ہوئے ہیں اور انہوں نے اس میں انقلابی کیفیت پیدا کی ہے حقیقت نگاری کے رجحانات کو عام کیا ہے اور زندگی کے تمام مسائل اس میں سمودیے ہیں۔

افسانہ نگاری کے اصلاحی رجحان کے خلاف پہلی بغاوت ترقی پسندوں ہی کے ہاتھوں ہوئی اس وقت جب انگارے کا جنم ہوا۔ ''انگارے'' کے لکھنے والوں میں وہ لوگ تھے جن کے ہاتھوں اُردو میں ترقی پسند تحریک کی ابتداء ہوئی۔ ان افسانوں میں بلا کی تلخی تھی۔ انہوں نے سماج کے کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ ہر ایک پر طنز کے وار کیے تھے۔ ایک گرتی ہوئی بورژوا سوسائٹی کے سارے زخموں کو انہوں نے نمایاں کر کے رکھ دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھنے والے چیخ اُٹھے۔ حکومت نے ''انگارے'' کو ضبط کرلیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ''انگارے'' کے افسانوں میں انتہا پسندی کی خصوصیت نمایاں تھی لیکن ان افسانوں نے اُردو افسانہ نگاری کو ترقی پسندی اور حقیقت نگاری کا ایک نیا رجحان دیا۔ ترقی پسند تحریک کے زیر سایہ جس کی نشو ونما ہوتی رہی اس کی آبیاری کرنے والوں میں وہی لوگ شامل ہیں جو نقطۂ نظر کے اعتبار سے ترقی پسند تھے۔ ان میں سے اکثر ترقی پسند تحریک میں شامل ہو گئے جن کو تحریک میں شامل ہونے کا موقع نہیں ملا، انہوں نے بھی ان رجحانات کی ترجمانی کی جو ترقی پسندوں کے ہاتھوں اُردو افسانہ نگاری میں پیدا ہوئے تھے۔

جو افسانہ نگار ترقی پسند رجحانات کو اُردو افسانہ نگاری میں لانے کے سلسلے میں پیش پیش رہے ہیں، ان میں احمد علی، رشید جہاں، کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، اختر اورنیوی، سعادت حسن منٹو، اپندر ناتھ اشک، ممتاز مفتی، مہندر ناتھ، مدھوسدن، بلونت سنگھ، ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور، وغیرہ پیش پیش رہے ہیں۔ ممکن ہیں ان میں سے بعض ترقی پسند تحریک کے ممبر نہ ہوں لیکن ان میں سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کو ترقی پسند تحریک سے ہمدردی نہ رہی ہو اور جو اس سے شعوری طور پر متاثر نہ ہوا ہو۔ یہ افسانہ نگار ظاہر ہے اس وقت کے چوٹی کے افسانہ نگار ہیں ان کا شعور بیدار ہے۔ انہوں نے سماجی مسائل پر گہری نظر ڈالی ہے۔ انہوں نے اس کی ہر بات کا تجزیہ کیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے موضوعات مختلف ہیں کوئی ان میں سے سماجی حالات کے مدوجزر کو پیش کرتا ہے کوئی مزدور طبقے کی ترجمانی کرتا ہے۔ کسی کا موضوع متوسط طبقے کی اُلجھنیں اور پریشانیاں ہیں کوئی کسانوں کے جذبات واحساسات کا ترجمان ہے کسی نے غلط سماجی نظام میں صنف نازک کی جو حالت ہے اس کو فن کا موضوع بنایا ہے، کسی نے سماجی مذمومات پر اپنے فن کی بنیادیں رکھی ہیں۔۔۔ غرض یہ کہ جن موضوعات سے ہماری زندگی عبارت ہے ان سب کی تصویریں ان افسانہ نگاروں نے بنانے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں غور وفکر کا عنصر، تجزیاتی زاویہ نظر اور ترقی پسندانہ نقطۂ نگاہ، ان سب کے پیش نظر رہا ہے ان کے یہاں ایک انقلابی کیفیت بھی ہے ایک جارحانہ انداز بھی ہے۔ طبقاتی تفریق اور کشمکش کا احساس بھی ہے اور ان سب کو انہوں نے فن کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا ہے ان میں سے ہر ایک نے مختصر افسانہ کی تکنیک کو بڑی چابکدستی سے استعمال کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ خیال اور ہیئت دونوں کے اعتبار سے انہوں نے ایسے افسانے لکھے ہیں جو دنیا کے کسی ملک کے افسانوں کے دوش بدوش رکھے جاسکتے ہیں لیکن ان میں سے بعض کے فن میں کہیں کہیں خامیوں کا احساس بھی ہوتا ہے بعض ان میں سے کبھی کبھی بلا کے جذباتی ہوجاتے ہیں اور ہر چیز کو توڑ پھوڑ کر رکھ دینا چاہتے ہیں بعض کے یہاں مقصد فن پر غالب آجاتا ہے اور کہیں کہیں واعظانہ کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ کوئی جنسی مذمومات کا ذکر کرتے ہوئے ذہنی عیاشی کا شکار ہو جاتا ہے ان افسانہ نگاروں میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کے فن میں ان خامیوں میں سے کوئی نہ کوئی خامی نہ پیدا ہوتی ہو۔۔۔ لیکن خامیاں ان کی اچھائیوں کے نیچے دب جاتی ہیں اور مجموعی اعتبار سے ان کے فن کو دیکھنے کے بعد اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے اُردو افسانہ نگاری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں بیش بہا اضافے کیئے ہیں۔ خصوصاً کرشن چندر، عصمت، بیدی، ندیم منٹو اور ممتاز مفتی کے فنوں کو خصوصیت کے ساتھ اُردو افسانہ نگاری میں اہمیت حاصل ہے۔

ڈرامہ نگاری پر بھی ترقی پسندی اثر انداز ہوئی ہے۔ لیکن اسٹیج کی کوئی روایت نہ ہونے کی وجہ سے اُردو میں چونکہ ڈرامہ نگاری کا کوئی خاص ارتقاء بھی نہیں ہے اس لیے یہ اثرات پوری طرح اپنا کام نہیں کر سکے ہیں۔ پھر بھی کرشن چندر، راجندر سنگھ، بیدی، عصمت چغتائی اور اپندر ناتھ اشک نے بعض بہت اچھے ڈرامے لکھے ہیں۔

ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر تخلیقی ادب کی تمام اصناف میں باوجود بعض خامیوں کے گراں بہا اضافے ہوئے ہیں اور جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں یہ دورِ ادب کی ترقی پسند تحریک کا دور ہے اور اُردو ادب کے کسی دور سے پیچھے نہیں۔ بلکہ بعض خصوصیات تو اس میں ایسی ہیں جو اسے اُردو ادب کے ہر دور سے ممتاز کر دیتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی بعض خامیاں بھی ایسی ہیں جو اس تحریک کو زیب نہیں دیتیں۔ مثال کے طور پر سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر علمی و ادبی موضوعات پر مستقل کتابوں کا پتہ نہیں چلتا۔ علمی موضوعات کی طرف تو خیر سرے سے توجہ ہی نہیں کی گئی ہے۔ تاریخ، معاشیات، اقتصادیات، کلچر، تہذیب، مذہبیات، فلسفہ، نفسیات، اجتماعیات، سیاسات، لسانیات، جمالیات اور سائنس کے مختلف شعبوں کے بارے میں ترقی پسند تحریک نے کچھ نہیں کیا ہے۔ ان موضوعات پر مستقل تصانیف کا تو خیر ذکر ہی کیا ہے رسائل میں مضامین تک نظر نہیں آتے۔ جیسے ترقی پسند ادیبوں نے اس طرف مطلق توجہ ہی نہیں کی ہے جیسے وہ اس کو ضروری ہی نہیں سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ چیز ترقی پسند تحریک کے بالکل برخلاف ہے ترقی پسند تو زندگی سے متعلق ہر علم پر گہری نظر ڈالتا ہے وہ زندگی کے کسی موضوع کو بھی نظر انداز نہیں کرتا وہ اس کے ہر پہلو کو ترقی پسندانہ نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اسکو ترقی پسند کہا ہی نہیں جا سکتا۔ لیکن افسوس ہے کہ اُردو کے ترقی پسند ادیبوں نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ سرسید کی تحریک کے زیرِ اثر جو ادب پیدا کیا گیا وہ اس اعتبار سے موجودہ ترقی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پسند ادب سے بہت بلند ہے کیونکہ اس وقت کے ہر لکھنے والے نے اپنی اپنی افتادِ طبع اور ذہنی رجحان کی مناسبت سے مختلف علوم پر کتابیں لکھی ہیں۔ شبلی نے تاریخ اور سوانح نگاری اور مذہبیات کو عقلی زاویہ سے دیکھنے کی کوشش کی۔ حالی نے سوانح نگاری اور تنقید نگاری کو اپنا موضوع بنایا۔ نذیر احمد ناول نگاری کے ساتھ ساتھ تاریخ مذہبیات پر کام کرتے رہے۔ غرض یہ کہ اس زمانے کے ہر بڑے ادیب نے جس موضوع کو بھی لیا ہے اس پر مستقل تصانیف چھوڑی ہیں۔ ہمارا ترقی پسند ادب اس سے محروم ہے۔۔۔ یہاں کسی موضوع پر کسی ترقی پسند ادیب نے کوئی سنجیدہ تصنیف نہیں چھوڑی۔ ترقی پسندوں میں سے جو بھی اٹھتا ہے وہ ایک آدھ افسانہ یا نظم لکھ دینے کو معراج سمجھتا ہے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ سجاد ظہیر نے ایک دفعہ پتے کی بات کہی تھی کہ اسلامیات یا تاریخ کے ایک پروفیسر کے لیے ضروری نہیں کہ وہ اچھا افسانہ نگار شاعر، یا نقاد ہو جائے بلکہ اگر وہ ترقی پسند ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور ترقی پسند تحریک سے اسے دلچسپی ہے تو اس کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ اسلامیات یا تاریخ کا مطالعہ ترقی پسندانہ نقطۂ نظر سے کرے اسی کو اپنی تصنیف اور تالیف کا موضوع بنائے اور اس پر اپنی زندگی صرف کر دے لیکن اُردو میں ایک بھی ایسا ادیب نہیں دوسرے علوم تو درکنار ادبی تنقید کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ زیادہ تر صرف مضامین لکھے گئے ہیں۔ یونیورسٹی کے پروفسروں تک نے یہی کیا ہے۔ حالانکہ چاہیے تو یہ تھا کہ مختلف ادبی موضوعات پر مستقل کتابیں لکھی جاتیں۔ اس کی کئی وجوہ ہیں۔ سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے ترقی پسند ادیب تن آسان ہیں۔ وہ محنت کرنا نہیں جانتے اور ان موضوعات پر تصنیف و تالیف کا کام محنت چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ زمانے کی افراتفری اور سماجی انتشار نے ان کو اتنا سکون نہیں بخشا ہے کہ وہ کسی سنجیدہ اور گہرے موضوع کی طرف مستقل توجہ کر سکیں اور ایک بات یہ بھی ہے کہ عوام میں علمی کاموں سے زیادہ دلچسپی نہ ہونے کی وجہ سے اس قسم کے کاموں کی مانگ نہیں۔۔۔ افسانے اور نظمیں لوگ شوق سے پڑھتے ہیں۔ تنقید اور دوسرے سنجیدہ موضوعات کی طرف کون توجہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گے۔اس سلسلے میں اگر کسی کو دھوکا یا فریب دینے کا موقع آیگا تو اس میں وہ پیش پیش رہیں گے۔ذمہ داری کا احساس انہیں مطلق نہیں۔عورت اور شراب کے پیچھے وہ ذلیل سے ذلیل حرکت کرنے سے باز نہیں رہتے۔دوسروں کو بیوقوف بنانا ان کا ایک ادنےٰ سا کرشمہ ہے۔شرم وحیا کے عناصر ان میں نام کو نہیں اب تو وقت کے ساتھ ساتھ یہ صورتِ حال ذرا درست ہوتی جارہی ہے۔ورنہ آج سے چند سال پہلے تو حالت بہت ہی دگر گوں تھی۔مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ لوگ ترقی پسند ادیبوں کے نام سے گھبرانے لگے تھے۔کیونکہ بعض ترقی پسند شاعر شریف لوگوں کے ڈرائنگ روم میں جا کر قے کرتے تھے۔وجہ یہ تھی کہ وہ شراب میں بری طرح دھت ہوتے تھے۔نوجوان لڑکیاں ان کے آنے کی خبر سن کر محفلوں سے اُٹھ کر چلی جاتی تھیں۔اُنھیں انکی نظمیں سننے کی بجائے اپنی عزت بچانے کی زیادہ فکر ہوتی تھی۔لوگ ان کے قریب آتے ہوئے گھبراتے تھے۔ان کے معقول دوست ان سے آنکھ بچا کر نکل جانے کی کوشش کرتے تھے۔اور آج بھی اس صورتِ حال میں ایسا کچھ زیادہ تغیر نہیں ہوا ہے۔تھوڑے سے فرق کے ساتھ آج بھی صورتِ حال یہی ہے۔

میں نے ان تلخ حقیقتوں کو اس وجہ سے بے نقاب کیا کہ اس کے اثرات ادبی تخلیق پر پڑتے ہیں،ادیب کے کردار اور اس کی شخصیت کا اثر ادبی تخلیق پر بڑا گہرا ہوتا ہے۔ایک ادیب اپنی تخلیق میں اپنی شخصیت اور کردار کو کسی نہ کسی صورت سے نمایاں کرنے کے لیے مجبور ہے۔وہ چاہے تب بھی اس سے اپنا دامن نہیں بچا سکتا۔چنانچہ یہی ہوا ہے۔ایسے ادیبوں کی تخلیقات میں خلوص کا پتہ نہیں چلتا۔اول تو وہ بلند نصب العین کو پیش کر ہی نہیں سکتے اور اگر پیش کرنے کی کوشش بھی کریں تو اس میں بناوٹ،تکلف اور تصنع کی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند تحریک سے متعلق ایسے ادیبوں کی تخلیقات میں یہی خصوصیات نمایاں ہیں۔میں ایسے ادیبوں کے نام لینا نہیں چاہتا۔ترقی پسند ادیب اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں گے تو انہیں خود حقیقت نظر آجائے گی۔

ترقی پسند تحریک میں جو افراد شامل ہیں۔ان میں جو کمزوریاں اور خامیاں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گے۔اس سلسلے میں اگر کسی کو دھوکا یا فریب دینے کا موقع آئیگا تو اس میں وہ پیش پیش رہیں گے۔ذمہ داری کا احساس انہیں مطلق نہیں۔عورت اور شراب کے پیچھے وہ ذلیل سے ذلیل حرکت کرنے سے باز نہیں رہتے۔دوسروں کو بیوقوف بنانا ان کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے۔شرم وحیا کے عناصر ان میں نام کو نہیں اب تو وقت کے ساتھ ساتھ یہ صورتِ حال ذرا درست ہوتی جارہی ہے۔ورنہ آج سے چند سال پہلے تو حالت بہت ہی دگرگوں تھی۔مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ لوگ ترقی پسند ادیبوں کے نام سے گھبرانے لگے تھے۔کیونکہ بعض ترقی پسند شاعر شریف لوگوں کے ڈرائنگ روم میں جاکر قے کرتے تھے۔وجہ یہ تھی کہ وہ شراب میں بری طرح دھت ہوتے تھے۔نوجوان لڑکیاں ان کے آنے کی خبر سن کر محفلوں سے اُٹھ کر چلی جاتی تھیں۔اُنھیں انکی نظمیں سننے کی بجائے اپنی عزت بچانے کی زیادہ فکر ہوتی تھی۔لوگ ان کے قریب آتے ہوئے گھبراتے تھے۔ان کے معقول دوست ان سے آنکھ بچاکر نکل جانے کی کوشش کرتے تھے۔اور آج بھی اس صورتِ حال میں ایسا کچھ زیادہ تغیر نہیں ہوا ہے۔تھوڑے سے فرق کے ساتھ آج بھی صورتِ حال یہی ہے۔

میں نے ان تلخ حقیقتوں کو اس وجہ سے بے نقاب کیا کہ اس کے اثرات ادبی تخلیق پر پڑتے ہیں،ادیب کے کردار اور اس کی شخصیت کا اثر ادبی تخلیق پر بڑا گہرا ہوتا ہے۔ایک ادیب اپنی تخلیق میں اپنی شخصیت اور کردار کو کسی نہ کسی صورت سے نمایاں کرنے کے لیے مجبور ہے۔وہ چاہے تب بھی اس سے اپنا دامن نہیں بچا سکتا۔چنانچہ یہی ہوا ہے۔ایسے ادیبوں کی تخلیقات میں خلوص کا پتہ نہیں چلتا۔اول تو وہ بلند نصب العین کو پیش کر ہی نہیں سکتے اور اگر پیش کرنے کی کوشش بھی کریں تو اس میں بناوٹ،تکلف اور تصنع کی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند تحریک سے متعلق ایسے ادیبوں کی تخلیقات میں یہی خصوصیات نمایاں ہیں۔میں ایسے ادیبوں کے نام لینا نہیں چاہتا۔ترقی پسند ادیب اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں گے تو انہیں خود حقیقت نظر آجائے گی۔

ترقی پسند تحریک میں جو افراد شامل ہیں۔ان میں جو کمزوریاں اور خامیاں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں، ان کے ساتھ ہی جماعتی اعتبار سے بھی وہ خامیوں سے بھرپور ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنظیم جس طرح ہونی چاہیے، اس طرح ہو نہیں سکی ہے۔ انجمن کا آئین بھی موجود ہے۔ مینی فیسٹو بھی ہے۔ ملک میں تحریک سے بڑھتی ہوئی دلچسپی نے جگہ جگہ اس کی شاخیں بھی قائم کردی ہیں، لیکن اس آئین پر سختی سے عمل نہیں ہوتا۔ مینی فیسٹو میں جو باتیں درج ہیں ان کی خلاف ورزی بھی ہوتی ہے اور شاخوں کی تنظیم میں وہ بات نہیں جو ہونی چاہیے سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ انجمن کے صدر دفتر میں ایسے لوگوں کی فراوانی ہے جن کی دلچسپیاں بے شمار ہیں۔ ان میں سے بعض کمیونسٹ پارٹی کا کام بھی کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ لوگ پورا وقت انجمن کے کاموں میں نہیں دیتے، انہیں اپنی ذمہ داری کا صحیح احساس بھی نہیں۔۔۔ اور یہ وبا تو ترقی پسند ادیبوں میں آجکل اس قدر عام ہے کہ بیان سے باہر ہے جو غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کرتا ہے، سمجھ لیجئے ترقی پسند ہے، چنانچہ مرکز کو کوئی خط لکھ کر اگر آپ کوئی معلومات حاصل کرنی چاہیں تو آپ کو کبھی کوئی جواب نہیں ملے گا یہاں تک کہ بیسوں خط لکھنے کے بعد آپ میں دیوانگی کے آثار نمایاں ہونے لگیں گے۔ ایک دفعہ تو یہ موجِ خوں خود میرے سے گزر چکی ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ مارچ ۱۹۴۶ء میں انجمن کے جنرل سیکرٹری علی سردار جعفری (جو میرے دوست ہیں) نے مجھ سے ''نیا ادب'' کے لیے ایک مضمون مانگا۔ اس سلسلے میں جب انہوں نے کئی خطوط لکھے اور بہت شرم دلائی کہ انجمن سے اس قدر گہری دلچسپی رکھنے کے باوجود نیا ادب میں نہیں لکھتا۔ حالانکہ نیا ادب سال میں ایک دوبار ہی نکلتا تھا مجھے کچھ غیرت آئی اور میں نے خاص طور پر ایک مضمون ''شاعری کے موضوعات پر چند خیالات'' کے عنوان سے لکھ کر بذریعہ رجسٹری سردار جعفری کے نام بھیج دیا۔ رسید کی اطلاع نہیں آئی۔ نہ جانے کتنے خطوط میں نے لکھے لیکن جواب سے محروم رہا۔ میں نے دوسرے احباب کو لکھا معلوم ہوا مضمون پہنچ گیا ہے۔ سال بھر گزر گیا مضمون نہیں چھپا۔ سردار جعفری لکھنو آئے کافی ہاؤس میں اتفاق سے ملاقات ہوئی۔ میں نے انہیں سخت سُست کہا۔ اس انداز میں جو مجھے اختیار

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ان کے پاس اسکا کوئی جواب نہیں تھا کہ انہوں نے جواب کیوں نہیں دیا۔ اتنا معلوم ہوسکا کہ مضمون کیفی کے پاس ہے کیونکہ وہی نیا ادب کا کام کرتے ہیں۔ کچھ عرصے بعد کیفی سے لکھنو میں ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا۔

> ''جی ہاں۔ وہ مضمون میرے ہی پاس نیا ادب سے متعلق ایک بکس میں محفوظ ہے۔ سردار کو اس کا علم نہیں تھا۔ بمبئی جاتے ہی آپ کے پاس بھیجدوں گا، کیونکہ نیا ادب کے شائع ہونے کا کچھ ٹھیک نہیں۔ نیا ادب ان دنوں کتابی صورت میں کبھی کبھی نکلتا تھا۔۔۔ کئی سال گزر گئے لیکن آج تک انہوں نے جواب دینے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی ہے۔ میں نے یاد دہانی کے طور پر آخری خط مئی ۱۹۴۹ء میں انہیں پھر لکھا ہے۔ جواب سے محروم ہوں، اور خیال ہے محروم رہوں گا، کیونکہ مجھے یقین ہے کہ وہ مضمون اب اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔ ان انقلاب پسندوں کی ''ذمہ داری کے صحیح اور شدید احساس'' نے شاید اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ''محفوظ'' کر دیا ہے۔۔۔''

جس انجمن کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہو، اس کی تنظیم کا اللہ ہی مالک ہے۔ اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ حرکتیں انجمن کی تنظیم کے سلسلے میں بہت عام ہیں۔ شاید ان کے نزدیک یہ بھی ترقی پسندی ہے۔

پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کو چند افراد نے اپنی ملکیت بنا رکھا ہے جو اس حلقے میں شامل ہوگیا۔ وہ سب سے بڑا ترقی پسند ہے۔ اگر کسی کو ہندوستان کا سب سے بڑا شاعر سب سے بڑا افسانہ نگار یا سب سے بڑا نقاد ہونا ہے تو اسے کچھ لکھنے پڑھنے کی ضرورت نہیں ان حضرات کے حلقہ احباب میں داخل ہوجانا کافی ہے۔ اس کے بعد وہ جو تخلیق بھی پیش کریں گے وہ شاہکار ہوگی۔ دنیا کے ادبیات میں اس کی مثال نہیں مل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سکتی۔ دنیا جہان کی خوبیاں اس میں سمٹ کر آجائیں گی۔ یہ پارٹی بازی اور "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو والی خصوصیت انجمن کو زیب نہیں دیتی۔ اس کو بہر حال ختم ہونا چاہیے اور وہ اسی صورت سے ختم ہوسکتی ہے کہ انجمن کی تنظیم جمہوری اصولوں پر کی جائے۔ انتخابات ہر سال عمل میں آئیں۔ صدر اور سکرٹری باقاعدگی کے ساتھ انجمن کے کام کو چلانے کی کوشش کریں۔ انجمن کا علیحدہ ایک دفتر ہو جہاں سے بیٹھ کر شاخوں کی دیکھ بھال، اور دوسرے کام قاعدے کے ساتھ انجام دیئے جائیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو آج نہیں کل تحریک میں زوال کے آثار کا پیدا ہونا یقینی ہے۔

موجودہ زمانے میں ادب کی ترقی پسند تحریک بڑی ہی کٹھن راہوں سے گذر رہی ہے۔ کچھ تو یہ اندرونی خرابیاں ہیں جو اندر ہی اندر اس کو کھوکھلا کئے دے رہی ہیں۔ کچھ ان لوگوں کی مخالفت ہے جو ترقی پسند تحریک سے بدکتے ہیں اور کچھ آجکل کے بدلتے ہوئے خارجی حالات ہیں۔ جنہوں نے نہ صرف ادب اور ترقی پسندی بلکہ تہذیب، کلچر اور سماج کی عمارتوں تک کو ڈانواں ڈول کر دیا ہے۔

صورت حال یہ ہے کہ ملک کی تقسیم کے باعث ہماری سماجی زندگی دو حصوں میں بٹ گئی ہے۔ تقسیم کے سیاسی نتائج سے مجھے مطلب نہیں لیکن تہذیب اور کلچر کو اس تقسیم نے بری طرح زخمی کیا ہے۔ ایک ہی ملک کے رہنے والے ادیب ایک دوسرے کے لیے اجنبی بنا دیئے گئے ہیں۔ تقسیم جن اصولوں پر ہوئی ہے اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ دونوں مملکتوں میں احیائی رجحانات ۔۔۔ زور پکڑ رہے ہیں زندگی کے بنیادی موضوعات کی طرف سے جس نے توجہ کسی حد تک کم کر دی ہے۔ برخلاف اس کے اس صورتِ حال نے نفرت کے شعلوں کو ہوا دی ہے انجمن ترقی پسند مصنفین پر تحریک کی حیثیت سے تو ان حالات کا اثر نہیں ہوا ہے، البتہ افراد ان حالات کے اثرات سے نہیں بچ سکے ہیں۔ چنانچہ بعض ترقی پسند ادیبوں نے حالات کے ساتھ اپنے آپ کو بہا دیا ہے۔ وہ اب ترقی پسند نہیں رہے ہیں، انہوں نے فرقہ پرستی کی حلقہ بگوشی اختیار کر لی ہے۔ لیکن یہ ایسے ہی ادیب ہیں جن کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فطرت میں موقع پرستی ہے۔ابن الوقتی جن کی گھٹی میں پڑی ہے۔وہ ترقی پسند صرف اس وجہ سے ہوئے تھے کہ شاید اس تحریک میں شامل ہونے سے انہیں کچھ فائدہ ہو جائے۔لیکن ایسا نہ ہو سکا۔پس بدلتے ہوئے حالات نے ان کی ساری ترقی پسندی کو ہوا کر دیا اور یہ لوگ اپنی حکومتوں کی ہر بات کو سراہنے لگے۔انکی تعریفوں کے پل باندھ دیئے۔حالانکہ ان کی کارفرمائیوں سے کوئی باشعور فرد ناواقف نہیں۔مروجہ حکومتیں یہی چاہتی تھیں کہ ادیبوں اور فنکاروں کی طرف سے اس کی کوئی مخالفت نہ ہو۔۔یہی چیز انہیں زندہ رکھ سکتی تھی۔چنانچہ آج بھی ان کا یہی پروگرام ہے۔انہوں نے دیوِ استبداد کا روپ اختیار کر لیا ہے اور وہ سب کچھ ان کے ہاتھوں ہو رہا ہے جو آمریت کے سوا اور کسی سے ممکن نہیں۔بعض موقع پرست، تنگ خیال، جاہ طلب، خودغرض اور مطلبی ادیبوں سے وہ یہی کام لینے کے منصوبے باندھ رہی ہیں۔ترقی پسند تحریک کو ان کی مخالفت کرنا ہے کیونکہ صحت مند مخالفت ہی انہیں صحیح راستہ دکھا سکتی ہے۔لیکن یہ جمہوری اصول بھی انہیں پسند نہیں چنانچہ برعظیم میں آزادی تحریر و تقریر پابندیاں ہیں۔ادیبوں کے لیے طوق و سلاسل ہے۔زندانوں کے منہ کھول دیئے گئے ہیں۔اذیت پرستانہ ذہنیتوں نے تکلیف پہنچانے اور مظالم توڑنے کے نئے طریقے اختیار کئے ہیں۔غرض یہ کہ ترقی پسند ادیب اس وقت ایک مستقل کرب کے عالم میں زندگی کے دن گزار رہا ہے اور یہ ساری تکلیفیں اسے گوارا ہیں کیونکہ وہ انسانی زندگی میں عوامی اور انسانی اقدار کی روشنی دیکھنے کا خواہشمند ہے۔ترقی پسندوں کے لیے یہ وقت امتحان کا ہے۔لیکن یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ترقی پسندوں کے لیے تو تاریخ کا ہر زمانہ زندگی کا ہر دور ایک امتحان رہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند تحریک آج رجعت کی قوتوں سے برسرِ پیکار ہے۔ہر چند کہ تقسیم نے ہندوستان اور پاکستان کی انجمنوں کو بھی تقسیم کر دیا ہے لیکن ان دنوں کے دل ملے ہوئے ہیں، کیونکہ دونوں کا نصب العین انسانیت پرستی ہے۔محبت ہے، عوام کی بہتری ہے۔۔ابھی تک اس سلسلے میں کوئی عملی اقدام نہیں کیا گیا ہے۔دونوں جگہ کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انجمنیں علیحدہ علیحدہ کام کر رہی ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کو چاہیے کہ دونوں مملکتوں کے ترقی پسند ادیب اور فنکار کم از کم سال میں ایک بار ضرور کسی جگہ جمع ہو کر نئے پیدا ہونے والے تہذیبی اور ادبی مسائل پر تبادلہ خیال کرتے رہیں۔ اس قسم کی کانفرنسیں موجودہ حالات میں انسانی اقدار کو آگے بڑھانے میں بہت مفید ثابت ہوں گی اور علیحدگی کا وہ احساس جو دونوں ملکوں کے ترقی پسند ادیبوں میں موجود ہے، دور ہوتا جائے گا۔ اب تک انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف سے یہ تحریک اُٹھنی چاہیے تھی۔ اب تک رجعت پسندوں کو بتا دینا چاہیے تھا کہ ادب ہندوستانی یا پاکستانی نہیں ہوتا۔ انسانی ہوتا ہے۔ وہ آج تک انسانی رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ اس کو منزل کی طرف بڑھنا ہے، وہ بڑھتا جائے گا۔۔۔

ترقی پسند تحریک میں باوجود بہت سی خامیوں کے بے شمار خوبیاں ہیں۔ اس نے ہماری زندگی، ہماری تہذیب، ہمارے کلچر، ہمارے ادب اور ہمارے سماج کو ایسی منزلوں سے روشناس کیا ہے جو ستاروں سے بھی آگے ہیں اور ہمارے فکر و عمل کے دامنوں میں ایسی بجلیاں بھر دی ہیں جن کا بسیرا آسمانوں کی پہنائیوں سے پرے ہے۔ ع

ستارے جس کی گردِ راہ ہیں وہ کارواں یہ ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اشتراکیت اور ترقی پسند تحریک

ڈاکٹر عارف ثاقب

۱۹۱۷ء میں انقلابِ روس کے بعد اشتراکیت ایک عالمگیر تحریک بن کر ظاہر ہوئی۔ کارل مارکس اور اینگلز نے تمام علمی وسائل سے مستفیض ہو کر علم کی تخلیقی سطح پر نظریہ اشتراکیت کی تشکیل کی، اور سیاسی تحریک کا بھی آغاز کیا۔ روس کی بڑھتی ہوئی ہمہ گیر ترقی سے متاثر ہو کر ہندوستان میں سوشلسٹ پارٹی اور کمیونسٹ پارٹی وجود میں آئیں۔ اشتراکیت کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ انسانی تاریخ معاشی نظام اور اس کے متعلقات کی داستان ہے۔ برسر اقتدار طبقہ ہمیشہ دولت اور اس کی پیداوار کے وسائل پر قابض رہا ہے۔ وہی کسی ملک کا دستور، سماجی اور معاشی ادارے اور ثقافت کا ڈھانچہ تیار کرتا ہے۔ اسی سے تاریخ کا رُخ متعین ہوتا ہے اور اسی وجہ سے ایک ملک کے لوگ مختلف طبقات میں تقسیم رہے ہیں۔ جاگیردرانہ اور سرمایہ دارانہ نظام انسان کی تمام محرومیوں اور دکھوں کا باعث ہے۔ اس لیے کہ یہ عوام کے ایک بہت بڑے طبقے کو بنیادی ضروریاتِ زندگی سے بھی محروم کر دیتا ہے۔ انسانی سماج میں انصاف قائم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ زمین مختلف صنعتوں اور دیگر وسائل دولت کو قومی ملکیت میں لیا جائے اور ایک ایسا نظام تشکیل دیا جائے جہاں کاشتکاروں اور مزدوروں کو دیگر کارکنوں اور منتظمین کے ساتھ مساوی حقوق حاصل ہوں۔ اس طرح پیداوار کا زائد منافع سب میں مساوی تقسیم ہو کر معاشی نظام میں کم و بیش مساوات قائم کر سکتا ہے۔ جبکہ سرمایہ دارانہ نظام میں یہ زائد منافع صنعت کاروں اور ان کے ذریعے حکمران طبقے کا حصہ بن کر رہ جاتا ہے اشتراکی معاشرے کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر ایک شخص کی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جائے۔ چونکہ ریاست ہر فرد کی بہبود کی ذمہ دار ہے، اس لیے اس سے اس کی صلاحیتوں کے مطابق کام لیا جائے اور اس کی ضروریات کے اسے دیا جائے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اشتراکی نظریہ ایک غیر طبقاتی سماج کا قصور پیش کرتا ہے اور ایک ایسے صالح معاشرے کی تخلیق کرتا ہے جس کی اساس آدمیت اور احترام انسان کے اصول پر ہے اور اس کا مقصد ہر شخص کو کم از کم قابلِ قبول معیارِ زندگی مہیا کرنا ہے۔ چنانچہ انہی روشن پہلوؤں اور ایک خوش آئند مستقبل کی نوید کی بنیاد پر یہ نظریہ ہندوستانی معاشرے میں بہت مقبول ہوا۔ جہاں لوگوں کو سیاسی ذلت اور اقتصادی زبوں حالی کے مسائل درپیش تھے اور طبقاتی کشمکش عروج پر تھی۔ مارکس کے نظریات کو نہ صرف پسماندہ ملکوں میں پذیرائی حاصل ہوئی بلکہ اس کے علمی اور سیاسی ڈانڈے یورپ کے تمام ترقی پسند فکر سے ملتے ہیں۔ ان نظریات کو فرانسیسی مفکرین روسو، والـــنیـــئر، ہونج کے انقلابی خیالات اور ولیم گوڈون، ٹامس پین، کارلائل، رسکن اور میتھیو آرنلڈ کے فکری نظریات سے مربوط کر کے دیکھا جا سکتا ہے۔

مارکس کی اشتراکی تعلیمات نے معاشی فلسفے کو عام کرنے کے ساتھ ساتھ ادبی اقتدار کو بھی ایک نیا زاویہ بخشا اور ادب کو خواص کی سطح سے عوام کی سطح پر لانے کی کوشش کی۔ یہی نظریات اشتراکی حقیقت نگاری کی بنیاد بنے۔ جس نے خارجیت اور سماجی شعور کی راہ ہموار کی۔ انگریزی ادب میں مارکس کی حقیقت پسندی اور خارجیت اس حد تک کامیاب نہ ہو سکی جس حد تک وہ روس اور یورپ کے دوسرے ممالک میں ہوئی۔ تاہم

"برنارڈ شا، ایچ جی ویلز اور گالزوردی کے یہاں جو اشتراکی عناصر ملتے ہیں ان کا پتہ یہیں ملتا ہے۔" [۱۲]

مارکس کے حامیوں نے فکری اور علمی زندگی کو براہ راست سماجی حالات و اسباب اور پیداوار اور تقسیم کے ذرائع سے وابستہ قرار دیا اور ادب برائے زندگی کے تصور کی منضبط اور واضح طور پر تحریک و تلقین شروع کی۔ اشتراکی حقیقت نگاری جن اصولوں پر قائم ہوئی ان میں

"واقعات اور انسانوں کو خارجی نقطۂ نظر سے من و عن پیش

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرنا اوران کے پسِ پردہ وہ عوامل کا انکشاف کرنا تھا تا کہ اس تجزیے سے یہ معلوم ہو سکے کہ یہ نظریات کس حد تک جدلیاتی نظریہ تاریخ کے مطابق ہیں۔اس سے یہ اندازہ کرنے میں مدد ملتی ہے کہ طبقاتی کشمکش کو اس کے صحیح سیاق وسباق میں کس طرح پیش کیا جا سکتا ہے، اور سماجی شعور کو کسطرح بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق ادب سماجی ترقی کا آلۂ کار ہے اور ایک صالح معاشرے کے قیام میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ یہ ادب غیر ضروری داخلیت، رومانیت اور توہم پرستی کو رد کرتا ہے، نیز یہ کہ نئی تکنیک، نئے مواد کی روشنی میں ادب کی تخلیق ہو سکتی ہے۔ مگر اس سے ابلاغ کی صحت اور صفائی پر زد نہیں پڑنی چاہیے۔ تکنیک کو اولین حیثیت نہیں دی جا سکتی، کیونکہ مواد اور تخلیق کی ہم آہنگی کا مقصد ابلاغ ہے جو ایک سچے پرولتاری ادب کے لیے ضروری ہے"۔ [۱۳]

۱۹۳۶ء میں جب انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی گئی تو درج بالا اصول ہی اس کے بنیادی مقاصد قرار پائے۔ تاہم انجمن نے اپنے منشور میں اشتراکیت کے سیاسی نظریے کی اشاعت کا فرض اپنے ذمے نہیں لیا بلکہ جمہوریت، انسان دوستی، قومی اور وطنی مسائل پر مختلف سیاسی اور سماجی نظریوں سے تعلق رکھنے والے دانشوروں اور ادیبوں کو ایک محاذ پر یکجا کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں سجاد ظہیر (۱۹۱۳ء۔۱۹۷۳ء) کی یہ سطور قابل توجہ ہیں:

جب ہم نے ترقی پسند ادبی تحریک کی تنظیم کی جانب قدم اٹھایا تو چند باتیں خصوصیت کے ساتھ ہمارے سامنے تھیں۔ پہلے تو یہ کہ ترقی پسند ادبی تحریک کا رخ ملک کے عوام کی جانب مزدوروں، کسانوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عوامل کا انکشاف کرنا تھا تاکہ اس تجزیے سے یہ معلوم ہو سکے کہ یہ نظریات کس حد تک جدلیاتی نظریہ تاریخ کے مطابق ہیں۔اس سے یہ اندازہ کرنے میں مدد ملتی ہے کہ طبقاتی کشمکش کو اس کے صحیح سیاق وسباق میں کس طرح پیش کیا جاسکتا ہے،اور سماجی شعور کوکسطرح بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔اس نقطۂ نظر کے مطابق ادب سماجی ترقی کا آلۂ کار ہے اور ایک صالح معاشرے کے قیام میں معاون ثابت ہوتا ہے۔یہ ادب غیر ضروری داخلیت،رومانیت اور توہم پرستی کو رد کرتا ہے،نیز یہ کہ نئی تکنیک ،نئے مواد کی روشنی میں ادب کی تخلیق ہوسکتی ہے۔مگر اس سے ابلاغ کی صحت اور صفائی پر زد نہیں پڑنی چاہیے۔تکنیک کو اولین حیثیت نہیں دی جاسکتی،کیونکہ مواد اور تخلیق کی ہم آہنگی کا مقصد ابلاغ ہے جو ایک سچے پرولتاری ادب کے لیے ضروری ہے"۔ [۱۳]

۱۹۳۶ء میں جب انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی گئی تو درج بالا اصول ہی اس کے بنیاد مقاصد قرار پائے۔تاہم انجمن نے اپنے منشور میں اشتراکیت کے سیاسی نظریے کی اشاعت کا فرض اپنے ذمے نہیں لیا بلکہ جمہوریت،انسان دوستی،قومی اور وطنی مسائل پر مختلف سیاسی اور سماجی نظریوں سے تعلق رکھنے والے دانشوروں اور ادیبوں کو ایک محاذ پر یکجا کرنے کی کوشش کی۔اس سلسلے میں سجاد ظہیر (۱۹۱۳ء۔۱۹۷۳ء کی یہ سطور قابل توجہ ہیں:

جب ہم نے ترقی پسند ادبی تحریک کی تنظیم کی جانب قدم اٹھایا تو چند باتیں خصوصیت کے ساتھ ہمارے سامنے تھیں۔پہلے تو یہ کہ ترقی پسند ادبی تحریک کا رخ ملک کے عوام کی جانب مزدوروں ،کسانوں اور درمیانہ طبقے کی جانب ہونا چاہیے۔ان کو لوٹنے والوں اور ظلم کرنے والوں کی مخالفت کرنا،اپنی ادبی کاوش سے عوام میں شعور،حس حرکت،جوش عمل اور اتحاد پیدا کرنا اور تمام ان آثار اور رجحانات کی مخالفت کرنا جو جمود،رجعت اور پست ہمتی پیدا کرتے ہیں،ہمارا اولین فرض ٹھہرا۔اسی سے پھر دوسری بات نکلتی تھی کہ یہ سب کچھ اسی صورت میں ممکن تھا جب ہم شعوری طور پر اپنے وطن کی آزادی کی جدوجہد اور وطن کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عوام کی حالت سدھارنے کی تحریکوں میں حصہ لیں۔ صرف دور کے تماشائی نہ ہوں کہ بلکہ حتیٰ المقدور اپنی صلاحیتوں کے مطابق آزادی کی فوج کے سپاہی بنیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ادیب لازمی طور پر سیاسی کارکن بھی بنیں لیکن اس کے یہ معنی ضرور ہیں کہ وہ سیاست سے کنارہ کش بھی نہیں ہو سکتے۔ ترقی پسند ادیب کے دل میں نوانسانی سے انس اور گہری ہمدری ضروری ہے۔ بغیر انسان دوستی آزادی خواہی اور جمہوریت پسندی کے ترقی پسند ادیب ہونا ممکن نہیں۔" ۱۴

در بالا سطور سے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی امر مانع نہیں کہ ترقی پسند تحریک کا اصل رخ سماج کی طرف تھا اور ادیبوں کو کسی سیاسی نظریے کا آلۂ کار بننے پر مجبور نہیں کیا گیا۔ اختر حسین رائے پوری نے اس کی وضاحت بھارتیہ ساہیہ پرشد (ناگپور) کے ایک اجلاس میں اعلان نامے کی صورت میں کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

ادب کے مسائل کو زندگی کے دوسرے مسائل سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ زندگی ایک مکمل اکائی کی صورت میں ہے اور اسے ادب، فلسفہ اور سیاست کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۵

لیکن اس کے باوجود ادیبوں سے یہ تقاضا بھی نہیں کیا گیا کہ وہ اپنی سماجی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے سیاست سے دامن بچائیں۔ گویا سیاست اور ادب کو ایک ساتھ چلانے میں کوئی حرج نہیں سمجھا گیا۔ تاہم یہ بات طے تھی کہ ادب کا مقام سیاست سے بالاتر ہے۔ کیونکہ ادب کا تعلق اجتماعی زندگی ہی سے نہیں بلکہ فرد کے داخلی جذبات سے بھی ہے۔ ترقی پسند تحریک نے فرد کے داخلی جذبات کو قابل اعتنا نہیں گردانا، کیونکہ اس کے سامنے اصل مقصد (جیسا کہ سجاد ظہیر کی درج بالا سطور سے ظاہر ہے) ملک کے مجبور و مقہور عوام کو استحصال پسندوں سے بچانا تھا۔ اس کے ہاں ادب کی اقدار ایک اضافی حیثیت رکھتی تھیں۔ کیونکہ زندگی کی طرح ادب میں بھی اقدار ابدی نہیں ہوتیں۔ زمانہ بدلنے کے ساتھ جب غور و فکر اور سوچنے سمجھنے کے سانچے بدلتے ہیں تو ادب کا لب و لہجہ اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیدا کر سکے۔ انہوں نے اپنے خیالات و جذبات کو مخصوص موضوعات کے سہارے ظاہر کرنے کے بجائے واردات کی شکل میں ذاتی تجربہ بنا کر پیش کیا اور براہ راست خطیبانہ طریقے کے بجائے مختلف تکنیک اور ڈکشن کے تجربے کیے۔

سوم: وہ ادیب جن کے سامنے سماجی تبدیلی کی کوئی واضح سمت تو نہیں تھی مگر سماجی تبدیلی کی زبردست خواہش اور موجودہ صورتحال سے بے پناہ نفرت کا جذبہ موجود تھا۔ وہ بت شکن تھے مگر نئے یقین اور اعتماد کی روشنی ان کے سامنے نہیں تھی۔

چہارم: وہ ادیب جو بڑی چالاکی سے اس صورتحال سے فائدہ اٹھا کر حال کی بے اطمینانی کے راستے راجعت پسندانہ نظریات کی طرف نئی نسل کو کھینچ لانا چاہتے تھے۔ وہ انسانی ترقی کی ناکامیوں کا ذکر تو بڑے طمطراق سے کرتے تھے، لیکن اس کے کارناموں کو بڑا معمولی اور غیر اہم بنا کر پیش کرتے تھے۔ [۱۶]

غور کیا جائے تو ترقی پسند تحریک کے بنیادی مقاصد سے وابستہ ہوتے ہوئے اس میں شامل ادیبوں نے ایک سمت بڑھنے کے بجائے اپنے لیے الگ الگ راہیں استوار کر لیں۔ اس سے ترقی پسند تحریک کے جمہوری مزاج کو تو فائدہ پہنچا، لیکن اس مرکزیت کو نقصان اٹھانا پڑا جو کسی تحریک کی کامیابی کے لیے بہت ضروری ہوتی ہے۔ تاہم مطمع نظر ایک ہونے کی وجہ سے یہ تحریک فکری سطح پر پروان چڑھتی رہی اور بیسویں صدی کے نصف آخر کے جدید ادب پر اپنے گہرے اثرات کی بدولت زندہ رہی۔

اس صورتحال کی وضاحت ''نقوش'' کے درج ذیل اداریے سے ہوتی ہے:

''جب اول اول ادب میں ترقی پسندی کی تحریک چلی تو ہر اس شخص کو ترقی پسند سمجھا جانے لگا جس نے کوئی بات کہہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دی۔ دراصل ترقی پسند تحریک کے اغراض و مقاصد واضح صورت
میں ہمارے سامنے نہیں آئے تھے اور تحریک کے نصب العین کو
اس صورت میں کسی نقاد نے نہیں پرکھا تھا کہ خطرناک حد تک
ناخلیت پسند ادیبوں کی نفسیاتی موشگافیاں اور انفرادیت پسند
فنکاروں کو بوالعجبیاں بے نقاب ہو سکتیں۔ یہی وجہ تھی کہ ترقی
پسندوں کی صفوں میں ایسے لوگ گھس آئے جو تحریک کی عالمگیر
اپیل سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔۔۔ حد یہ ہے کہ جدید
ادب کے نام پر فرائیڈ کے مرید اور فحش نگار بھی ترقی پسندوں میں
جوق در جوق شامل ہو گئے اور ترقی پسند نقادوں نے انہیں محض اس
لیے سراہا کہ انہوں نے فن پاروں کی ہیت اور اسلوب میں چند
تبدیلیاں کی تھیں''۔ ۱۷

درج بالا اقتباس جہاں دوٹوک انداز میں ترقی پسند تحریک کے حقیقی مقاصد کی
نشاندہی کرتا ہے وہاں اس میں یہ اعتراف بھی موجود ہے کہ ابتداء میں تحریک کے یہ حقیقی
مقاصد واضح صورت میں سامنے نہیں آ سکے۔ جن کی وجہ سے ہر وہ ادیب جو خود کو جدت
پسند کہتا یا کہلواتا تھا، اس تحریک میں شامل ہو گیا اور اس کے انفرادی رویوں نے اس تحریک
کے اصلی مقاصد کو پس پشت ڈال دیا۔ اس سے ایک اور نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ ترقی پسند زندگی
کے جس ہمہ گیر شعور کا اظہار ادب میں کرنا چاہتے تھے اس کی جڑیں اشتراکیت کے سیاسی
تصور اور مقاصد میں پیوست تھیں۔ گویا جدت پسند ہونا ترقی پسندی کا معیار نہیں ٹھہرا بلکہ
اشتراکی حقیقت نگاری کی روشنی میں جمالیات کے ایک افادی تصور کی بنیاد پر حدود قائم
کرنے اور زور دیا گیا اور ہر وہ تجربہ جو ان حدود سے متجاوز تھا، اسے کلیتہً مسترد کر دیا گیا۔
اشتراکی حقیقت نگاری کے حوالے سے ترقی پسندوں کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ادب
میں اصل چیز موضوع اور مواد ہے۔ نت نئے اسلوبوں کی تلاش درحقیقت ایک طرح کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خود پرستی اور انفرادیت پسندی ہے جو اصل مقصد کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ لہٰذا ادب کے مسلمہ اصولوں تک محدود رہ کر ترقی پسندانہ خیالات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کا فرض ادا کرنا چاہیے۔ اگر ادیب اسلوب و ہیئت میں جدت طرازی کی راہ اختیار کرے گا تو قاری موضوع اور خیالات کے بجائے فارم اور ہیئت کی پیچیدگی میں الجھ کر رہ جائے گا اور ادب اپنے اصل مقصد سے دور جا پڑے گا۔ جن ادیبوں نے اس پابندی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، ان کا موقف یہ تھا کہ موضوع اور فن کے درمیان ایک گہرا تعلق ہے اور کسی بھی فن پارے کی کامیابی کے لیے فنی اقتدار کا احترام ضروری ہے۔ اس سلسلے میں مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں:

> ''حسن کار کی اپنی شخصیت اگر اس کے کام میں نہیں جھلکتی تو یہ شدید نقص ہے۔ جہاں تک ادب غایتی ہے وہاں تک اس کا تعلق اجتماعی ذہنیت اور معاشرتی میلانات سے ہے، لیکن اس کا جمالیاتی پہلو یقیناً ادیب کی انفرادیت کا مرہون منت ہے۔'' [۱۸]

محمد حسن لکھتے ہیں:

> ''جذبے کے بجائے فکر محض کے رواج کا لازمی نتیجہ تھا کہ شاعر فرد کی داخلی زندگی اور اس کی عام انسانی قدروں پر غور کرنے کے بجائے اسے محض ایک مظہر اور ایک طبقاتی ٹائپ کی طرح دیکھنے لگا۔ وہ اعلیٰ انسانی قدر جو ادب کے دوام کی ضامن ہے، فوت ہوگئی۔ ترقی پسندوں کے ذہن میں انسان، انسان ہونے کی بجائے کسی نہ کسی طبقے کا نمائندہ تھا۔ کسی نظام کی علامت تھا یا کسی نظریے کی تمثیل۔ اس طرح ترقی پسندی نے ادیب کی نگاہوں کو محض ایک فلسفے کی طرف کھینچ لیا اور ان کے کردار شاعری، الفاظ اور جذبات محض ایک اصول کو ثابت کرنے اور اسی ایک فلسفے کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مختلف طرز سے دہرانے تک محدود ہو کر رہ گئے۔ اسطرح انفرادیت پسندی کے ساتھ ترقی پسندی نے داخلی آزادمندی، جذبے اور خلوص کی آگ اور فکر کے تنوع اور اسلوب کے حسن کو بھی مٹا دیا۔ [۱۹]

ڈاکٹر شارب ردولوی نے مواد، ہیت اور دیگر حوالوں سے انتہا پسندی کو ترقی پسند تحریک کے لیے نقصان دہ تصور کیا۔ ترقی پسند تحریک نے اپنے نظریات کی بنیاد جدلیاتی مادیت پر رکھی تھی لیکن وہی جدلیت انتہا پسندی کا شکار ہو کر اس تحریک کے نقصان کا باعث بنی وہ لکھتے ہیں:

"تحریک کے ابتدائی زمانے اور اس صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی میں بعض جوشیلے ترقی پسند ادیبوں اور ناقدوں نے جدلیاتی مادیت، مواد، ہیت، ادب اور حقیقت نگاری عوامی زبان اور ادب ماضی کا ادب عالیہ انقلاب سماج اور سماجی حقیقت نگاری کی تفسیر و تعبیر میں شدت اور انتہا پسندی کا مظاہرہ کیا۔ اس صورتحال کی مدت کتنی ہی مختصر کیوں نہ رہی ہو لیکن اس سے ترقی پسند تحریک کو نقصان ہوا۔ ترقی پسند نقطۂ نظر کی بنیاد جدلیت پر ہے اور جدلیت میں انتہا پسندی کی کوئی گنجائش نہیں۔" [۲۰]

ان اقتباسات کے تناظر میں یہ بات بخوبی سمجھی جا سکتی ہے کہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ وہ ادیب بھی، جن کے لیے یہ تحریک ایک ذاتی تجربہ تھی، یہ بات قبول کرنے کو تیار نہ تھے کہ ادب کو محدود کر کے اس کا رشتہ اسلوب، ہیت اور داخلی تجربات سے توڑ دیا جائے۔ ادب کو محض موضوع اور مواد کے خانے میں رکھ کر تعلیم تو دی جا سکتی ہے یا خاص نظریات کے حوالے سے اطلاع تو فراہم کی جا سکتی ہے، لیکن یہ عمل کسی طرح کی جذبہ خیزی کو پروان نہیں چڑھا سکتا۔ اس صورت میں ادب تخلیقی نہیں بلکہ "تشکیلی" قرار پاتا ہے۔"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس اصول کی رو سے ترقی پسندوں کے جدیدت کے نظریے پر بھی زد پڑتی ہے۔ کیونکہ جدیدیت اجتماعی نتائج پر انفرادی نتائج کی فوقیت تسلیم کرتی ہے اور تخلیقی عمل کی پیچیدگیوں اور ابہام کے پیش نظر شعری اظہار کی عدم قطعیت اور حجاب آمیزی کو فطری سمجھتی ہے اور اشتراکی حقیقت نگاری کے برعکس معینہ مقاصد اور نتائج کی شاعری کی تائید نہیں کرتی۔ تاہم ان حقائق کے باوجود بیشتر ترقی پسند ادیبوں نے اس بات کو تسلیم نہیں کیا اور یہ اصرار کیا کہ مواد کو ہیت پر فوقیت حاصل ہے۔ اس سلسلے میں سید احتشام حسین لکھتے ہیں:

> ''ترقی پسند ادب کا زاویہ نظر مواد اور ہیت کے تعلق کے بارے میں بہت واضح ہے۔ وہ تمام نقاد اور شعراء جو زندگی کو نامیاتی مانتے ہیں، جو مقدار سے خصوصیتوں کے بدلنے کے قائل ہیں، جو شاعری کو زندگی کا مظہر مانتے ہیں، جو ادب کو سماجی ترقی کا ایک آلہ سمجھتے ہیں اور جو تمدن کو عام کرنا فنون لطیفہ کو عوام کی چیز بنانا چاہتے ہیں وہ کسی بھی حالت میں ہیت و اسلوب کو مواد پر اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔'' ۲۱

اس بات کی تائید میں دیگر ترقی پسند ادیبوں کی تحریریں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر عبدالعلیم لکھتے ہیں:

> ''ترقی پسند ادیبوں کے نزدیک اسلوب اور طرز ادا کے سوال کو لازمی طور پر ثانوی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔ ان کے لیے مقدم سوال موضوع کا ہے۔ اگر وہ اپنے خیالات کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانا چاہتے ہیں تو ان کو چاہیے کہ ادب کے مسلمہ اصولوں کو اس وقت تک ترک نہ کریں جب تک وہ بالکل ناموزوں نہ ثابت ہو جائیں۔۔۔ نت نئے اسلوبوں کی تلاش

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

در حقیقت ایک طرح کی خود پرستی اور انفرادیت پسندی ہے جس سے ترقی پسند ادیب کو احتراز لازم ہے۔ اس لیے کہ اس کے لیے ادب مقصود بالذات نہیں، بلکہ سماجی ضرورتوں کو پورا کرنے کا ایک آلہ ہے۔" ۲۲

اسی طرح علی سردار جعفری لکھتے ہیں:

"موضوع کو خارج کر کے ادب کو حسین نہیں کیا جا سکتا۔ ادب کا حسن بڑی حد تک اپنے موضوع کا مرہون منت ہے۔" ۲۳

یہ ساری بحث ادب کے بارے میں ان متضاد خیالات اور رجحانات کو سامنے لاتی ہے جو ترقی پسند تحریک کے نام لیواؤں کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ چنانچہ ادبی حوالے سے ترقی پسندوں کے ہاں نظریاتی وحدت اور توازن فکر کا فقدان نظر آتا ہے۔ جس کی نشاندہی خود تحریک کے کارپردازان کی تحریروں سے ہوتی ہے۔

ترقی پسند تحریک دیگر حلقوں کی جانب سے کیے جانے والے اعتراضات اور ترقی پسندوں کی طرف سے ان کے جوابات ایک طویل بحث کے متقاضی ہیں اور یہاں اس کی گنجائش نہیں۔ ترقی پسند تحریک کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے نئے ادبی اور سماجی طرز احساس کو جنم دیا۔ جس نے ادب کے سکون و جمود کو ختم کر کے ایک نئی زندگی کی لہر دوڑا دی اور اس بے حسی اور خواب آور کیفیت کو ختم کرنے کی کوشش کی جو ایک عرصہ سے ذہنوں پر مسلط تھی۔ علی سردار جعفری، ترقی پسند تحریک کے کارنامے گنواتے ہوئے ایک طویل فہرست پیش کرتے ہیں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے:

۱: ترقی پسند تحریک نے ادب کے فرسودہ ساختی ڈھانچے کو توڑ دیا اور اس جھوٹے تصور کو ختم کر دیا کہ ادب کا مقصد محض تفریح ہے جو مٹھی بھر پیٹ بھرے آدمیوں کی لطف اندوزی کے لیے تخلیق کیا جاتا ہے۔

۲: اس ادب نے مزدوروں، کسانوں اور مظلوم درمیانی طبقے کی زندگی اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسائل کو اپنا موضوع بنایا اور حقیقت نگاری کی بنیادیں استوار کیں۔

۳: اس نے عقل پسندی کو مذہبی تصورات سے، حب وطن کو ماضی پرستی سے، آزادی کے تصور کو طبقاتی کوڑھ سے اور سامراج دشمنی کو سمجھوتے بازی کی آلائشوں سے پاک کیا اور ایسے ادب کی تخلیق کی جس کا بہترین جوہر طبقاتی شعور اور عوام دوستی ہے۔

۴: اس نے سامراجی اور جاگیر دار عناصر کی مخالفت کی اور ان قدروں کو نفرت و حقارت سے ٹھکرایا جو ان کے مکتب خیال سے پیدا ہوئی ہیں اور ان کے مقابلے میں اعلیٰ درجے کی انسانی قدریں پیش کیں۔

۵: اس نے ادب کے ذریعے اس غیر منصفانہ سماج کو تبدیل کرنے کا جذبہ پیدا کیا اور انقلاب کی دعوت دی۔ حالانکہ ابتداء میں بعض ترقی پسند ادیبوں کا انقلاب کا تصور جذباتی اور روحانی تھا وہ طبقات ان کی کشمکش اور اہمیت کو پورے طور پر نہیں سمجھتے تھے پھر بھی یہ اتنی بڑی سچائی تھی کہ انقلاب کا نعرہ اُردو ادب پر چھا گیا۔

۶: اس نے اُردو ادب میں طبقاتی شعور بیدار کیا اور ایک غیر جانبدار طبقاتی انسانی سماج کا خواب دیکھا۔ قومیت کے تنگ دائرے سے نکل کر بین الاقوامیت کے تصور کو فروغ دیا اور دنیا کے ہر گوشے کی آزادی کی تصویر دیکھی۔ اس نے ادیبوں کے نقطۂ نظر میں اتنی وسعت اور تخیل میں اتنی بلندی پیدا کر دی جس سے اُردو ادب پہلے واقف نہ تھا۔

۷: اس نے اُردو ادب کو ادب نواز حلقوں کے چھوٹے سے دائرے سے باہر نکل کر عوام کے وسیع حلقوں میں پہنچا دیا۔

۸: ترقی پسند مصنفین نے ادبی اور بول چال کی زبان کی خلیج کو کم کر کے زبان کو سادہ اور آسان بنایا۔ محض روایتی اور فرسودہ انداز بیان کو ترک کر کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سیدھا سادھا نیا اور شگفتہ اندازِ بیان اختیار کیا بہت سے نئے الفاظ کو ادبی زبان میں داخل کر دیا اور زندگی اور سماج کی نئی حقیقتوں سے تشبیہ اور استعارے حاصل کر کے اُردو کے ادبی اور فنی خزانے میں اضافہ کیا اور زبان میں اظہار اور بیان کے نئے امکانات پیدا کیے۔

۹: اُردو ادب میں نئی اصناف اور نئی ہیئتیں رائج کر کے فنی خزانے میں اضافے کیے گئے۔ شاعری میں پرانی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے نئی روایات پیدا کیں۔ آزاد نظم اور نظم معرا کو رواج دے کر اُردو شاعری کو وسعت عطا کی۔ غزل کو سماجی تصور اور عوامی جدو جہد کا موضوع عطا کر کے وسعت دی نثر میں رپورتاژ کی صنف کو رائج کیا افسانے کی موضوع کو وسعت اور ٹیکنیک کو ترقی دی۔

۱۰: نئی قسم کی علمی تنقید پیدا کی۔ جس کی بنیاد یہ ہے کہ ادب کا جائزہ سماجی، سیاسی اور تاریخی پس منظر میں لیا جائے۔ تنقید کی سطح کو بلند کیا، اور تنقید کے فن کو سائنس بنا دیا۔ یہ تنقیدی انداز اُردو ادب میں ایک انقلاب کی حیثیت رکھتا ہے۔" [۲۴]

درج بالا نکات کی روشنی میں ترقی پسند تحریک کے دائرۂ عمل اور ادب پر اس کے اثرات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ تحریک بڑی توانا اور طاقتور تحریک تھی جس نے ان ذہنی رویوں کو بدلنے کی کوشش کی جو اس سے پیشتر رواج پذیر تھے اور یہ بات تو واضح ہے کہ اس تحریک نے ادب میں بے پناہ وسعت پیدا کر کے اس کی حدوں کو پھیلا دیا اور اس میں وہ تنوع اور گہرائی پیدا ہو گئی جو اس سے پہلے کے ادب میں اس انداز میں موجود نہ تھی۔

☆☆☆☆

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com
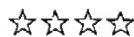
ترقی پسند ادبی تحریک۔ منظر پس منظر

ثاقب رزمی

انیسویں صدی میں سائنس کے عہد آفریں انکشافات ظہور پذیر ہوئے جنھوں نے انسانی فکر کے دھارے کو یکسر بدل دیا اور زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔اس ساری سائنسی ترقی کے نتیجے میں ۱۸۴۸ء میں کمیونسٹ مینی فیسٹو کی اشاعت نے افکار کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔اس مینی فیسٹو کے انقلابی نظریات نے ادب وفن کی دنیا میں بھی ایک تحرک پیدا کر دیا اور افقِ عالم پر ترقی پسند ادبی تحریک اُبھری اور برق رفتاری کے ساتھ عالمی ادب پر چھا گئی یہ تحریک اپنے مافیہ میں ایک بالکل نئی اور انقلابی تحریک تھی جس نے ادب کو فن کے پرانے تصورات کو تہ و بالا کر دیا ۱۹۱۷ء میں روس میں اشتراکی انقلاب کے ظہور نے ترقی پسند ادبی تحریک کو نئی زندگی بخشی اور اس کے لیے ایک ٹھوس بنیاد مہیا کر دی اس تحریک نے مارکسزم سے بہت روشنی حاصل کی۔مارکسزم ہی نے تاریخ میں پہلی دفعہ انسانی معاشرے میں جبر و استحصال کی قوتوں کے طبقاتی کردار کو واضح کیا۔ذہنوں میں سائنسی سطح پر طبقاتی شعور بیدار کیا اور عوامی جدوجہد کا راستہ دکھلایا۔

> ترقی پسند تحریک نے ادب کو زندگی کے مادی رشتوں سے منسلک کیا خالص داخلیت اور روحانی معاروئیت کے اثر سے آزاد کیا۔معاشی۔سماجی اور نفسیاتی مسائل کا ترجمان بنایا اور ادب میں نئے تجربوں کی راہیں کھولیں اس نے اپنی انقلابی رجائیت سے دنیا کے محنت کش عوام کو زندگی کا پیغام دیا اور انہیں استحصال، استحصالی قوتوں اور سامراج کے خلاف آواز اٹھانے کا حوصلہ دیا اس طرح عوام میں تاریخ میں پہلی بار واضح طور پر طبقاتی شعور پیدا کیا۔ترقی پسند ادبی تحریک نے زندگی کی بہتر خطوط پر تقلیب کی نوید دی اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عوامی جدو جہد کا احساس پیدا کیا اجتماعیت کے تصور کو ابھارا اور بتایا کہ استحصالی قوتیں ہی انسانی معاشرے میں عوام کی جہالت، بیماری، پسماندگی اور ناداری کی ذمہ دار ہیں ادب کو سماجی انقلاب کا ہتھیار ٹھہرایا۔ رومانیت کے ساتھ ساتھ سماجیت کے عنصر کو ابھارا۔ ترقی پسند حقیقت نگاری روشن خیالی اور خرد افروزی کو فروغ دیا مصنف کے تخیل کو ارضی رشتوں کا پابند کیا جمہوری اقتدار کا تحفظ کیا۔ انسانی معاشرے میں محنت کش عوام اور استحصالی قوتوں کے درمیان ہر لمحہ جاری جنگ کو خیر و شر کی جنگ قرار دیا اسے ذہنوں میں اجاگر کیا اور محنت کش عوام کو تاریخ کا معمار بتایا سب سے بڑھ کر ترقی پسند ادبی تحریک نے یہ کارنامہ سرانجام دیا کہ اس نے ادبی تنقید کو سائنسی بنیادوں پر استوار کیا اور اسے نئے سماجی تصورات اور علمی نظریات سے آشنا کیا۔ ۲۵

ترقی پسند مصنفین نے علمی طور پر بھی طبقاتی جدو جہد میں حصہ لیا اور چین کی خانہ جنگی میں عالمی بریگیڈ آتے رہے اور بہت سے ادیبوں اور شاعروں نے جامِ شہادت نوش کیا۔ ۲۶

ترقی پسند ادب کی خصوصیات: ترقی پسند ادب نے عالمی سطح پر انتہائی انقلابی کردار ادا کیا اور مصنفین کے سوچنے اور لکھنے کا انداز یکسر بدل دیا اور پہلی دفعہ ادب کو واضح طور پر معاشرے کی مادی زندگی کا ترجمان بنایا۔ ترقی پسندی کا رجحان ماضی کے عالمی ادب میں بھی پایا جاتا ہے لیکن اس میں طبقاتی شعور، دھندلکوں میں لپٹا ملتا ہے جبکہ بیسویں صدی کے ترقی پسند ادب میں طبقاتی شعور اپنی پوری وضاحت کے ساتھ ایک تاریخی مظہر کی شکل میں اُبھرا ہے جس کے سائنٹفک عناصر میں معاشرے کی بہتر خطوط پر تقلب کا فلسفہ اور تغیر و انقلاب کی ناگزیریت شامل ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترقی پسند نظریہ ادب کے نزدیک جس طرح زندگی تغیر پذیر اور تغیر آفریں ہے اسی طرح ترقی پسند ادب تغیر پذیر بھی ہے اور تغیر آفریں بھی وہ ترقی پسند ادب کو مقصود بالذات نہیں سمجھتا بلکہ زندگی کو بہتر خطوط پر بدلنے اور انسان میں جمہوری اقتدار تہذیب نفس اور فکری اور جذباتی ترفع پیدا کرنے کا سماجی ذریعہ تصور کرتا ہے، ترقی پسند ادب انسان میں جمہوریت، آزادی، مساوات اور امن کی آرزو بیدار کرتا ہے جو انفرادی اور اجتماعی طور پر معاشرے کو انسان دوست بناتی ہے وہ عوام میں طبقاتی شعور، احتجاج، تنقیدی بصیرت اور جدو جہد کا احساس پیدا کرتا ہے۔

ترقی پسند ادب کا دائرہ اثر : ترقی پسند ادب کا مواد محض سیاسی اور طبقاتی موضوعات تک محدود نہیں بلکہ اس میں زندگی کی دانش و فراست، لطیف جذبات، داخلی ترفع اور فطرت کی رنگینی کے تمام مضامین شامل ہیں۔ وہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھتا ہے اس کا دائرہ محدود نہیں بلکہ زندگی کی طرح لامحدود ہے۔

ترقی پسند ادب کے بنیادی عناصر : ترقی پسند ادب نظریہ ادب اپنی نظریاتی اساس کو ملحوظ رکھتے ہوئے زندگی کے تمام مضامین کا احاطہ کرتا ہے۔ ادب کی فنی قدروں کو بہت اہمیت دیتا ہے اور ہیت اور تکنیک کے تجربوں کو ادب کی بالیدگی کے لیے لابدی خیال کرتا ہے اس کے ساتھ ہی ترقی پسند نظریہ انسانیت کی بدحالی پر تاسف نہیں کرتا اور خود کو اس کی عکاسی تک محدود نہیں رکھتا بلکہ معاشرے کی انقلابی تشکیل کے لیے عوام میں طبقاتی شعور اور عوامی جد جہد کی انقلابی تشکیل کے لیے عوام میں طبقاتی شعور اور عوامی جدو جہد کی ضرورت کا احساس پیدا کرتا ہے۔

ترقی پسند ادب کی تحریک اور فیض : جب ۱۸۴۸ء میں کمیونسٹ ''مینی فسٹو'' شائع ہوا اور اس کے بعد کارل مارکس کی تصنیف ''داس کیپتیال'' چھپ گئی تو عالمی سطح پر ذہنوں میں ایک انقلاب آگیا اور ہر طرف مارکسزم اور سوشلزم کا چرچا ہونے لگا۔ اس نئے فلسفہ نے معاشرت۔ معیشت۔ علم وفسلفہ اور ادب وفن پر گہرے اثرات چھوڑے اور سماج کے ارتقاء

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے قوانین بنا کر تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ افتادگانِ خاک کو تاریخ میں پہلی دفعہ یہ نوید ملی کہ اب جہل و افلاس سے ان کی رہائی ناممکن نہیں رہی۔ اس فلسفہ کے زیر اثر ترقی پسند ادب کی ایک عالمی تحریک اُبھری اور جنگل کی آگ کی طرح تمام دنیا میں پھیل گئی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد برطانوی سامراج برصغیر پر پوری طرح مسلط ہو گیا اس وقت اُردو ادب کے تنزل کی یہ حالت تھی کہ شاعری محض سامانِ تفریح بن کر رہ گئی تھی علی گڑھ تحریک کے زیر اثر مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری اور مسدس حالی لکھ کر اس متبذل شاعری پر پہلی ضرب لگائی اور شاعری کا رجحان غزل سے ہٹا کر نظم نگاری کی طرف پھیرا۔ حالی نے صاف لفظوں میں کہا

حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

پھر دوسری ضرب کاری علامہ اقبال نے لگائی پہلے پہل اقبال یورپ کی رومانوی تحریک کے زیرِ اثر تھا لیکن سوویت اشتراکی انقلاب کے بعد اقبال ترقی پسند ادب کی عالمی تحریک کے زیرِ اثر آ گیا اور اس نے برصغیر میں پہلی دفعہ مزدور کو یہ پیغام دیا۔

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

امرتسر میں صاحبزادہ محمود الظفر اور ان کی اہلیہ ڈاکٹر رشید جہاں کے زیر اثر فیض نے مارکسزم پڑھا اور پھر اس نقطۂ نظر کا اتنا حامی ہوا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانیوں میں سے ایک ٹھہرا۔ برصغیر میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام کس طرح عمل میں آیا۔ اسے فیض اس طرح بیان کرتے ہیں۔

جمالیات : ترقی پسند نظریہ ادب کے مطابق جمالیات اپنے معروضی قوانین رکھتی ہے جس کا ماخذ فطرت اور انسانی معاشرہ ہیں اور حسن اپنی معروضی اور داخلی دونوں اشکال میں انسان کی شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے انسان کے جمالیاتی احساسات کی تجسیم فنونِ لطیفہ میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوتی ہے اور فنونِ لطیفہ انسان پر بڑی خاموشی سے اور نا معلوم طور پر جمالیاتی اور فکری اثرات مرتب کرتے ہیں یوں حسن انسان کے تہذیبی ترفع میں اپنا کردار ادا کرتا ہے اور اس کے سامنے ایک جمالیاتی آدرش لاتا ہے۔ جس کا منتہٰے انسان کی خارجی اور داخلی زندگی کو خوب سے خوب تر کی جانب لے جانا ہوتا ہے۔ ترقی پسند نظریہ ادب بتاتا ہے کہ فنکار کی حسِ جمال میں ایک حرکت اور انقلابی روح ہوتی ہے جو معاشرے کے ہر خارجی اور داخلی بدصورتی کو بھانپ لیتی ہے پھر فنکار زیادہ گہرائی میں اتر کر ان قوتوں کو معروضی طور پر محسوس کرتا ہے جو معاشرے کی بدصورتی کو جنم دیتی ہیں۔ جب فنکار اس حد تک وقوف حاصل کر لیتا ہے تو وہ ان قوتوں کو آشکار کرنا اپنا فریضہ سمجھ لیتا ہے۔ جمالیات ایک ایسا علم ہے جو حسن کو سماجی زندگی کے حوالے سے جانچتا ہے وہ زندگی کی اعلےٰ قدروں میں حسن کا متلاشی ہوتا ہے کیونکہ حسن زندگی کے پیکر ہی میں نمودار ہوتا ہے اور زندگی کے عام مفہوم کو سماجی زندگی سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ سماجی زندگی کی خوبصورتی اور بدصورتی خود انسان کی خوبصورتی اور بدصورتی کی جانب اشارہ کرتی ہے کیونکہ انسان خود معاشرے کا حصہ ہے اور مجموعی طور پر خود معاشرے کو تشکیل دیتا ہے ترقی پسند نظریہ کسی مجرد جمالیاتی قدر کا قائل نہیں ہے کیونکہ ایسی قدر مادی زندگی سے کٹ جاتی ہے اور فن برائے فن کے تصور کے لیے جواز پیدا کرتی ہے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انسانی معاشرے میں کوئی مجرد جمالیاتی قدر ممکن ہی نہیں کیونکہ جمال معروضی یا داخلی طور پر ایک شے ہی میں موجود ہو سکتا ہے۔

ادب کا جمالیاتی پہلو زندگی سے مجرد طور پر نہیں بلکہ سماجی طور پر تعلق رکھتا ہے کیونکہ انسان معاشرے کے حوالے ہی سے حسن آفرینی کرتا ہے اور حسن سے متاثر ہوتا ہے۔ اگر معاشرے میں حسن موجود نہیں تو انسان کی زندگی میں فرد کی حیثیت سے حسن پیدا نہیں ہو سکتا۔۔۔

جب حسن فن میں نمودار ہوتا ہے تو اس کا بنیادی کردار یہ ہوتا ہے کہ وہ انسانی معاشرے کی قباحتوں کو وجاہتوں میں بدلنے کا عظیم کردار ادا کرے کیونکہ حسن سب سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زیادہ اپنا اظہار ادب میں کرتا ہے اس لیے ادب اپنے جمالیاتی عمل سے انسانی معاشرے میں صداقت، خیر، انقلابی فکر و عمل اور رفعتِ اخلاق کی روشنی پیدا کرتا ہے حسن کا معیار ہمیشہ معاشرہ اور سماجی ماحول متعین کرتا ہے معیار کسی حالت میں بھی باطنی نہیں ہوسکتا ورنہ وہ معیاری نہ رہے گا۔

ترقی پسند نظریہ ادب نئی جمالیاتی اقدار کو جنم دیتا ہے جن کا ما بعد طبیعیاتی دھندلکے اور عینیت سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا بلکہ وہ راست طور پر انسانی زندگی کے خارجی اور داخلی پہلو سے متعلق ہوتی ہیں جو اپنا اظہار معاشرے کی بہتر تقلیب داخلی ترفع اور ہیت اور مواد کے حسین اور دلکش امتزاج میں کرتی ہیں۔۔۔

ترقی پسند نظریہ مسرت خیر اور اخلاقی رفعت کو حسن کے لاینفک اجزا تصور کرتا ہے اور یہ اقدار کسی تجریدی پیکر میں نہیں بلکہ مادی پیکر میں پائی جاتی ہیں کیونکہ ادب معاشرے کی مادی اور ذہنی زندگی ہی کو اپنا موضوع بناتا ہے اور مصنف سماجی زندگی میں خوب سے خوب تک پہنچتا ہے۔۔۔ترقی پسند نظریہ، جمالیات کو حرکت پیہم میں دیکھتا ہے اور بتاتا ہے کہ انسان اپنی زندگی کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے دنیا کو بدلتا رہا اور اس مسلسل جدوجہد میں اس کا جمالیاتی شعور پختہ سے پختہ تر ہوتا رہا اس طرح تدریجی طور پر انسان کی پیداواری سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ فنونِ لطیفہ کی نمو پذیری بھی ہوتی رہی۔

جمالیات کا فنونِ لطیفہ سے گہرا رشتہ اس لیے ہے کہ ان کا اہم ترین پہلو جمالیاتی پہلو ہے جس سے وہ انسان کے باطن کی گہرائیوں میں حسن پیدا کرتا ہے اور اس میں زیادہ نجیب زیادہ نرم دل اور زیادہ شائستہ بننے کی امنگ پیدا کرتا ہے۔

ادب اور زندگی : انسانی زندگی مسلسل تغیر پذیر رہتی ہے۔ ہر آن اس کی نئی شان ہوتی ہے۔ تغیر و حرکت اس کا دائمی پروسس ہے۔ زندگی کسی مقام پر قیام نہیں کرتی وہ ہمہ وقت عازمِ سفر رہتی ہے۔۔۔ترقی پسند نظریہ ادب اس ہر لحہ ارتقاء پذیر زندگی کی نمائندگی کرتا ہے کیونکہ ادب بیک وقت زندگی کا ترجمانی نقاد اور رہنما ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فنکار زندگی کی عکاسی پوری دیانت۔ خلوص۔ سنجیدگی اور گہرائی سے کرتا ہے تو وہ معاشرے کے معاشی پہلو سے اغماض نہیں کرسکتا اور نہ ان طاقتوں کو نظر انداز کرسکتا ہے جو عوام کی معاشی اور سماجی بدحالی کی ذمہ دار ہیں کیونکہ زندگی کے حقائق کے گہرے شعور سے فن میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے جو انسان کے باطن میں خوب تر کے احساس کی جوت جگاتی ہے اور زندگی کو خوب تر خوشحال تر اور ارفع بنانے کی امنگ بذاتِ خود ایک حُر کی مظہر ہے جس سے فن میں تحرک پیدا ہوتا ہے۔

ترقی پسند نظریہ ادب زندگی کے مسائل کو چند مسائل تک محدود نہیں کرتا بلکہ زندگی کے تمام مسائل کو اپنے دامن میں سمیٹتا ہے جن میں معاشی اور سیاسی مسائل نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اس لیے کہ معاشی اور سیاسی مسائل وہ بنیادی پتھر ہیں جن پر زندگی کی عمارت کھڑی ہے اس لیے ترقی پسند نظریہ انسان کی خارجی اور داخلی مسائل کو برابر کی اہمیت دیتا ہے۔

مصنف کی آزادی : ترقی پسند مصنف اپنے فن کے حوالے سے مکمل طور پر آزاد ہے کہ وہ زندگی کے ہر ارفع مضمون پر اظہار کرسکتا ہے اس پر صرف ایک قدغن ہے کہ وہ جس معاشرے میں رہتا ہے وہاں استحصالی قوتوں اور جدید نو آبادیاتی نظام کی ستم رانیوں۔ جبر و استحصال اور شاطرانہ ہتھکنڈوں کے خلاف عوام میں طبقاتی شعور پیدا کرے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ کسی پارٹی کے منشور کا پابند ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کے برعکس وہ اپنی تنقیدی دیانت اور بصیرت کا پابند ہے وہ ہر نئی تکنیک میں اپنے مواد کو ڈھالتا ہے اور بھرپور طور پر جدیدیت کا حامی ہے لیکن اس سے باوجود اس کا راستہ علیحدہ ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنی تحریروں میں کبھی ابہام پسندی کا شکار اور معاشرے کے سود و زیاں سے بالا نہیں ہوتا۔ اس کے نزدیک وہ تحریر جو قاری کے ذہن میں وضاحت اور روشنی پیدا نہیں کرتی بے سود ہے۔ ترقی پسند نظریہ ادب کے مطابق ادب کو جماعتی نقطۂ نظر کے تنگ دائرے میں محدود کرنا بذاتِ خود ایک رجعت پسندی ہے اس کا مطلب یہ ٹھہرتا ہے کہ مصنف کی ساری فطانت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور تخلیقی صلاحیت کو ایک محدود حلقے میں بند کر دیا جائے جو ادب کی نشوونما کے لیے ہر لحاظ سے مہلک ہے۔

ترقی پسند ادب آفاقیت کا قائل ہے بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں اشتراکی انقلاب نے سرمایہ داری نظام کے بھیانک چہرے پر سے نقاب اُلٹ دی اور بتایا کہ جب تک معاشرے میں جبر و استحصال کی قوتیں موجود ہیں سماجی قباحتیں دور نہیں ہو سکتیں ایسے نظام میں فرد مسابقت میں آزاد اور اپنی اصل جبلتوں کا محکوم رہتا ہے۔ادب اور فن کی دنیا میں مصنف بیگانگی ذات کا شکار ہو جاتا ہے، معاشرے سے بھاگ کر اپنی ذات میں پناہ گزیں ہو جاتا ہے اپنی تخلیقات میں مواد کی اہمیت کو نظر انداز کر کے ہیت اور تکنیک کے تجربوں میں کھو جاتا ہے اور جس متبذل موضوع پر چاہے لکھ سکتا ہے۔

اسی اثناء میں سامراجی قوتوں کے خلاف عوامی جدو جہد کا آغاز ہو چکا تھا اور عالمی سطح پر ترقی پسند ادبی تحریک اُبھر آئی تھی چنانچہ ادب میں ترقی پسند ادبی تحریک کی شکل میں ایک متحراب مکتبہ فکر قائم ہو گیا اور ترقی پسند مصنفین نے محنت کش عوام کو رجائیت اور سامراجی اور استحصالی قوتوں کے خلاف عوامی جدو جہد کے آغاز کا پیغام دیا۔

ترقی پسند ادب ایک نظریاتی ادب ہے، کیونکہ اس کی کمٹ منٹ معاشرے کی انقلابی اور عوامی قوتوں کے ساتھ ہوتی ہے جو معاشرے کو خوشحال، آزاد اور نیکو کار بنانے کے لیے استحصالی قوتوں اور نو آبادیاتی نظام سے نبرد آزما ہیں۔۔۔ترقی پسند نظریہ ادب کے مطابق ادبی اظہار کا مقصود زندگی کے ارفع مضامین کا ابلاغ ہے جو معاشرے کو بہتر خطوط پر بدلنے میں مدد دیں (لیکن کسی نہ کسی پہلو سے مصنف سیاست سے منسلک ہوگا) (ترقی پسند) مصنف سیاست سے کنارہ کش ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ سیاست انسانی زندگی کا جزو لا نیفک ہے اور معاشرے کے بالائی ڈھانچے کا ایک فعال حصہ ہے اگر سماجی نظام پر استحصالی طبقہ مسلط ہے تو معاشرے کی بہتر تقلیب کے لیے عوام میں طبقاتی شعور پیدا کرنا مصنف پر واجب ہو جاتا ہے، تجربہ کی صداقت کا معیار معروضی زندگی ہے۔اگر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معروضی زندگی میں کسی تجربہ کا نتیجہ معاشرے کی اجتماعی زندگی کے لیے فائدہ بخش ہے تو وہ تجربہ اپنے اندر صداقت رکھتا ہے۔ظاہر ہے کہ فکر کو اہمیت حاصل ہے کیونکہ فکر کے بغیر معاشرہ نہ تو اپنے حقائق کو معلوم کر سکتا ہے اور نہ ہی انہیں بدل سکتا ہے،موضوع حسیت سے خالص ادب جنم لیتا ہے واقعی زندگی میں معروضی حسیت اور فکر دونوں آپس میں مل کر چلتے ہیں۔

لہٰذا مصنف کا اعلیٰ منصب یہ ٹھہرا کہ وہ معاشرے کا ترجمان ہو کیونکہ اس طرح وہ اجتماعی زندگی پر تنقیدی نظر ڈالتا ہے،اور خوب سے خوب تر بنانے کا اس میں احساس پیدا کرتا ہے۔۔۔(چنانچہ اس سے اختلاف کے باوجود) ترقی پسند نظریہ ادب ہیت اور تکنیک میں تجربے کی ہر شکل کو قبول کرتا ہے۔بشرطیکہ اس سے فن پارے میں ابہام پیدا نہ ہو،اور ایک ذہین مصنف کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

ابہام ادب کے وجود ہی کی نفی ہے،وہ ادبی تجربہ جو سماجی زندگی کے حوالے سے نفع بخش نہیں خود بخود نا کام ہو جاتا ہے کیونکہ بقائے انفع کے قانون کی منطق یہی ہے۔

جدید ادبی تحریکیں اور جدید ادبی تکنیک : ادب وفن کی تقریباً تمام ادبی تحریکیں پہلی عالمی جنگ کی پیداوار ہیں لیکن وہ تمام تحریکیں حقیقت نگاری کے مقابلے میں پسپا ہو گئیں۔۔۔جدیدیت کا ایک بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ادب میں تکنیک کے تنوع کو جنم دیا اور تاثریت،اظہاریت،خود کلامی،داخلی خود کلامی،شعور کے بہاؤ اور تلازم خیال جیسی کئی ادبی تکنیکوں کو تشکیل دیا۔جدیدیت نے اظہار کے بہت سے طریقوں کو رواج دے کر ادب کے ہیئتی ڈھانچے میں وسعتیں پیدا کر دیں اس نے ان نئی تکنیکوں کو زندگی کے اظہار کے مطابق ڈھالا۔مثال کے طور شعور کے بہاؤ کی تکنیک انسانی ذہن میں خیالات کے بہاؤ کا ایک تخلیقی عمل ہوتی ہے کیونکہ مصنف اس میں شعور انگیز مواد شامل کرتا ہے۔

ترقی پسند نظریہ ادب ارفع مواد کے لیے جدید ادبی تکنیکوں کو استعمال کرنے کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پُر زور حامی ہے تاکہ مواد کے اظہار میں خوشگوار وسعتیں پیدا ہو سکیں اور ذہن پرانی ہیتوں کی محدودیت سے نکل کر کھلی فضا میں آ ئیں۔ جہاں تک جدید ادبی تحریکوں کا تعلق ہے ترقی پسند نظریہ ادب ان کی تخلیق کردہ ادبی تکنیکوں کو اپنے ترقی پسند مواد کے لیے کام میں لانے کا حامی ہے۔

ہر دور میں ادب کا اپنا منفرد آہنگ ہوتا ہے۔ انقلاب فرانس کے بعد ادب میں رومانی آہنگ پیدا ہوا اور اشتراکی انقلاب کے ادب میں ایک متحارب آہنگ نے جنم لیا جس میں مادی زندگی کے تقاضوں کی گونج تھی۔ ترقی پسند ادب کا آہنگ رومانی بھی ہے اور انقلابی بھی کیونکہ وہ اپنے اندر محبت کا دھیما پن اور انقلاب کا ہیجان دونوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اس لیے وہ مجموعی طور پر انسانی زندگی کے سارے مظاہر کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔

ترقی پسند ادب انیسویں صدی کا ایک سماجی مظہر ہے جس کی اساس جدلیاتی مادی نظریہ پر ہے اور جدلیاتی مادی نظریہ جدید طبیعی اور سماجی علوم کے نتائج کے ائتلاف کی پیداوار ہے۔ ترقی پسند ادب زندگی کو تغیر و حرکت اور تاریخی ارتقاء کے تناظر میں دیکھتا ہے اور اسے ایک وحدت مانتا ہے جس کے سماجی مظاہر ایک دوسرے سے مربوط ہیں ایک دوسرے پر انحصار رکھتے ہیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں اسی لیے وہ معاشرے کی معاشی بنیاد کو تمام سماجی تغیرات اور مظاہر کا محور تصور کرتا ہے اور تمام مظاہر کی تبدیلی کو زندگی کی معاشی بنیاد کی تقلیب پر منحصر سمجھتا ہے۔

ترقی پسند ادب کے دو موقف ہیں جو اسے ممتاز حیثیت دیتے ہیں ایک طرف ترقی پسند ادب عوام میں سامراج دشمنی اور قومی جدوجہد آزادی کا شعور پیدا کرتا ہے اور دوسری طرف وہ محنت کش عوام میں طبقاتی شعور بیدار کرتا ہے یہ دونوں پہلو معاشرے کی زندگی کے اہم ترین پہلو ہیں جن پر زندگی کے باقی تمام پہلو انحصار رکھتے ہیں۔

ترقی پسند ادبی روایت : ترقی پسند ادبی تحریک نے عالمی ادب پر اپنے مستقل اثرات جس طرح مرتب کیے ہیں وہ ایک ترقی پسند روایت اختیار کر گئے ہیں ترقی پسند ادبی تحریک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی بنیادیں سائنسی فکر پر رکھی گئی ہیں اسی لیے وہ زندگی کے مسائل پر سائنسی فکر کی روشنی میں نظر ڈالتی ہے ترقی پسند ادبی روایت کے اجزائے ترکیبی میں ادب اور تنقید کی سائنسی بنیاد طبقاتی شعور، زندگی اور حرکی حقیقت کے حوالے سے مواد کا انتخاب ہیت اور تکنیک میں جدت پسندی اور تشبیہ اور استعارہ ایمائیت اور علامات کا واضح استعمال شامل ہے۔

ترقی پسند روایت کے یہ اجزا ترقی پسند مصنفین کے فن پاروں میں واضح یا مخفی انداز میں اظہار پاتے ہیں ترقی پسند روایت ایک طرف معاشرے کی استحصالی قوتوں کے خلاف عوام میں طبقاتی شعور پیدا کرتی ہے ایک بہتر توانا آزاد اور خوشحال معاشرے کی تشکیل کے ایقان کی نوید دیتی ہے اور فسطائیت، نسلی امتیاز، فرقہ واریت، معاشی استحصال اور جدید نو آبادیاتی نظام کے خلاف ادبی سطح پر جہاد کرتی ہے اور دوسری طرف تہمات فرسودہ روایات فراریت قنوطیت اور مجرد نظریات کے خلاف عوام میں شعور اُبھارتی ہے انسان کو سماجی طور پر باشعور، پُر اُمید اور جدو جہد کا پرستار بناتی ہے انسان میں داخلی بصیرت اور تہذیبی ترفع پیدا کرتی ہے اور اس کی داخلی کیفیات کی عکاسی کرتی ہے اس لیے ترقی پسند روایت ہمیشہ انسانی تہذیب کا ایک جزو لاینفک رہے گی۔

یہ حقیقت بڑی رومانی اور دلکش ہے کہ تیسری دنیا میں عورت مرد کے شانہ بشانہ عوامی جدو جہد میں حصہ لے رہی ہے اور جدید نو آبادیاتی نظام اور مقامی استحصالی قوتوں کے پنجہ وحوس میں شریک ہے عصر حاضر میں عوامی جدو جہد میں عورت کی شرکت ایک انقلابی سماجی مظہر ہے جسے ترقی پسند مصنف اپنی ادبی تخلیق میں نمایاں حیثیت دیتا ہے۔

☆☆☆☆

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترقی پسند تحریک کے خدوخال

انور احسن صدیقی

۲۳/۲۴ دسمبر تک منعقد کیا جانے والا جشن سجاد ظہیر کے دوروزہ سلسلۂ تقریبات کا اہتمام انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان نے کیا تھا جسے ارتقا ادبی فورم کے علاوہ متعدد ادبی اور سماجی تنظیموں کا تعاون حاصل تھا۔اس سلسلۂ تقریبات کا مقصد برصغیر ہندو پاکستان میں ترقی پسند تحریک کے روحِ رواں اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانی سید سجاد ظہیر کی گراں پایہ خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرنا تھا جو انہوں نے ادب کے لیے بالعموم اور اُردو ادب کے لیے بالخصوص سرانجام دیں۔انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام سب سے پہلے تو اُردو کے ادیبوں کی ہی کوششوں سے عمل میں آیا تھا اور بعد میں برصغیر کی دوسری زبانوں میں اس کی شاخیں قائم ہوتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ برصغیر کا کوئی گوشہ ایسا نہیں رہا جہاں انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ موجود نہ ہو، اور ہندوستان کی ہر چھوٹی اور بڑی زبان میں اس کی شاخیں قائم ہو گئی تھیں۔

بعض حلقوں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ ترقی پسند تحریک ختم ہو چکی ہے اور اس کے دوبارہ پنپنے کے امکانات موجود نہیں ہیں۔اس سلسلے میں ایک عمومی غلط فہمی کا ازالہ کر دینے کی ضرورت ہے عام طور سے تنظیم اور تحریک کو ایک دوسرے کے ہم معنی اور مترادف قرار دے دیا جاتا ہے جبکہ یہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلگ مظاہر ہیں اگرچہ ان کے درمیان ایک گہرا تعلق موجود ہوتا ہے لیکن طویل تاریخی عمل کے دوران ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب یہ تعلق کمزور ہو جاتا ہے اور ختم ہونے لگتا ہے تنظیم اپنا وجود کھو دیتی ہے لیکن تحریک موجود رہتی ہے۔تنظیم تحریک کے بطن سے جنم لیتی ہے جب کہ تحریک تنظیم کے بطن سے جنم نہیں لیتی کسی خاص تاریخی مرحلے پر معروضی اسباب کے نتیجے میں کوئی تحریک وقت اور معاشرے کی ضرورت بن کر قوت اور توانائی کے ساتھ ابھرتی ہے تو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وہ خود اپنے لیے ایک تنظیم کے قیام کی راہیں تلاش کر لیتی ہے پھر ایک تنظیم وجود میں آتی ہے جو تحریک کو بڑھوا دیتی ہے اور اسکی قیادت کا فریضہ انجام دیتی ہے جبکہ تحریک تنظیم کو زیادہ فعال مضبوط اور پُر اعتماد بناتی ہے یہ دونوں ایک دوسرے کی توانائیوں میں اضافہ کرتی اور اپنے عہد کی سیاسی اور معاشرتی ضروریات کی تکمیل کرتی ہیں یہ عمل ایک مدت تک جاری رہنے کے بعد بالآخر اس وقت ختم ہو جاتا ہے جب اس کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

تنظیم تو کمزور ہو جاتی ہے یا ختم ہو جاتی ہے اور ایک نئی تبدیل شدہ فضا میں اس کی افادیت باقی نہیں رہتی لیکن یہ قطعی ضروری نہیں ہوتا کہ وہ تحریک بھی اس تنظیم کے ساتھ ہی ختم ہو جائے تنظیم، تحریک کے بغیر مردہ یا بے اثر ہو جاتی ہے لیکن تحریک تنظیم کے بغیر بھی زندہ رہتی ہے ترقی پسند تحریک کے بارے میں گفتگو کرتے وقت ہمیں تحریک اور تنظیم کو ایک دوسرے سے الگ الگ کر کے دیکھنا چاہیے۔

ادب میں ترقی پسند تحریک کا آغاز گزشتہ صدی کے نصف اول کے دوران میں ہوا اور برصغیر جنوبی ایشیا میں ۱۹۳۶ء میں باقاعدہ سائنسی بنیادوں پر استوار انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا جلد ہی اس کی شاخیں برصغیر کے گوشے گوشے میں پھیل گئیں اور اس تحریک نے ایک نہایت منظم اور توانا تنظیم کی حیثیت سے اپنے وجود کو نہ صرف یہ کہ روشناس کرایا بلکہ اپنی توانائی اور صلاحیت کا لوہا بھی منوالیا۔ ترقی پسند تحریک کا نسب العین یہ تھا کہ ادب کو جس کا انسانی زندگی سے نہایت گہرا اور ناقابل شکست تعلق ہے نا صرف یہ کہ معاشرتی زندگی کے حقیقی ترجمان کی حیثیت سے فروغ دیا جائے بلکہ زندگی کی تزئینِ نو اور اس کی اعلیٰ تر صورت گری میں بھی ادب سے ایک موثر اور پر قوت وصیلے کا کام لیا جائے چنانچہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے اعلان نامے میں واضح طور پر یہ کہا گیا کہ ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں رونما ہونی والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں اور ادب میں سائنسی رویے اور اقلیت پسندی کو فروغ دیتے ہوئے ترقی پسند تحریکوں کی حمایت کریں ہماری انجمن کا مقصد ادب اور آرٹ کو ان رجعت پرست طبقوں کے چنگل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے نجات دلانا ہے جو اپنے ساتھ ادب اور فن کو بھی انحطاط کے گڑھوں میں دھکیل دینا چاہتے ہیں ہم ادب کو عوام کے قریب لانا چاہتے ہیں اور اسے زندگی کی عکاسی اور مستقبل کی تعمیر کا موثر ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ترقی پسند تحریک کی تنظیم کے وجود میں آنے سے پہلے ادب میں ترقی پسندی کا کوئی وجود نہیں تھا؟ ایسا سمجھنا تاریخی حقائق سے روگردانی کے مترادف ہوگا۔ انسانی معاشرے میں ترقی پسند فکر جس میں ادب سمیت تمام فنونِ لطیفہ میں ترقی پسند اور زندگی آمیز فکر شامل ہے اس وقت سے موجود ہے جب سے انسان نے اپنی شعوری اجتماعی زندگی کا آغاز کیا اور یہ سفر ہزار ہا برس سے جاری و ساری ہے۔

انسان نے ہوش سنبھالتے ہی اپنی ان تمام تخلیقی قوتوں سے کام لینا شروع کر دیا تھا جن سے وہ پوری طرح سے واقف بھی نہیں تھا لیکن تخلیق کی یہ قوتیں ابتداء سے ہی اس کی روح کو بے چین اور اس کے قلب کو مضطرب رکھتی تھیں اور اپنے اظہار کے لیے راستے تلاش کرتی تھیں۔ انسان اپنے گردو پیش کی دنیا سے جو اثرات قبول کرتا تھا انہیں وہ اپنے اندر آباد باطنی دنیا کے ساتھ ملا کر تصورات کے نئے نئے پیکر تراشتا تھا اور انہیں منظر عام پر لاتا تھا لیکن ظلم کا آغاز کہاں سے ہوا؟ شاید قدیم اشتمالی سماج میں ظلم کا وجود رہا ہو لیکن اس کی نوعیت یقیناً طبقاتی ظلم سے مختلف رہی ہوگی۔ طبقاتی سماج میں ظلم کی جو شکل نمودار ہوئی وہ محدود، انفرادی یا گروہی نہیں تھی بلکہ یہ ایک بہت بڑی اور آفاقی لڑائی تھی جس میں ساری قوم انسانی دو الگ الگ فریقوں کی حیثیت سے شامل تھی یہ مورچہ بندی اگرچہ معاشی شعبے میں شروع ہوئی تھی لیکن یہ زندگی کے تمام شعبوں میں سرائیت کر گئی تھی اور ہر جگہ جاری و ساری تھی کیونکہ معاشی بنیاد ہی معاشرتی ڈھانچے کی تشکیل فروغ اور تبدیلی میں اصل کردار ادا کرتی ہے۔

انسانی سماج میں طبقاتی تقسیم کے ساتھ ہی ظلم بدی اور ناانصافی میں اضافے کے پہلو بہ پہلو مدافعت مزاحمت اور احتجاج کے رویئوں نے بھی جنم لیا جن کا اظہار

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فنونِ لطیفہ اور ادب میں بھی ہونے لگا اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے ادب میں ترقی پسند فکر نے اپنی جگہ بنانی شروع کر دی سماج میں اور اس کے نتیجے میں ادب میں پیدا ہونے والی ترقی پسند فکر کوئی نئی چیز نہیں ہے اور نہ ہی یہ کسی فردِ واحد کی یا افراد کے کسی گروہ یا جماعت کی ایجاد، اختراع یا تخلیق ہے یہ تو ایک رویہ ہے جو سماج میں اور ادب میں ہمیشہ سے ہر دور میں موجود رہا ہے اس وقت بھی جب کہ انسان قدیم ترین اشتمالی سماج میں سانس لیتا تھا اور اس وقت بھی جب کہ وہ ایک تقسیم شدہ سماج میں زندہ تھا جہاں تمیز بندہ و آقا کا آغاز ہو چکا تھا۔

یہ اس وقت بھی موجود تھی جب قدیم ترین کہانیاں اور گانے وجود میں آئے اس قدیم ترین ادب کا بڑا حصہ وہ ہے جس کے خالقوں کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے ہم اس بات سے بالکل لاعلم ہیں کہ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے اپنی زبردست تخلیقی صلاحیت کے ذریعے زندگی کی طرح طرح طلسمات کی صورت گری کی ہے ساری دنیا کی زبانوں کے لوگ ادب کا نہایت بیش قیمت اور وسیع ذخیرہ زیادہ تر ایسے تخلیق کاروں کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہے جن کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔

ہزاروں سال سے دنیا کے مختلف معاشروں میں بے شمار زبانوں میں جو غیر تحریری اور تحریری ادب تخلیق ہوتا رہا ہے اس میں ظلم نہ انصافی اور استحصال سے نفرت کے تصور کو کلیدی حیثیت حاصل رہی ہے سچائی، نیکی، محبت، حسن اور خیر ادب کے غالب موضوعات رہیں ہیں اور یہی ادب میں ترقی پسند رجحان کی علامت ہے جو اس وقت سے موجود ہے جب سے غیر تحریری صورت میں ادب وجود میں آیا ہم دنیا کی پرانی کہانیوں قصوں اور داستانوں میں طرح طرح کے ظالموں، عفریتوں، دئیوں اور راکھشسوں کے بارے میں سنتے اور پڑھتے ہیں جو خوبصورت شہزادیوں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں اور انہیں قید کر کے ان کو ظلم کا نشانہ بناتے ہیں۔

کسی بھی قدیم کہانی میں ان ظالموں کی حمایت نہیں کی جاتی بلکہ ان سے برملا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نفرت کا اظہار کیا جاتا ہے پھر کوئی خوبصورت اور بہادر نوجوان اس ظالم کے مقابلے کے لیے کمر بستہ ہو کر میدان عمل میں اُترتا ہے اور اس ظالم کو شمشیر یا تدبیر سے زیر کر کے شہزادی کو اس کی قید سے نجات دلاتا ہے نامعلوم تخلیق کار یہاں جو رویہ اختیار کرتے ہیں جو بلا شبہ ترقی پسندانہ رویہ ہے ''پنجتنتر'' یا ''کلیلہ و دمنہ'' کی بے حد قدیم حکایات سے لیکر منشی پریم چند کے ''کفن'' اور کرشن چندر کے ''مہالکشمی کا پُل'' تک الف لیلوی داستانوں اور شیخ سعدی کی ''گلستاں'' و ''بوستاں'' کی اصلاحی کہانیوں سے لیکر شوکت صدیقی کی ''خدا کی بستی'' اور میخائل شولوخوف کی ''تقدیر آدمی کی'' تک مہا بھارت رامائن اور شہنامہ فردوسی سے لیکر سردار جعفری کی ''نئی دنیا کو سلام'' اور ساحر لدھیانوی کی ''پرچھائیاں'' تک ادبی تحریروں ایک سمندر موجزن ہے جس کی لہروں کا کوئی شمار نہیں ہے ان لہروں کو لاکھوں تخلیق کاروں کے دلوں کی دھڑکن کا مدوجزر متحرک رکھتا اور توانائی بخشتا ہے۔

ترقی پسند ادب کی کوئی ایک متعین شکل نہیں رہی ہے۔ لیکن اس کا اصل اور بنیادی مقصد ایک ہی رہا ہے اور وہ مقصد ہے زندگی کے تپتے ہوئے صحراؤں میں انسان کے لیے امن اور سلامتی کی چھاؤں تلاش کرنا، یہی ترقی پسند فکر ہے اور ہر دور میں نوع انسانی کے اعلیٰ ترین اذہان اسی فکر کی ترجمانی کرتے رہے رہیں۔ آج دنیا کو ترقی پسند نظریے کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے، کیونکہ سامراج آج پہلے سے کہیں زیادہ بے رحمی اور شد ومد کے ساتھ دنیا بھر کے عوام کا استحصال کر رہا ہے اور خاص طور سے تیسری دنیا کے عوام کی زندگی تو موت سے بدتر ہوئی جا رہی ہے۔ سامراجی طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے نوع انسانی کا ادب سمیت زندگی کے ہر شعبے میں ترقی پسند فکر سے مسلح ہونا ضروری ہے۔

ہر اہم اور بڑی معاشرتی اور فکری تحریک کی طرح ترقی پسند ادب کی تحریک بھی تاریخ کے ایک خاص مرحلے پر نمودار ہوئی تھی۔ بیسویں صدی کا نصفِ اول تاریخ انسانی کا سب سے زیادہ پُر آشوب اور ہنگامہ خیز دور تھا۔ اس دور میں ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے بیشتر ممالک یورپ کے سامراجی ممالک کو محکوم بنائے ہوئے تھے۔ نو آبادیاتی نظام کے نیچے نوعِ انسانی کے سینے میں بری طرح گڑے ہوئے تھے اور اسے لہولہان کر رہے تھے، اسی عہد میں دونوں عالمی جنگیں لڑی گئیں جن کا مقصد سامراجی اور فاشسٹ قوتوں کی طرف سے زیادہ سے زیادہ ممالک پر قبضہ کرنا اور اپنے دائرہ استحصال کو مزید وسیع کرنا تھا۔

اس دور کی دو بہت اہم خصوصیات تھیں ۔ اگر ایک طرف سامراجیوں اور نو آبادکاروں کے ظلم و تشدد اور سفاکاریوں میں اضافہ ہو رہا تھا تو اسی کے ساتھ ساتھ محکوم قوموں میں غلامی کا احساس نہ صرف یہ کہ بڑھ رہا تھا بلکہ غلامی کے خلاف عملی جدو جہد کا عمل بھی شروع ہو چکا تھا۔ ظلم و تشدد اور طبقاتی استحصال کے خلاف ہزار ہا برس کی جدو جہد کے دوران میں پہلی بار یہ مقام آیا تھا کہ جدو جہد کے فلسفے کو سائنسی بنیادوں پر استوار کر کے اسے ایک ٹھوس اور قابل عمل شکل دے دی گئی تھی۔ استحصال اور غلامی کے خلاف مجہول احساس کی جگہ ایک فعال اور طاقتور شعوری جذبے نے لے لی جو غلامی سے نجات اور ایک نئی اور آزاد زندگی کی تعمیر کا تقاضا کر رہا تھا۔

۱۹۱۷ء میں تاریخ عالم کا اہم ترین واقعہ پیش آیا۔ روس میں بالشویک پارٹی کی قیادت میں مزدوروں اور کسانوں نے سوشلسٹ انقلاب برپا کر دیا اور سرمایہ دار طبقے کو اقتدار کا مالک بنا دیا۔ اس عظیم واقعے کے نتیجے میں ساری دنیا میں تبدیلیوں کا عمل بہت تیز ہو گیا اور ساتھ ہی اس امر کی تاریخی ضرورت بھی پیدا ہوئی کہ ایک نئی زندگی کی تعمیر و تشکیل میں ادب سے ایک موثر اور کارگر وسیلے کا کام لیا جائے۔ یہی وہ مرحلہ تھا جہاں ادب میں ہمیشہ سے موجود ترقی پسند اور انسان دوست فکر نے ایک باقاعدہ تحریک کی صورت اختیار کر لی اور تخلیقِ ادب کے عمل میں اس تحریک کی ایک علیحدہ شناخت مقرر ہوئی۔ یورپ میں ۱۹۳۰ء کے عشرے میں ایک نئی خوفناک عوام دشمن قوت سر اٹھا رہی تھی۔ یہ فاشزم کی طاقت تھی جو سرمایہ داری اور سامراج کی سب سے گھناؤنی شکل تھی۔ جرمنی نازی پارٹی کے زیر حکومت آچکا تھا اور فاشسٹ فلسفے کو عروج حاصل ہو رہا تھا جس کے تحت نسلی ولسانی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

منافرت و جارحانہ قوم پرستی اور ایک خاص قسم کی اشرافیہ کی بے لگام آمریت کو ریاست کی بنیاد قرار دیا جا رہا تھا۔ نیز سارے عالمی تہذیبی و ثقافتی ورثے کی نفی کی جا رہی تھی۔ اسپین میں فاشسٹوں نے جمہوریت کا قلع قمع کرنے کے لیے خانہ جنگی شروع کر دی تھی اور انہیں نازی جرمنی کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی۔ خود دوسرے سرمایہ دار ممالک بھی فاشزم کی بڑھتی ہوئی قوت سے خوف زدہ تھے۔ عالمی افق پر دوسری عالمی جنگ کے سیاہ بادل منڈلا رہے تھے۔ فاشسٹ قوتوں اور ان کے نظریات کے خلاف ساری دنیا کے ادیب اور دانش ور سخت احتجاج کر رہے تھے، جن میں خود جرمن ادیبوں دانش وروں کی ایک بڑی تعداد بھی شامل تھی بہت سے جرمن ادیب اور دانشور فاشسٹ غلبے سے پریشان ہو کر جرمنی چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں چلے گئے تھے اسپین کی خانہ جنگی میں فاشسٹوں لڑنے کے لیے ادیبوں اور دانشوروں کی ایک بڑی تعداد نے ہتھیار اٹھا لیے۔ فاشزم کے بڑھتے ہوئے طوفان سے ساری دنیا کی ثقافت کو خطرہ لاحق ہو چکا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں پیرس میں ثقافت کے دفاع اور فاشزم کی مزاحمت کے لیے ادیبوں کی ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ساری دنیا کو فاشزم کے بڑھتے ہوئے خطرے اور امن کی فوری ضرورت سے آگاہ کیا گیا۔ ادب میں ترقی پسند تحریک اب اس دور میں داخل ہو چکی تھی جہاں اسے ایک باقاعدہ تنظیم کی ضرورت تھی، چنانچہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا۔ برطانیہ میں ۱۹۳۵ء میں اور ہندوستان میں ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین قائم ہوگئی۔ ۱۹۳۹ء میں فاشسٹ قوتوں نے دوسری عالمی جنگ کا آغاز کر دیا جس کے دوران میں نوع انسانی اپنی تاریخ کے بدترین دور سے گزری۔ ۱۹۴۱ء میں فاشسٹ جرمن نے سوویت یونین پر بھی حملہ کر دیا جب کہ سوویت یونین کے ساتھ اس کا جنگ نہ کرنیکا معاہدہ موجود تھا۔ ۱۹۴۵ء میں دوسری عالمی جنگ ختم ہوگئی۔ فاشسٹ قوتوں کو عبرتناک شکست کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے ساتھ ہی دوسری سامراجی اور نوآبادیاتی قوتیں بھی اتنی کمزور ہوگئیں کہ ان کے لیے سمندر پار کے مقبوضات پر اپنی گرفت قائم رکھنا آسان نہیں رہا۔ تمام محکوم ممالک کی آزادی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی جد جہد میں تیزی پیدا ہو رہی تھی۔ مجموعی طور پر نوعِ انسانی کا سماجی اور سیاسی شعور بڑی تیزی سے بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا تھا اور ترقی پسند تحریک اس عمل میں نہایت اہم کردار ادا کر رہی تھی۔ اُردو سمیت ہندوستان کی تمام زبانوں میں اس تحریک کے تحت اعلیٰ ترین ادب تخلیق کیا جا رہا تھا اور عوام اور ان کی جدو جہد کے ساتھ ادب کے نہایت گہرے اور وسیع رشتے قائم ہو رہے تھے۔ اس عہد میں تخلیق کیا جانے والا ادب اپنے عہد کا سب سے زیادہ دقیع اور معتبر ادب تھا۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہو گیا اور پاکستان وجود میں آ گیا۔ ترقی پسند تنظیم کی ضرورت دونوں ممالک میں اس وقت بھی موجود تھی اور آنے والے برسوں کے دوران میں بھی موجود رہی۔ لیکن اس ضرورت کی شدت کے درجے میں آہستہ آہستہ کمی واقع ہوئی جا رہی تھی کیونکہ اہم ترین اور بنیادی سیاسی مقاصد حاصل کیے جا چکے تھے۔ آزادی کی جنگیں کامیابی سے ہمکنار ہو چکی تھیں اور عالمی سطح پر تعمیرِ نو کا ایک نیا دور شروع ہو چکا تھا۔ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ تنظیم کا ڈھانچہ آہستہ آہستہ ڈھیلا ہوتا گیا لیکن تنظیم اپنا اصل کام انجام دے چکی تھی۔ تنظیم نے ترقی پسند تحریک کے تخلیقِ ادب کے سارے منابع تک پہنچا کر اسے وہاں اس طرح آباد کر دیا تھا کہ اب اس کی بے دخلی کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ پاکستان میں دیگر تمام ترقی پسند اور بائیں بازو کی تنظیموں کی طرح ترقی پسند ادب کی تحریک کو بھی بہت کڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ تنظیم پر پابندی عائد کر دی گئی۔ ملک بھر میں ترقی پسند ادیبوں کو پکڑ پکڑ کر جیلوں میں ٹھونسا جاتا رہا اور آزادی اظہار رائے پر کڑے پہرے بٹھائے گئے اور ان کے خلاف سخت ترین تعزیری کارروائیاں کی گئیں۔ لیکن اس کے باوجود ترقی پسند ادب کی شناخت کو تو ختم کیا جا سکتا تھا اور نہ اس کی افادیت کو مٹایا جا سکتا تھا۔ پاکستان کی تمام زبانوں میں جو بہترین ادب تخلیق ہو رہا تھا وہ ترقی پسند فکر کا ہی آئینہ دار تھا۔

تنظیمیں ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن تحریکیں اس انداز میں زندہ رہتی ہیں کہ وہ معاشرے کا جزو بن کر اپنے اثرات کو کسی نہ کسی طور پر زندہ رکھتی ہیں۔ تصوف کی تحریک نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جو کہ فی الحقیقت جاگیردارانہ مطلق العنانی اور ظلم و تشدد کے خلاف ایک احتجاجی تحریک تھی، ادب کا جو سیکولر نظریہ پیش کیا تھا، وہ نہ صرف یہ کہ آج بھی زندہ ہے بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ موثر اور طاقتور ہے۔ سرسید تحریک کا دور گزر گیا لیکن اس تحریک نے برصغیر کے مسلمانوں کو جو راستہ دکھایا تھا، وہی آج ان کی زندگی کی اصل گزرگاہ قرار پایا ہے اور خرد افروزی، علم دوستی اور روشن خیالی کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ واضح رہے کہ اپنے اثرات کو زندہ رکھنے کا اعزاز انہی تحریکات کو حاصل ہوتا ہے جو زندگی کی حرکی قوتوں کا ساتھ دینے اور انہیں آگے بڑھانے کی اہل ہوتی ہیں۔ ترقی پسند تحریک کی مخالفت میں بہت سی تحریکیں اُبھریں، لیکن وہ ترقی پسند تحریک کے اثرات اور اس کی فکری برتری کو شکست دینے میں بُری طرح ناکام رہیں۔ سامراج کی اصل جنگ سوشلزم سے تھی اور آج بھی ہے۔ یہ کوئی معمولی جنگ نہیں ہے اور نہ اس کا کوئی ایک محاذ ہے۔ یہ جنگ زندگی کے تمام شعبوں میں لڑی جارہی ہے جن میں ادب کا شعبہ بھی شامل ہے۔ اس جنگ میں سامراجی قوتوں کے ان گنت ظاہری اور مخفی ہتھیار استعمال کیے جارہے ہیں اور بعض ہتھیاروں کی کاٹ کا تو احساس تک نہیں ہو پاتا لیکن وہ برابر اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ سامراج کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ اپنے استحصالی وجود کی بقا کی غرض سے انسانی ذہن کو زیادہ سے زیادہ مسخ اور انسانی فکر کو زیادہ سے زیادہ داغ دار کرتا رہے اور انہیں اپنے مفادات کا تابع بناتا رہے تاکہ طبقاتی جدوجہد کی راہوں کی ناکہ بندی کی جا سکے۔ ذہن انسانی کو مجہول، مضمحل، پراگندہ اور قنوطی بنانا، اسے طرح طرح کے منفی اور مضر افکار کی آمجگاہ بنانا اسے پستی اور انحطاط کی طرف لے جانا، بے یقینی، بے اعتمادی، عمومی مایوسی اور تشکیک کی فضا پیدا کرنا، یہ ساری چیزیں سامراج کے لیے ضروری ہوتی ہیں اور ان کے فروغ کے لیے اسے جن وسیلوں کی ضرورت ہوتی ہے ان میں ادب ایک بہت بڑا وسیلہ ہے جو کہ انسان کے قلب و روح سے براہِ راست رابطہ رکھتا ہے اور یہاں سامراجی مفادات کے حصول میں ترقی پسند فکر سب سے بڑی رکاوٹ کی حیثیت سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

موجود ہے۔ چنانچہ ترقی پسند تحریک کے نفوذ اور اس کے عروج کے بعد سے اس کے خلاف مسلسل حملوں کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ ادب اور عوام کے رشتے کی تماری اور مصنف کے رشتے کی نفی کرنے کی غرض سے عجب عجب قسم کے فلسفے گھڑے جاتے ہیں لیکن ادب کو زندگی سے دور لے جانے کی اور اسے محض الفاظ کے ایک بے معنی اور مہمل ملغوبے میں تبدیل کر دینے کی باقاعدہ اور شعوری کوششیں کی جاتی ہیں اور اس غرض سے طرح طرح کے نظریات تصنیف کیے جاتے ہیں لیکن ترقی پسند ادب کی تحریک معاشرے میں اپنی جگہ بنا کر عوام زندگی اور ادب کے درمیان جس مضبوط پل کی تعمیر کر چکی ہے اسے توڑا نہیں جاسکتا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"انگارے" کے افسانے

ڈاکٹر فردوس انور قاضی

افسانہ نویسی کا وہ عہد جو پریم چند اور یلدرم سے شروع ہوا تقریباً ۱۹۳۱ء تک اپنے اثرات مرتب کرتا گیا ہے۔اس درمیان میں مختلف لکھنے والے ابھرے، جو پریم چند کی حقیقت نگاری اور یلدرم کی رومانیت کو لے کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہے۔۔۔اور کسی حد تک ان دونوں رنگوں میں معمولی تبدیلی بھی ہوئی۔کسی نے دیہات سے نکل کر شہری زندگی کی عکاسی کی اور کسی نے رومان کر اپنا محور و مرکز بنالیا اور کسی کے ہاں رومان اور حقیقت کی آمیزش سے ایک نیا رنگ پیدا ہوا۔۔۔لیکن ان سب لکھنے والوں نے کوئی ایسی راہ نہیں نکالی، جس پر چل کر اُردو افسانہ ان دو مخصوص رجحانات یا متعینہ فارم سے نکل کر نئے تجربات سے آشنا ہوتا۔ایک متعینہ سانچا تھا، جس میں تمام افسانہ نگاروں کے افسانے ڈھل رہے تھے۔ایک راستہ تھا جس پر سب چل رہے تھے۔۔۔منزل ایک ہی تھی۔۔۔جہاں پہنچ کر سب رک جاتے ہیں۔یہ اور بات ہے کہ بعضوں نے اس منزل کو رومان اور بعضوں نے حقیقت کی نگاہ سے دیکھا۔

افسانے میں آغاز ہونا چاہیے۔۔۔اور پھر انجام ہونا چاہیے۔۔۔سب اس پر یقین رکھتے تھے۔افسانے کی یہ اصولی تعریف، اس میں شک نہیں کہ بڑی معتبر ہے اور آج بھی کم وبیش اسی افسانہ نگار چلتے ہیں۔۔۔لیکن۔۔۔ایک چیز ہوتی ہے لکیر کا فقیر بن جانا ۔۔۔وہ افسانہ نگار جن کے یہاں کہنے کو کوئی بڑی بات نہیں ہوتی اس تعریف کو صرف دہراتے ہیں اس میں جان نہیں ڈال سکتے۔۔۔رسمی اور روائتی خیالات اصول اور ضوابط کی شکست ہوتے ہیں۔بڑا افسانہ نگار اپنا فارم لے کر خود آتا ہے۔۔۔یا متعینہ فارم ہی کو اپنے خیال اور احساس کی گرمی سے پگھلا کر نیا کر دیتا ہے۔ہیئت اور موضوع الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔۔۔لیکن اگر ان میں جدائی ہوجائے تو موضوع خواہ کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو تاثر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے خالی ہو جاتا ہے اور فن کے معیار پر پورا نہیں اُترتا۔۔۔اسی طرح موضوع کو نظر انداز کر کے صرف ہیئتی تجربات ۔۔۔ ہیئت پرستی کے سوا اور کچھ نہیں رہتے۔ وہ ایسے زیورات کے نہایت خوبصورت ڈبے کی طرح ہوتے ہیں جس میں زیور نہ ہو۔

افسانہ نگاری کا یہ عہد جو ۱۹۰۵ء کے لگ بھگ شروع ہوتا ہے اور چھبیس، ستائیس برس تک چھایا رہتا ہے۔۔۔ زرخیز ضرور تھا مگر رفتہ رفتہ یہ زمین اپنی کاشت کی فراوانی سے زرخیزی کھوتی گئی، بیشتر افسانہ نگار وہ تھے جنھوں نے ہندوستان میں رہ کر تعلیم حاصل کی تھی۔ انھوں نے مغربی ادب کا مطالعہ بھی اسی ماحول میں کیا تھا جو اس عہد کے ہندوستان کی عام فضا تھی وہ براہ راست مغربی ادب سے واقف نہیں تھے لیکن اسی دوران میں ایک ادبی گروہ ایسا بھی اُبھر رہا تھا جو تعلیم کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم تھا اور جس کے سامنے ایک طرف ہندوستان کی زندگی اور اس کی گھٹن تھی اور دوسری جانب یورپی ممالک کی آزاد فضا اور انکی صنعتی اور سائنسی ترقیاں بھی تھیں۔ یہ نوجوان مغرب سے متاثر ضرور تھے۔ لیکن ان کی فکر ہندوستانی تھی۔ مغرب سے انھوں نے سیاسی اقتصادی اور نفسیاتی نظریات سیکھے جس کی روشنی میں وہ ایک طرف تو اپنے ملک کے حالات اور آدمیوں کا تجزیہ کر رہے تھے۔ دوسری طرف مشرق کو مغربی غلامی سے آزاد کرانے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ انھیں جو دنیا ملی تھی، اس میں جمہوریت، فسطائیت، اشراکیت اور نراجیت کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اقتصادی کساد بازاری، ٹریڈ یونینوں اور ہڑتالوں کو جنم دے رہی تھی۔ فوجی پریڈ کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ سرمایہ داروں کی باہمی کش مکش مغربی ملکوں کو دوسری جنگ کی طرف بڑھا رہی تھی۔۔۔ بے چینی، خوف، ہراس، اسی کے ساتھ سیاسی نعرے اور جدوجہد ۔۔۔ گولیاں، پھانسی، جلاوطنی ۔۔۔ ان تمام چیزوں نے ادیبوں۔ شاعروں افسانہ نگاروں، ناول نویسوں اور ڈرامہ لکھنے والوں کو نئے ہیجان، اضطراب، نئی سوچ اور دیکھنے کے نئے زاویوں سے آگاہ کر دیا تھا۔ جس کا لازمی نتیجہ فکر کی بنیادی تبدیلی اور اسی کے ساتھ متعینہ اور مروجہ ہیئت کی شکست تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یورپ کے ادیب اور شاعر کافی ہاؤس، ریستوران اور ہوٹلوں میں دن رات گرما گرم بحث کرتے اور کبھی میدان جنگ میں بھی اتر پڑتے۔ فرانس، جرمنی اور انگلستان کے لکھنے والے ایک ایسا راستہ ڈھونڈ رہے تھے، جس پر چل کر آدمی خود کو دوبارہ پا سکے اور جنگ کے امنڈتے ہوئے بادلوں کے نحس سائے سے نکل سکے۔

ہندوستان میں بھی ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۱ء تک سیاسی اور اقتصادی حالات انتہائی دگرگوں رہے تھے۔ عدم تعاون کی تحریک، تحریک خلافت، وہشت پسند نوجوانوں کی انقلابی تحریک انگریزوں کی فرعونیت، ہندوستان پران کے جارحانہ تسلط، بھوک اور جہالت نے ہندستانیوں کی رگوں میں زہر بھر دیا تھا اور جد وجہد آزادی انقلابی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ اُردو افسانہ اب ایک ایسے موڑ کی طرف آرہا تھا جس کی طرف بڑھتے ہوئے یلدرم اور پریم چند کے قدم رک جاتے ہیں۔۔۔ کیونکہ اس کے آگے چل کر جذبات اور خیالات کا جوالا مکھی تھا۔۔۔ جو پھوٹنے ہی والا تھا۔۔۔ چنانچہ ۱۹۳۱ء میں یہ پھوٹ پڑا۔۔۔ اور افسانوں کی ایک مختصر سی کتاب انگارے کے نام سے شائع ہوئی موضوع ہیئت اور انداز بیان کے لحاظ سے یہ مجموعہ اُردو افسانوں میں بالکل نئی بلکہ انجانی چیز تھا۔۔۔ یہ مجموعہ پنچایتی تھا۔ اسکا کوئی ایک مصنف نہیں تھا۔ چند نوجوانوں نے اسے مل کر لکھا تھا۔۔۔ یہ افسانے بغاوت کا اعلان تھے۔۔۔ اس کی ادبی حیثیت آج کچھ نہیں مگر ان کی تاریخی حیثیت مسلم ہے۔ اسمیں لکھنے والے سجاد ظہیر، احمد علی، ڈاکٹر رشید جہاں اور محمود الظفر نمایاں ہیں۔ انگارے میں ایک طرف پرانی اقدار سے نفرت، مذہبی انتہا پسندی کے خلاف احتجاج، معاشی تنگ دستی سے پیدا ہونے والی جھلاہٹ، سماج کی عائد کردہ بے جا پابندیوں کا لبادہ اتار پھینکنے کا اعلان محبت کی زندگی میں آزادی کی تمنا۔۔۔ جنسی گھٹن کو توڑنے کی خواہش، ایک نئے سماج اور صحت مند معاشرے کی تعمیر کی کوشش، غرض بہت سی چیزیں شامل تھیں۔۔۔ لیکن یہ تمام چیزیں انگارے کے افسانوں میں جس طرح سامنے آئیں۔ وہ لکھنے والوں کے اس ذہنی انتشار کو بھی ظاہر کرتی ہیں۔ جس سے اس عہد کے تعلیم یافتہ دوچار

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھے۔ مسلسل جبر کے نتیجے میں اگر کوئی شخص اپنی شعوری قوت ختم کر بیٹھے یا ضبط کا بندھن ٹوٹ جائے تو بالعموم وہ دیوانگی کے عالم میں چیخنے اور گالیاں بکنے لگتا ہے۔۔۔ "انگارے" کے افسانے ایسی ہی ذہنیت کو سامنے لاتے ہیں۔ ان افسانوں میں اعصابی تشنج، ہذیان بے خوابی اور بے رحمی ہے۔۔۔ یہ ایسے زخمی لوگوں کے افسانے ہیں جو اپنے زخموں کو دکھلا رہے ہیں۔ ٹوٹے ہوئے خیالات، بکھرے ہوئے حالات۔۔۔ اور بے قابو زبان۔۔۔ ان افسانوں میں بار بار ملتی ہے۔

> ایک سال، دو سال، سو سال، ہزار سال، موت کا فرشتہ آیا، بدتمیز بے ہودہ کہیں کا، چل نکل یہاں سے، بھاگ، ابھی بھاگ، ورنہ تیری دُم کاٹ لوں گا، ڈانٹ پڑے گی پھر بڑے میاں کی۔۔۔ ہنستا ہے؟ کیوں کھڑا ہے۔۔۔۔۔ سامنے دانت نکالے، تیرے فرشتے کی ایسی تیسی، تیرے فرشتے کی۔۔۔ ساری دنیا کی ایسی تیسی، میاں اکبر تمہاری ایسی تیسی، ذرا آپ کی قطع ملاحظہ فرمایئے۔ پھونک دو تو اُڑ جائیں۔ بڑے شاعر غرا بنے ہیں۔۔۔ مشاعروں میں تعریف کیا ہو جاتی ہے کہ سمجھتے ہیں۔۔۔ کیا سمجھتے ہیں بے چارے سمجھیں گے کیا۔ بیوی جان کچھ سمجھنے بھی دیں۔ صبح سے شکایت، رونا دھونا، کپڑا پھٹا ہے، بچے کی ٹوپی کھو گئی ہے۔ نئی خرید کے لے آؤ۔ جیسے میری اپنی ٹوپی نئی ہے۔ کہاں کھو گئی ٹوپی میں کیا جانوں کہاں کھو گئی۔ اس کے ساتھ کونے کونے میں تھوڑی بھاگتی پھرتی ہوں۔ مجھے کام کرنا ہوتا ہے، برتن دھونا، کپڑے دھونا، سارے گھر کا کام میرے ذمہ ہے۔ مجھے شعر کہنے کی فرصت نہیں۔ سن لو خوب اچھی طرح سے مجھے کام کرنا ہوتا ہے۔ بھڑ کا چھتہ چھیڑ دیا۔ اب جان بچانی مشکل ہے۔" ۲۷

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

افسانہ ''نیند نہیں آتی'' کا یہ ٹکڑا ان تمام رجحانات کی ہلکی سی جھلک پیش کر دیتا ہے جو انگارے کے افسانوں کا طرۂ امتیاز تھے۔۔۔ موت کا فرشتہ اس خوف کی علامت ہے جو انسان کے ذہن پر موت کے تصور سے حاوی رہتا ہے اور یہ خوف زیادہ تر مذہب کا مسلط کیا ہوا ہے۔۔۔ جب آدمی اپنی فطری جبلت سے مجبور ہو کر ان پابندیوں کو توڑ ڈالنا چاہتا ہے جو اس پر مذہب اور سماجی قوانین عائد کرتے ہیں تو ایک انجانا خوف اسے چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے۔۔۔ یہ خوف موت اور بعد کی سزا کا نامعلوم احساس پیدا کرتا ہے۔۔۔ بچپن سے ذہن میں بیٹھی ہوئی اچھائی یا برائی کا احساس ضمیر بن کر ٹوکتا ہے۔ عقل اور ضمیر کی کشمکش۔۔۔ ماں کی طویل بیماری، مفلسی، بیوی کا لڑنا جھگڑنا، تخلیقی قوتوں کے ضائع جانے کا دکھ، وقت کی کمی۔۔۔ خواہشات کی لامتناہی دعوت نظارہ دیتی وسعتیں، وقت کے گزرنے اور گزرے چلے جانے کا احساس، یہ تمام چیزیں آخر اس تار کو توڑ ڈالتی ہیں جو انسان کے دل و دماغ میں رابطہ قائم رکھتا ہے۔ قوت مدافعت ختم ہو جاتی ہے۔۔۔ اور پھر ہر چیز کی ایسی تیسی کر کے شاید سکون ملتا ہے۔ افسانے کے مندرجہ بالا ٹکڑے میں موت کے فرشتے کو بدتمیز، بے ہودہ، کہہ کر گویا مذہب سے بغاوت کا اعلان ہے اور پھر فرشتے کی ایسی تیسی گویا اس خوف سے نجات پانے کا اشارہ ہے۔ جو موت اور موت کے بعد سزا کا تصور پیدا کر دیتا ہے۔ پھر ساری دنیا کی ''ایسی تیسی'' اس افراتفری، سیاسی انتشار اور عالمی معاشی بحران سے چشم پوشی یا فرار کی علامت ہے جس سے انیسویں اور بیسویں صدی میں ہندوستان اور ساری دنیا دو چار تھی۔۔۔ بیوی بچہ گمشدہ ٹوپی پھٹے کپڑوں کا احساس بیوی کا مسلسل محنت اور چڑچڑا پن بیوی کے جھاڑ کی طرح اُلجھ جانے پر بھبڑ کا چھتہ چھیڑنے کا احساس۔۔۔ تخلیقی قوتوں کا ضیاں۔۔۔ یہ تمام چیزیں ہندوستان کی عام معاشرتی زندگی، مفلسی اور مفلسی سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کی عکاس ہیں۔ ان افسانوں میں بعض جگہ ان اخلاقی اور تہذیبی اقدار تک کا گلہ گھوٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جن کے تحت بزرگوں کا احترام اور والدین کی خدمت اولاد کا فرض بنتا ہے۔۔۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غرض بغاوت سے ہے، مذہب سے بغاوت، تہذیب سے بغاوت، پرانی اقدار سے بغاوت، اخلاقی حدود سے بغاوت، قدیم اقدار سے چمٹے رہنے پر طنز اور تضحیک، یہی ان افسانوں کا انداز ہے۔۔۔لیکن یہ انداز انتہائی مضحکہ خیز۔۔۔بے تکا اور بیہودگی کی حدود سے ملا ہوا ہے۔۔۔ان افسانوں میں سے بعض افسانے تو ایسے ہیں جن کے پیچھے سے سُرخ سُرخ آنکھوں والا ایک نوجوان جھانکتا ہے، جس کا لباس تار تار ہے، جو بار بار نفرت سے زمین پر تھوکتا ہے۔۔۔اور ہر سامنے آنے والے کو گالیاں دیتا جاتا ہے۔

> ''میں آپ لوگوں سے کہنا چاہتا ہوں کہ آپ لوگ بدیشی کا پڑپنا بالکل چھوڑ دیں۔ بے سیطانی گورنمنٹ۔۔۔یہاں پانی سر سے ہو کر پیروں سے پرنالوں کی طرح بہنے لگا۔قدرت مُوت رہی تھی۔سیطانی۔۔۔گورنمنٹ کی نانی، اس گاندھی سے گورنمنٹ کی نانی مرتی ہے۔ہاہا سیطانی اور نانی۔'' ۲۸

اس میں ایک خاص عہد کا سیاسی عکس ہے لیکن لہجہ اعتدال سے گرا ہوا ہے۔ادب میں بے ادبی کا اظہار۔۔۔اس لیے ''انگارے'' کی اشاعت پر لوگ اسی طرح تلملا اٹھے جیسے واقعی زبان سے ''انگارہ'' چھو جائے۔

لیکن شاید یہ رویہ لکھنے والوں نے دانستہ اختیار کیا تھا۔ان کا خیال تھا فرسودہ روایات اور قدامت کے مارے ہوئے لوگوں کو جھنجھوڑنے، جگانے اور نئے راستوں کی طرف متوجہ کرنے کے لیے ''انگارے'' ہی کی ضرورت تھی۔

یہ افسانہ نگار آہستہ خرامی نرم کلامی کے قائل نہیں تھے۔ادب میں سرسید کی اصلاحی تحریک معاشرتی افادیت کی طرف توجہ دلا چکی تھی۔اب یہ نئے لکھنے والے ایک نوع کی انقلابی تحریک لے کر آئے تھے۔خود ملکی سیاست مفاہمت کا راستہ ترک کر کے، بغاوت کے راستے پر چل پڑی تھی۔ان افسانہ نگاروں کا ارادہ ایک ایسا دھماکہ کرنے کا تھا کہ لوگ گہری سے گہری نیند سے بھی چونک پڑیں۔خواہ انھیں غصہ آئے یا وہ نفرت کا اظہار

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کریں۔۔۔لیکن جاگ ضرور جائیں۔۔۔اور اس مقصد میں انگارے کے افسانے کامیاب معلوم ہوتے ہیں۔

محراب و منبر سے اس کتاب کے خلاف ریزولیوشن پاس کیے گئے۔ مولانا عبدلماجد دریا آبادی نے اس کے خلاف تند و تیز مضامین لکھے۔فتوے صادر کیے گئے۔ان کے مصنفین کو قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔۔۔غرض ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور یہ کتاب حکومت سے ضبط کرلی۔

اپنی تمام تر بے ادبی، بے ہودہ زبان اور یاوہ گوئی کے باوجود انگارے کے افسانے نہ صرف افسانہ نگار ہی بلکہ پورے ادب کے لیے ایک نیا موڑ ثابت ہوئے۔یہ ہماری افسانہ نگاری کو دو اہم رجحانات سے روشناس کرا گئے۔"مارکسزم" اور "فرائڈازم" ۔۔۔یعنی ایک کے ذریعے تاریخ کی جدلیاتی اور معاشی تشریح اور دوسرے کی وساطت سے جنسی اور نفسیاتی تشریح۔

اس کے علاوہ ان افسانوں میں پہلی بار دانستہ اور شعوری طور پر ہیئتی تجربہ بھی کیا گیا ہے اور خصوصیت سے شعور کی رو کی تکنیک سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔یہ کوشش اگرچہ خام ہے اور اس کو کامیابی سے نہیں برتا جاسکا ہے لیکن یہ خام کوشش بھی اُردو افسانے کو ایک نئے ہیئتی تجربہ سے روشناس کرانے کا باعث بنی۔اس لیے اہم ہے تکنیک کا یہ انداز بھی اُردو افسانے میں مغربی اثرات کا نتیجہ تھا۔انگریزی ناول نگاری میں اس تکنیک کے نمایاں نام جیمس جوائس اور ورجینا وولف ہیں۔

احمد علی کا افسانہ "مہاوٹوں کی ایک رات" مفلسی اور امارت و ریاست کا ایک ایسا کنڑاسٹ ہے جس میں ایک طرف اس زندگی کی لذتیں، رعنائیاں اور عیاشیاں ہیں جو جاگیرداروں کی زندگی کا لازمی حصہ ہیں اور دوسری طرف تنگ دستی کی ہولناک تاریکی ہے جو سردی کی شدت، بارش سیلے سے تاریک اور نیچے کمرے، گرد اور نمی، چیکتے پھٹے بوریے اور ٹاٹ مٹی کے کالے ٹوٹے پھوٹے برتن۔۔۔اور ہر جگہ سے ٹپکتی چھت کے بیان سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور ہولناک ہوگئی ہے۔۔۔ایک بیوہ عورت چار چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ اس کمرے میں طویل اور ٹھٹھرتی رات گزار رہی ہے۔۔۔لیکن یہ عورت ایک جاگیرداری عہد کی نشانی ہے جو اپنے گزرے وقت کو یاد کر رہی ہے، اس کا محل، نوکر، چھپر کھٹ، سنہری پردوں سے زرق برق مخمل کی چادریں اور شنیل کے تکیئے، ریشمی لحاف اس پر ٹنکا سچا گوٹہ۔۔۔انائیں، مامائیں، کوئی پیر دبا رہی ہے۔۔۔کوئی تیل ڈال رہی ہے۔۔۔ دستر خوان پر چاندی کی طشتریاں، قورما، پلاؤ، بریانی، متنجن، باقر خانیاں میٹھے ٹکڑے وغیرہ۔ اس افسانے میں نہ صرف امیری اور مفلسی کا تضاد ہے بلکہ یہ تضاد جاگیرداری دور کو توڑ کر ایک انتقامی جذبے کے تحت پیش کیا گیا ہے۔ ایک حصہ خیال ہے، دوسرا حصہ حقیقت پہلا حصہ فارغ البالی اور پرتعیش زندگی کا ترجمان دوسرا حصہ مفلوک الحالی کی تصویر ہے۔۔۔ ایک لحاظ سے اس میں یلدرم، نیاز اور پریم چند موجود ہیں۔۔۔مگر دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ دونوں قسم کی زندگی کو پیش کرنے کا رویہ بدل چکا ہے۔ اس افسانے کے مصنف کا ذہن یلدرم، نیاز، پریم چند کے ذہن سے بالکل مختلف ہے۔۔۔یہ صرف جدید ہی نہیں، بلکہ باغی بھی ہے۔ اس افسانے میں ماضی کے رومانی اور حال کی بے رحم حقیقت کے درمیان اشتراکی خیالات اُبھرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ماضی کی روایات اور عقائد کی تضحیک اور حال کی معاشی پریشانیوں سے نفرت کا راستہ اشتراکیت کے راستے سے جا کر مل جاتا ہے۔

> ”ہم کو کس نے بنایا؟ اللہ نے؟ تو پھر ہماری پروا کیوں نہیں کرتا؟ کس لیے بنایا؟ رنج سہنے اور مصیبت اٹھانے کے لیے۔ ارے کیا انصاف! وہ کیوں امیر ہیں۔ ہم کیوں نہیں؟ عاقبت میں اس کا بدلہ ملے گا۔۔۔ضرورت تو اب ہے۔۔۔بخار تو اس وقت چڑھا ہوا ہے اور دوا دس برس بعد ملے گی۔۔۔باز آئے ایسی عاقبت سے۔ جب کی جب بھگت لیتے۔ اب تو کچھ ہو۔۔۔اور مذہب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے وہ بھی یہی سکھاتا ہے۔یہ ہی پڑھاتا ہے۔ پھر کہتے ہیں علم
کا فزانہ ہے۔۔۔اور پھر افلاس کا بہانہ ہے۔۔۔ بے وقوفوں
کی عقل ہے ۔ آگے بڑھتے ہوؤں ،اور چڑھتے ہوؤں اُوپر
چڑھتے ہوؤں کو پیچھے کھینچتا ہے۔۔۔ترقی کے راستے میں ایک
رکاوٹ ہے۔غریب رہو۔غربت میں ہی خدا ملتا ہے۔ہم نے
تو پایا نہیں۔امیروں سے کیوں نہیں روپیہ دلواتا۔" ۲۹

یہ افسانہ فنی اعتبار سے ناقص اور غیر مؤثر ہے۔زیادہ زور بھوک پر ہے۔" بھوک لگی ہے ،دیکھو تو پیٹ خالی پڑا ہے،کل دن سے نہیں کھایا اور نیند بالکل نہیں کلیجہ منہ کو آرہا تھا"۔۔۔بھوک کی شدت اور احساس سجاد ظہیر کے ہاں بھی موجود ہے لیکن اس کا کینوس اس سے بڑا ہے اور اس کے ساتھ اس میں کچھ گہرائی ملتی ہے۔

"کیا ہوا روحانی سکون؟ بس تمہارے لیے یہی کافی ہے۔مگر
میرے پیٹ میں تو دوزخ ہے۔دعا کرنے سے پیٹ نہیں
بھرتا۔پیٹ سے ہوا نکل جاتی ہے بھوک اور زیادہ لگتی ہے۔" ۳۰

(نیند نہیں آتی صفحہ ۳۶۳)

اس کے برعکس احمد علی کا افسانہ "مہاوٹوں کی ایک رات" تنہائی اور لایعنیت کا احساس لیے ختم ہوجاتا ہے۔اس کا معاشی اور معاشرتی تاثر فرد کی تنہائی میں ڈھل ڈھل جاتا ہے۔

"تنہائی، تنہائی۔۔۔۔رات اندھیری اور بھیانک رات۔ارے لادو کوئی جنگل
مجھے۔۔۔جنگل مجھے۔۔۔۔بازار۔۔۔با۔۔۔زار۔۔۔مؤاو جھ۔"

(نیند نہیں آتی صفحہ ۴۷۰)

انگارے کے افسانوں میں ڈاکٹر رشید جہاں کا افسانہ "دلی کی سیر" ہندوستان کی جنسی زندگی کی گھٹن۔۔۔اور اس سے پیدا ہونے والی خرابیوں کا عکس پیش کرتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خصوصیت سے یہ افسانہ عورتوں کی بے چارگی، بے بسی اور مردوں کے ندیدہ پن کو دکھانے کی کوشش ہے۔۔۔عورتوں اور مردوں کی زندگی میں پابندیاں۔۔۔پردہ۔۔۔دوری ۔۔۔اور جہالت مل کر کس قسم کے ماحول کو جنم دیتی ہے وہ ماحول اس افسانے میں موجود ہے۔۔۔

"یہاں میں ریل میں بیٹھ کر دلی پہنچی اور وہاں انکے ملنے والے نگوڑے اسٹیشن ماسٹر مل گئے مجھے اسباب پاس چھوڑ یہ رفو چکر ہوئے اور میں اسباب پر چڑھی بُرقع میں لپٹی بیٹھی رہی۔۔۔ایک تو کمبخت بُرقع۔۔۔اور دوسرے مردودے مرد تو ویسے ہی خراب ہوتے ہیں اگر کسی عورت کو اس طرح بیٹھے دیکھ لیں تو اور چکر پہ چکر لگاتے ہیں یہاں تک کھانے کی نوبت نہ آئی کوئی کمبخت کھانسے۔۔۔کوئی آوازے کسے اور میرا ڈر کے مارے دم نکلا جا رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ہمارے ہندوستانی بھائی بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تکتے رہتے ہیں کم بختو کی آنکھیں نہیں پھوٹ جاتیں ایک میرے سے کہنے لگا ذرا منہ بھی دکھا دو۔۔۔میں نے فوراً۔۔۔"[۱۳]

یہ افسانہ اس ماحول کے منہ پر ایک طمانچہ کی حیثیت رکھتا جو ماحول جہالت اور بے جا پابندیوں سے جنم لینے کا باعث ہو۔اس کے علاوہ اس افسانے میں وہ رجحان اور وہ نفسیاتی اُلجھن ملتی ہے جو جنسی ناآسودگی کے سبب مردوں میں جنم لے سکتی ہے۔

"کوئی سیدھی سادھی لپٹی سمٹی عورت تنہا نظر آئی اور وہ چاروں طرف مکھیوں کی طرح بھنبھنانے لگے۔"

اسی مجموعہ کا ایک اور افسانہ "جوانمردی" بھی معاشرے میں پیدا کی ہوئی اس تفریق کا عکس ہے اور جو عورت اور مرد کی زندگی میں نظر آتی ہے بے بسی عورت کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بے چارگی۔۔۔اور مرد کا جارحانہ رویہ اس افسانے کی بنیاد ہے۔۔۔مرد شادی کے مظبوط حصار میں عورت کو محفوظ کر کے خود باہر کی آزاد زندگی میں کس طرح عیاشیاں کرتا ہے۔۔۔ برسوں وطن سے دور رہ کر جنسی آسودگی کے ہزاروں طریقے اپناتا ہے یا اپنے وطن میں رہ کر بھی وہ ایسے ہزاروں راستے اختیار کر سکتا ہے۔۔۔اس کے پاس اس کے لیے سینکڑوں جواز ہیں ناپسندیدگی یکسانیت سے اُکتاہت۔۔۔بیوی کی بیماری وغیرہ لیکن عورت؟ اسے سوائے اس حفاظت کے جو باپ بھائی یا شوہر مہیا کرتے ہیں اور کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی محمود الظفر کا افسانہ ''جوانمردگی'' اسی حقیقت کو سامنے لانے کی کوشش ہے جو سامنے ہوتے ہوئے بھی نظر کم آتی ہے۔۔۔یا لوگ اس کو دیکھنے کی زحمت نہیں کرتے کیونکہ عورت اتنی ''بے حیا'' نہیں ہوسکتی کہ اس قسم کے مسائل پر آواز اٹھائے۔۔۔اور مردوں کے ہاں یہ مسائل کوئی وجود ہی رکھتے ورنہ مرد اگر اس قسم کے مسائل سے دوچار ہوتا تو اس کی آواز ۔۔۔بے حیائی پر محمول نہیں کی جا سکتی تھی۔۔۔آخر کیوں؟ یہی سوال افسانہ ''جوانمردی'' پڑھ کر ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔

> ''اور میں زندگی کی دوا دوش فضول اور بے فیض عشق بازی سے تنگ آ کر کبھی کبھی اس پاک و باوفا عورت کا خواب دیکھا کرتا تھا جو بلا کسی معاوضہ کے مجھ پر سب کچھ نثار کرنے کے لیے تیار تھی'' ۳۲؎

اس کے برعکس افسانے میں عورت کی تصویر یہ ہے

> ''میں نے ابھی تکیہ کے نیچے سے آپ کا خط نکال کر پڑھا بہت مختصر ہے غالباً آپ اپنے کام میں مشغول ہونگے مگر خیر مجھے اس کی شکایت بس مجھے آپ کی خیریت معلوم ہوتی ہے۔۔۔آپ اچھے رہیں اور خوش رہیں میرے لیے یہی کافی ہے۔'' ۳۳؎

انگارے کے افسانے زندگی کی معاشرتی، معاشی اور جنسی ناہمواریوں پر گہرے طنز کا کھلا اظہار ہیں اگرچہ یہ کوشش پریم چند کے افسانوں میں بھی موجود ہے۔۔۔ان کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تمام افسانے ظلم و جبر اور استبداد کے خلاف ایک قوی آواز کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن انکے یہاں انسان دوستی اور انسانی جذبات اور احساسات کا احترام زیادہ ہے یہ بڑی بات ہے لیکن زندگی کے بڑھتے ہوئے مسائل اور پیچیدگیوں کے سبب صرف ہمدردی اور محبت اور نرم روی ان مسائل کا حل نہیں ہو سکتی تھی اس کے لیے گہرے سیاسی شعور اور اجتماعی بنیادوں پر کسی مضبوط تحریک کی ضرورت تھی اس تحریک کی ابتداء اُردو افسانے میں انگارے کی شکل میں نمودار ہوئی۔

> ''انگارے میں آپ دیکھیں تو نیاز فتح پوری کا جو مذہبی کھوکھلے پن اور انتہا پسندی کے خلاف جہاد تھا وہ بھی پایا جاتا ہے ---ہندوستان کی آزادی کی تحریک ہے اس کے تصورات اور اثرات بھی پائے جاتے ہیں جو مغربی اثرات اور افسانہ نویسی کے فنی لوازم ہیں اور جن کے مدید تجربے یورپ میں ہو رہے تھے یہاں رومانیت اور حقیقت نگاری ایک خاص انداز میں مل گئے ہیں اور وہ انسان دوستی اُبھر آئی ہے جس کی طرف پریم چند مسلسل گھسیٹے لیے جا رہے تھے---اگر آپ غور سے دیکھیں تو انگارے میں بھدی اور ناقص شکل میں سب کی سب چیزیں مل جاتی ہیں اسی وجہ سے جب انگارے کا ذکر آتا ہے تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ اگرچہ وہ افسانے اعلیٰ پائے کے نہیں ہیں غیر پختہ اور ہیجان خیز انقلابی ذہنوں کی تخلیق ہیں یا محض افسانوی ادب میں نئے تجربے لیکن پھر بھی ان افسانوں نے اپنا وہ فرض سرانجام دے دیا جو تاریخ میں انہیں انجام دینا تھا یعنی ان لکھنے والوں میں تجربے کی جرات پیدا کردی۔'' ۳۴

احتشام حسن کی اس رائے پر اضافے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ البتہ ایک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بات کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ انگارے کے افسانوں نے جہاں فکر اور ہیئت کے نئے راستے دکھائے وہاں بے راہ روی کے سارے چسکے پیدا کر دیے۔ آج کے دور کے جدید ترین افسانے اسی کا شکار معلوم ہوتے ہیں۔ انگارے کے بعض افسانے بغاوت کے نام پر فحش گوئی اور جنسی بے راہ روی کی تصویر بن کر رہ گئے ہیں۔ اسکا اعتراف خود سجاد ظہیر نے بھی کیا ہے۔ اس اعتراف میں انگارے کی اشاعت کی تاریخ کا تعین بھی ہوتا ہے۔

> ''الہ آباد میں احمد علی تھے۔ جو یونیورسٹی میں انگریزی کے لیکچرار تھے۔ ۱۹۳۱ء میں میں اپنی طالب علمی کے دوران میں چھ مہینے کے لیے انگلستان سے واپس آ کر لکھنو میں رہا تھا۔ تب ہماری ان کی ملاقات ہوئی تھی اور اسی زمانے میں ہم نے مل کر ''انگارے'' شائع کی تھی۔ دس مختصر افسانوں کے اس مجموعے میں احمد علی کی بھی ۲ کہانیاں تھیں۔ انگارے کی بیشتر کہانیوں میں سنجیدگی اور ٹھہراؤ کم اور سماجی رجعت اور دقیانوسیت کے خلاف غصہ اور ہیجان زیادہ ہے۔ بعض جگہوں میں جنسی میلانات کے ذکر میں لارنس اور جوائس کا اثر بھی نمایاں ہے۔'' ۳۵

دراصل انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتداء میں ہندوستان جس بے چینی، انتشار سے دوچار تھا۔ اس کے اثرات ''انگارے'' کے مصنفین میں مایوسی اور بے بسی کو جنم دینے کا باعث بنے اور چونکہ یہ مصنفین یعنی سجاد ظہیر اور احمد علی مغربی ادب کی رفتار، اس کی سمت، اس کی ہیئت تبدیلیوں اور وہاں کی سیاسی تحریکات سے آگاہ تھے اور اپنے ملک کے روائتی ادب، ماضی پرستی اور مصلحت اندیش سیاست سے بے زار، اس لیے یہ بیزاری بغاوت کا رنگ اختیار کر کے ''انگارہ'' بن گئی۔۔۔ جنس کے موضوع کو جس طرح شجر ممنوعہ سمجھ کر ادب میں اس کے اظہار سے اجتناب برتا جاتا تھا اور اس کے نتیجہ میں ادب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جس جمود کا شکار تھا، انگارے کے مصنفین اس جمود کو توڑنا چاہتے تھے۔ان کے سامنے ایک طرف ان کا ملک تھا جو جہالت، بھوک، جاگیرداری اور غیر ملکی حکومت کے استحصال کا شکار تھا۔دوسری طرف یورپ میں ابھرنے والی نئی سیاسی قوتیں اور تحریکیں تھیں۔جرمنی میں ہٹلر کی ڈکٹیٹرشپ، اسکے خلاف جرمنی کے مفکروں، ادیبوں، شاعروں اور سائنسدانوں کا عملی ،تحریری اور تقریری احتجاج و مترادف کے مقدمہ کی کارروائی کی اشاعت، مسولینی کے بڑھتے ہوئے خطرناک عزائم ، اسپین کی خانہ جنگی اور اس میں دانشوروں اور ادیبوں کی عملی جدوجہد۔آسٹریا میں فاشزم کے خلاف مزدوروں کی زبردست ہڑتال۔۔۔اور ان سب سے بڑھ کر پیرس میں

"ورلڈ کانگریس آف رائٹرز فار دی ڈیفینس آف کلچر"

WORLD CONGRESS OF WRITERS FOR THE DEFENCE OF CULTURE

کا قیام ان تمام سیاسی، معاشی اور ادبی تحریکوں، نظریوں اور عملی جدوجہد نے انگارے کے مصنفین پر گہرا اثر ڈالا۔۔۔ان افسانوں نے جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، ہمارے افسانہ نگاروں کو ہیئتی تجربہ اور ایک نئی تکنیک "شعور کی رَو" سے آگاہ کیا ان میں جیمس جوائس کے اس تخلیقی ہیئتی تجربہ کا انداز بھی موجود ہے۔جو شعور کی رَو کہلانے لگا۔مغرب میں اس تکنیک کے پیشرؤں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ چونکہ انسان کے ظاہر اور باطن میں تضاد ہے۔۔۔وہ جو کچھ سامنے سے دکھائی دیتا ہے۔داخلی حیثیت اس سے مختلف ہوتی ہے۔

شعور کی رَو : اور یہ داخلی حیثیت انسان کی نفسیاتی الجھنوں یا کیفیات سے تشکیل پاتی ہے۔انسان کے اندر مختلف جذبات اور احساسات پیدا ہوتے ہیں۔جنہیں وہ کبھی منظر عام پر نہیں آنے دیتا اور داخلی جذبات اور احساسات پر خوبصورت خول چڑھائے رکھتا ہے۔۔۔ مثلاً ایک گھریلو ملازم جو مالک کی ڈانٹ ڈپٹ پر سر جھکائے کھڑا ہو۔۔۔یا مسکرا کر مالک کا غصہ فرو کرنے کی کوشش کر رہا ہو، وہ اندر سے اسے جان سے مار ڈالنے کی شدید خواہش میں مبتلا ہو سکتا ہے اس کا منہ چڑا سکتا ہے۔۔۔گالیاں بک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سکتا ہے۔۔۔یا ایک بظاہر مہذب آدمی کسی خاتون کے ساتھ بڑے آرام سے پیش آ رہا ہو، چہرے پر شرافت اور پاکیزگی کا خوبصورت نقاب ڈال کر، اس کا ذہن اس عورت کے بارے میں ذلیل ترین تصورات کا منبع و مرکز ہو سکتا ہے۔اسی طرح بعض لوگ جو بظاہر انتہائی غلیظ اور بے پروا نظر آتے ہیں، وہ داخلی حیثیت سے کسی عظیم شخصیت کے مالک ہو سکتے ہیں۔اس لیے اس رجحان کو برتنے والوں کا خیال ہے کہ اگر فرد کو اس کے حقیقی روپ میں دیکھنا ہو تو شعور کی رو کی تکنیک استعمال کرنی چاہیے۔فرد اپنی جگہ خود ایک دنیا ہے۔۔۔اس کا ذہن پوشیدہ معدنیات کا خزانہ ہے۔یہ معدنیات اس کے تحت الشعور اور لاشعور میں جمع ہوتی جاتی ہیں۔کچھ وارثت میں ملتی ہیں، کچھ طفولیت کے عالم میں پیدا ہو جاتی ہیں۔۔۔اور پھر ان میں عمر کیساتھ ساتھ اضافہ ہوتا جاتا ہے۔خیالات ،تجربات، حالات، واقعات، سب مل کر آدمی کے تحت الشعور اور لاشعور کو ایک پوشیدہ خزانہ بنا دیتے ہیں۔''شعور کی رَو'' کی تکنیک اسی خزانے کو دریافت اور برآمد کرنے میں بہت معاون ثابت ہوتی ہے۔۔۔یہ ذہن کے اندر ہیجان برپا کرنے والے مختلف اور متصادم خیالات و جذبات اور احساسات کے نقطۂ اتصال کو تلاش کرتی ہے۔

اس تکنیک کو مختلف مصنفین نے مختلف طریقوں سے برتا ہے۔بعض مغربی ناول نگاروں کے ہاں اس مقصد کے حصول کے لیے مختلف طریقہ کار نظر آتا ہے۔اس میں خود کلامی کی تکنیک بھی استعمال کی جاتی ہے۔جیسے انگارے کے افسانے ''نیند نہیں آتی'' اور ''مہاوٹوں کی ایک رات'' میں موجود ہے۔اس میں کسی ذریعہ سے داخلی کلام اور خود اپنی ذات سے گفتگو دونوں طریقوں سے کرداروں کو ابھارا گیا ہے۔۔۔اس قسم کی تکنیک میں کردار اپنے داخلی جذبات اور خود کلامی کے ذریعہ سامنے لاتا ہے۔۔۔اور لکھنے والے کو کسی طرح بھی اپنی رائے اس کردار کے بارے میں ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔یعنی اس تکنیک کا انداز مجرد خود کلامی کی کیفیت لیے ہوتا ہے۔اس طرح ماحول کے وہ اثرات سامنے آجاتے ہیں جو کردار پر اثر انداز ہوئے ہوں۔اس کی ذہنی کیفیت ،خواہشات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

،زمان ومکان کی قیود سے آزاد ہو کر افسانے سے جھانکتی ہیں۔۔۔اس لیے اس قسم کے افسانوں میں کوئی تکنیکی ربط ہوتا ہے۔۔۔اور نہ واقعات مرتب ہوتے ہیں۔اس میں پلاٹ، کہانی، مرکزی خیال، کوئی چیز اپنی جگہ کوئی وجود نہیں رکھتی۔۔بس خیالات کا ایک بہاؤ ہے، جو ایک چیز سے دوسری چیز اور دوسری چیز سے تیسری چیز میں منتقل ہوتا چلا جاتا ہے۔ شعور کی رَو کی مثال پانی کے اس ذخیرہ کی مانند ہے جس کو مختلف شکلوں کے برتنوں میں انڈیلا جائے تو پانی وہی شکل اختیار کرے گا۔ جو برتن کی ہوگی!

اُردو ناول نگاری میں اس تکنیک کی سب سے نمایاں اور کامیاب مثال قرۃ العین حیدر کا ناول ''آگ کا دریا'' ہے۔۔۔اور انگریزی ادب میں اس تکنیک میں بڑا نام جمیس جوائس کا ہے۔۔۔خصوصیت سے ان کا ناول یولی سز شعور کی رَو کی تکنیک کا شاہکار ہے۔۔۔شعور کی رَو کے تحت لکھے جانے والے افسانے یا ناولوں میں وقت کی حدود مقرر نہیں۔ایک لمحہ صدیوں میں پھیل جاتا ہے۔۔۔کبھی صدیاں لمحوں میں سمٹ آتی ہیں۔تاریکی، روشنی اور روشنی تاریکی بن جاتی ہے۔۔۔''نیند نہیں آتی'' کا ایک کردار اکبر رات کی تاریکی تکیہ کے غلاف کی سفیدی کے تضاد سے تاریکی میں روشنی دیکھتا ہے۔۔۔ اور اچانک اس کے ذہن پر اس کے دوست کا چہرہ ابھر آتا ہے۔۔۔اس کے بعد کردار کی سوچ اور وہ گفتگو جو وہ اپنے اندر اپنے آپ سے کرتا ہے۔۔۔ابھرتی ہے۔دوست کا چہرہ مالک کا چہرہ یاد دلاتا ہے۔۔۔اور یوں یہ چہرے بدلتے جاتے ہیں۔۔۔''شعور کی رَو'' کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس تکنیک کے تحت سامنے آنے والے کردار معروضی حیثیت میں حرکت کم کرتے ہیں اور ذہنی سطح پر وہ زیادہ متحرک دکھائی دیتے ہیں۔۔۔اس لحاظ سے اس میں بالعموم جسم گم ہو کر ذہن بن جاتا ہے بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ''شعور کی رَو'' خیالات کے اس جنگل کو سامنے لاتی ہے جو انسانی ذہن میں ''خودرَو'' یا ان خیالات اور تصورات سے پٹا پڑا ہوتا ہے جو معروضی حالات اور سماجی کیفیت سے مل کر پیدا ہوتے ہیں۔۔۔اس جنگل میں آدمی گم ہو جاتا ہے اور وہ حالات ابھر کر سامنے آجاتے ہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جو آدمی کو گم کرنے کا سبب ہوں۔۔۔ جدید دور میں زندگی کی پیچیدگیوں، بڑھتے ہوئے سماجی مسائل اور ان میں ڈوبا ہوا انسان اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا احساس تنہائی اور محبت و رفاقت سے محرومی کے پس منظر میں ''شعور کی رَو'' کی یہ تکنیک۔ یقیناً اس عہد کے آدمی کو سمجھانے اور پیش کرنے اور اس کی محرومیوں کو کچھ کم کرنے میں معاون ثابت ہو سکتی ہے۔۔۔ لیکن اس کے استعمال کے لیے بہت بڑے ذہن کی ضرورت ہے۔ ایک ایسا ذہن جو انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا تاریخی شعور رکھتا ہو۔ اس کے بغیر اس تکنیک کا استعمال مضحکہ خیز کوشش بن کر رہ جاتی ہے۔

آج کی دنیا بے شمار مسائل سے دوچار ہے۔ عالمی زندگی تیزی سے کروٹیں بدل رہی ہے۔ خوف و ہراس بے یقینی اور تذبذب نے انسانی ذہن کو خیالات کے اعتبار سے بہت الجھا دیا ہے۔ پھر آدمی کا اپنا معاشرہ اور اپنا ماحول ہے۔ یہ بھی اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا اور وہ ٹوٹ جاتا ہے۔۔۔ بکھر جاتا ہے۔ ایسے حالات میں اس کا ذہن نفرتوں، رقابتوں اور مختلف قسم کے خوف کی آمجگاہ بن کر اسے ایسے احساسات کے اندھیروں میں بھٹکانے لگتا ہے جس میں بغاوت جنم لیتی ہے اور قتل کر دینے کی خواہش پیدا ہوتی ہے لیکن ان تمام چیزوں کا اگر کامیاب تجزیہ کیا جائے اس کے پیچھے ایک ہی چیز نظر آتی ہے۔ محبت اور سکون کی تلاش۔۔۔ یہ کامیاب تجزیہ شعور کی رَو کے تحت جسے نفسیاتی تجزیہ بھی کہا جا سکتا ہے ممکن ہے۔۔۔ لیکن اس کے لیے شرط وہی ہے کہ لکھنے والا انسانی زندگی کا تاریخی شعور رکھتا ہو۔۔۔ یعنی اس کا ذہن ایک ایسا آئینہ ہو جس میں اجتماعی زندگی کا عکس نظر آ سکے۔ بصورت دیگر لکھنے والا صرف نفسیاتی الجھنوں کی ایک ایسی تصویر پیش کر سکے گا جو ذاتی اور محدود ہونے کی بنا پر بے کار اور بے مصرف اور بعض معنوں میں مضحکہ خیز ہو سکتی ہے۔ نفسیاتی تجزیہ کا یہ رجحان فرائڈ کے نظریات میں ایک نظریہ تحلیل نفسی کے تحت اُردو افسانے میں آیا۔

سگمنڈ فرائڈ نے تحلیل نفسی کے تحت پہلی بار لاشعوری قوتوں کو دریافت کیا اور ان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی اہمیت پر بحث کی تحلیل نفسی، اس کی تعلیمات کا ایک ایسا مرکز ہے جس کے تحت وہ مختلف نفسیاتی بیماریوں اور کمزوریوں کا تجزیہ کرتا ہے۔۔۔اس تجزیہ میں ایڈی پس کا الجھاؤ، لاشعور کی تشریح، خود جنسیت، طفلانہ جنسیت، لیسبیڈو، نظریہ خواب جیسی نفسیاتی الجھنیں اور نئی اصطلاحات وضع ہوئیں۔۔۔تحلیل نفسی میں شعور، تحت شعور اور لاشعور کو سامنے لا کر ان وجوہات کو تلاش کیا جاتا ہے جو آگے بڑھ کر کسی بھی الجھن کا باعث بن سکتی ہیں۔۔۔فرائڈ کے نزدیک انسان کے تمام اعمال کے پیچھے اصل محرک جنس ہے۔ یہ قوت مختلف حالات کے تحت مختلف روپ اختیار کر لیتی ہے۔ محبت، جبر، نفرت، خوشی، گھٹن، بے خوابی، کم آمیزی، ہسٹریا۔

> ''جنسی تحریکات نے انسانی ذہن کی ثقافتی، فنکارانہ اور سماجی نوعیت کی اعلیٰ ترین کارگزاریوں کی تشکیل میں اہم ترین کردار ادا کیا ہے'' ۳۶ے

یہی نہیں بلکہ فرائڈ کے خیال میں جنس ہی وہ جذبہ ہے جو اپنے مثبت انداز میں انسان میں تخلیقی صلاحیتیں پیدا کر کے اسے وہ قوت عطا کرتا ہے جس کے تحت وہ بعض اوقات اپنے اندر ماورائی قوتیں پاتا ہے۔۔۔اور یہ قوتیں اسے ترقی اور کامیابی سے ہمکنار کر کے دائمی زندگی نوازدیتی ہیں۔ لیکن یہی قوت اپنے منفی انداز میں ذہنی اور نفسیاتی بیماریوں کو جنم دیتی ہے۔۔۔جو کبھی ہم جنسیت، کبھی خود جنسیت، کبھی ایڈی پس الجھاؤ۔۔۔ اور کجروی کے دوسرے راستے اختیار کر لیتی ہے اور کبھی اس میں جبر، تشدد اور ایذا رسانی کے طریقے انسان اپنے لیے اور دوسروں کے لیے اپنا لیتا ہے۔ یہ منفی قوت بالعموم ناآسودہ خواہشات کے تحت پیدا ہوتی ہے اور یہ ناآسودہ بھی بالعموم جنسی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ فرائڈ کا کہنا ہے کہ:

> ''ایام طفلی سے ہی ہم جنسی جبلت کو جتنا دبا کر اس کی مختلف صورتوں پر جتنی زیادہ کڑی پابندیاں عائد کی جاتی ہیں شاید ہی کسی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور جبلت کے ساتھ یہ برتاؤ روا رکھا جاتا ہو اس لیے کسی اور جبلت کے اتنے قوی اور شدید نوعیت کی لاشعور میں خواہشات کے آثار باقی نہیں رہ جاتے۔" ۳۷

حسن عسکری نے فرائڈ کے سلسلے میں لکھا ہے:

بیسویں صدی کے ادب پر فرائڈ کا اتنا گہرا اثر ہے کہ اس معاملہ میں گذشتہ پچاس سال کا کوئی دوسرا مفکر اس کی برابری نہیں کرسکتا۔ فرائڈ نے بیسویں صدی کے ادیبوں کو ایک طرز احساس بلکہ زندگی کو تجربہ میں لانے کا ایک خاص اسلوب بخشا ہے۔ اس سے بڑی بات کسی مفکر کے بارے میں اور کیا کہی جا سکتی ہے۔۔۔ اگر فرائڈ نہ ہوتا تو جوائس نہ ہوتا، کافکا نہ ہوتا۔۔۔ ٹی ایس ایلیٹ صاحب یوں فرائڈ پر جتنی چاہے فقرے بازی کریں، لیکن فرائڈ کے بغیر خود ان کی شاعری کی شکل یہ نہ ہوتی، جو اب ہے پھر بیسویں صدی کی سب سے بڑی تحریک SURRIALISM بھی فرائند کے بغیر ناممکن تھی۔ اس گروہ کی تخلیق اور سماجی تنقید دونوں اسی کی مرہونِ منت ہیں۔۔۔۔۔۔ ادب سے فرائڈ کا جو تعلق ہے وہ صرف ادبی تاریخ کا معاملہ نہیں۔ دیکھنے کی چیز تو یہ ہے کہ گزشتہ سو سال سے جو روح ادیبوں میں کام کر رہی ہے وہی فرائڈ میں تھی۔" ۳۸

"انگارے" کے افسانوں میں فرائڈ کے اثرات کے علاوہ دوسرا بڑا رجحان مارکسی نظریہ کا بھی موجود ہے۔۔۔ فرائڈ کے برعکس مارکس انسان کے تمام اعمال اور تصورات کا محرک اقتصادی ضرورت کو قرار دیتا ہے۔۔۔ اس کا خیال ہے کہ زندہ رہنے کے لیے انسان کو خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔ وہ زندگی بھر جدو جہد کرتا ہے تاکہ اس کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تمام مادی ضروریات پوری ہوسکیں۔۔۔ان ضروریات کی تکمیل کے لیے جب انسان جد جہد کرتا ہے اس جدو جہد سے خیالات، احساسات، قانون یا مذہب کی شاخیں پھوٹتی ہیں۔۔۔انسان کا ذہن اپنے گردو پیش سے آزاد نہیں رہ سکتا۔اس کے خیالات وافکار پر اس کے معاشی حالات اثر انداز ہوتے ہیں یعنی معیشی اور معاشرتی حالات ہی انسان کے تصورات میں تبدیلی لانے کا باعث بنتے ہیں۔

> ''خیالات، نظریے اور عقیدے انسانوں کے دماغ میں نہ خود رو ہوتے ہیں اور نہ آسمانوں سے نازل ہوتے ہیں مادی حالات زندگی، یعنی وہ وسیلے اور طریقے وہ آلات اور ذرائع پیداوار اور رسل ورسائل جنھیں استعمال کر کے انسانوں کے گروہ اپنے کھانے پینے اور رہنے سہنے کے وسائل حاصل کرتے ہیں۔انسانی معاشرے کی شکل وصورت متعین کرتے ہیں۔انسانی معاشرہ یا سماج کیا ہے؟ مختلف طبقے اور ان باہمی رشتے لیکن طبقہ اور رشتے خود مادی حالات زندگی سے پیدا ہوتے اور مٹتے، بنتے، بگڑتے اور بدلتے رہتے ہیں۔خیالات، نظریہ، فلسفیانہ تصورات، عقائد انسان کے ذہن اس کے مادی حالات زندگی اور اسکی بنیاد پر پیدا ہونے والے اجتماعی رشتوں اور مختلف قسم کے (سیاسی، مذہبی، تہذیبی) اجتماعی سماجی عمل اور ان سے پیدا ہونے والی زندگی کے عکس ہیں۔ان خیالات اور نظریات سے مدد لے کر انسان پھر اپنی معاشرت کو سمجھتے ہیں۔'' ۳۹

مارکسی نظریہ میں تاریخی شعور کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔۔۔اس تاریخی شعور کی بنیادی خود مادی حیثیت پر قائم ہے۔۔۔اور جب بھی کسی معاشرے یا سماج میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا ہوئی ۔۔یا تبدیلی لانے کا احساس پیدا ہوا تو اس احساس کے پیچھے انسان کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مادی اور اقتصادی ضروریات کا ہاتھ یقیناً رہا۔ مارکس کے مطابق ابتداء اُسے انسانی زندگی کے ارتقاء پر نظر ڈالنے سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ انسان کے خیالات و تصورات اور اعمال میں تبدیلیاں لانے والی اصل چیز پیداواری قوت ہے اور اس پیداواری قوت کو پیدا کرنے والی اصل قوت وہ محنت ہے جس کے تحت پیداوار بڑھتی ہے ___ اس کے ساتھ ہی ''پیداواری حالات'' اتنے ہی اہم ہیں، جتنی وہ قوت جو محنت اور جسمانی، مشقت سے پیدا ہوتی ہے ___ ان حالات کے تحت یا ردعمل کے طور پر معاشرتی، قانونی اور سیاسی اداروں میں ردوبدل ترقی یا تنزل ہوتا ہے اور کسی حد تک یہ حالات فلسفیانہ خیالات، مذہبی اور اخلاقی احساسات تک کو متاثر کرتے ہیں۔۔۔ دراصل انسان کا ذہن اپنے اردگرد سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ وہ ان حالات کا اثر قبول کرتا ہے جن حالات سے معاشرہ دوچار ہو۔۔۔ اور پھر ان اثرات کا عکس ان نظریات اور خیالات میں بھی نظر آنے لگتا ہے جو نظریات وہ پیش کرے۔ اقتصادی بنیاد ہی پر معاشرہ کھڑا ہے۔ یہ اقتصادی قوت جدلیاتی طور پر کام کرتی ہے اور نئے حالات اور نئے تقاضوں کے تحت معاشرے میں تبدیلی کی ضرورت پیدا کرتی ہے۔ اس وقت پرانے سماجی رشتے جو پرانی پیداواری قوتوں کے پیدا کردہ ہوتے ہیں ___ ان میں اور نئے حالات کے مطابق ڈھلے ہوئے سماجی رشتوں میں تصادم ہو جاتا ہے۔۔۔ اس تصادم کے نتیجہ میں پرانی روایات یا اقدار میں ٹوٹ پھوٹ کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور بالآخر جلد یا دیر سے پرانی پیداواری قوتوں کے تحت تشکیل پانے والا نظام کمزور ہوئے نئے تقاضوں کے تحت تبدیل ہونے لگتا ہے۔

کارل مارکس یہودی نژاد تھا۔ اس نے بعد میں یہودی مذہب ترک کر کے عیسائیت قبول کر لی تھی۔ اس نے سرمایہ داری کو ختم کرنے کے لیے اپنی تمام ذہنی اور جسمانی قوتوں کو استعمال کیا اور اسی مقصد کے لیے اس نے اپنے برسلز کے قیام کے دوران COMMUNIST MANIFESTO اشتراکی منشور شائع کیا۔ اس کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بعد اس نے

1. DAS KAPITAL 2. THE CRILQUEE OF POLITICAL ECONOMY.

3. CIVILISATION IN FRANCE 4. PHILOSOPHY OF POVERTY.

وغیرہ جیسی کتابیں تصنیف کیں۔ یہی نہیں بلکہ ۱۸۶۴ء میں اس نے فریڈرک اینگلز کے ساتھ مل کر پہلی بین الاقوامی مزدور انجمن قائم کی۔۔۔ مارکس انسان کی فطری نیکی، یا روحانی حیثیت پر یقین نہیں رکھتا۔۔۔ اسکا خیال ہے کہ انسان خود مادی حیثیت رکھتا ہے۔۔۔ اور اس کی زندگی کا دارومدار اس کی مادی ضروریات کی تکمیل پر ہے۔۔۔ جس میں اولیت خوراک کو حاصل ہے۔۔۔ اس کے فلسفہ کو بالعموم تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(۱) تاریخ کی مادی تعبیر (۲) نظریہ قدر روزائد (۳) طبقاتی جنگ۔

مارکس دنیا بھر کے مزدوروں میں اتحاد اور سرمایہ داری کے خلاف جنگ کا پرچار کرتا ہے۔

۱۹۱۷ء میں جب روس میں انقلاب آیا تو مارکس کے دن نظریات نے فروغ پایا زندگی کا ہر شعبہ اشتراکی تحریک اور نظریات سے متاثر ہوا ادب اور ادیبوں نے بھی اس سے دیرپا۔ گہرے اثرات قبول کئے۔

ہندوستان میں بھی انیسویں صدی میں انگریزوں کے معاشی اور سیاسی غلبہ کے باعث اقتصادی زندگی میں بحران کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی اور وہ معاشرہ ٹوٹ کر بکھر چکا تھا جو بادشاہت اور خود کفیل فنکارانہ مہارت یا دستی صنعتوں کے سبب قائم تھا۔ اس کی وجوہات مختلف تھیں جن کی تفصیل کی بیان گنجائش نہیں۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستان زبردست سیاسی ہلچل کا شکار ہوگیا اور ساتھ ہی اقتصادی حالات اور بھی دگرگوں ہوکر رہ گئے۔ مسلسل سیاسی اور معاشی جبر کے نتیجہ میں ہندوستان میں آزادی کی تحریک شدت اختیار کرنے لگی۔۔۔ جس کے نتیجے میں مختلف تحریکیں ابھریں۔ ان تحریکوں میں بعض تحریکیں مذہبی حیثیت سے انتہا پسندی کا رجحان لیے ہوئے ہیں اور بعض تحریکیں فرقہ پرستی کو ہوا دے کر خود مالی حیثیت میں پھلے پھولے بھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھیں۔۔۔انہی کے درمیان ایک گروہ وہ بھی تھا جو سنجیدگی سے ہندوستان کی زندگی کی اصلاح اور حقیقی آزادی کا تصور رکھتا تھا۔اس گروہ میں مسلمانوں میں ابوالکلام آزاد، شبلی، مولانا ظفر علی خان، اقبال وغیرہ شامل تھے۔۔۔اسی کے ساتھ ایک اور طبقہ بھی دوسرے نظریہ کا حامل تھا اُبھرتا نظر آتا ہے۔۔۔یہ دوسرا نظریہ سوشلزم تھا۔اس نظریہ کے تحت بمبئی، کلکتہ، کانپور اور احمد آباد کے ملوں، ریلوے ورکشاپوں کوئلے کی کانوں اور مختلف شعبوں کے مزدوروں کا اتحاد، ان کی طبقاتی کش مکش، ہڑتالیں وغیرہ اس بات کی نشاندہی کرتی تھیں کہ اس طبقے میں طبقاتی شعور پیدا ہونے لگا ہے۔ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۵ء تک درمیانہ طبقہ کے بعض پڑھے لکھے لوگوں میں سوشلزم کا نظریہ خاصا مقبول نظر آتا ہے۔۔۔ نہرو نے جو اپنی سوانح حیات لکھی اس میں بھی انہی نظریات کا عکس موجود ہے۔سوشلزم کے تحت بنیادی ،سیاسی ،تہذیبی اور سماجی تبدیلیوں کا اصل محرک محنت کش طبقہ کو قرار دیا گیا۔۔۔اور اس لیے یہ لازمی قرار پایا کہ اقتصادی حیثیت اس طبقہ کی حالت بہتر بنائی جائے۔جس کی اجتماعی قوت تبدیلی لانے کا باعث ہوسکتی ہے۔۔۔اس نظریے کے حامل بیشتر نوجوانوں کا عقیدہ یہ تھا کہ قدیم معاشی، سیاسی اور تہذیبی دور کو جدید تقاضوں کے پیش نظر یہ دوبارہ رائج نہیں کیا جاسکتا ہے اور نہ ماضی کا نظام جدید عہد میں مفید ہوسکتا ہے۔۔۔ لیکن اسی کے ساتھ آرٹ، ادب علم وفن یا اخلاق پر جو قیمتی سرمایہ ماضی بہم پہنچا چکا ہے، اس کو مناسب طریقہ سے برتنے، اس سے آئندہ زندگی میں راہنمائی حاصل کرنے اور اس کی حفاظت کو وہ ضروری خیال کرتے تھے۔۔۔انہی خیالات کے تحت ترقی پسند ادبی تحریک کا آغاز ہوا۔۔۔ترقی پسند ادبی تحریک کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے سجاد ظہیر نے لکھا ہے۔

> جب ہم نے ترقی پسند ادبی تحریک کی تنظیم کی جانب قدم اٹھایا، تو چند باتیں خصوصیت کے ساتھ ہمارے سامنے تھیں۔ پہلے تو یہ کہ ترقی پسند ادبی تحریک کا رُخ ملک کے عوام کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جانب، مزدوروں، کسانوں اور درمیانہ طبقہ کی جانب ہونا چاہیے
ــــ ان کو لوٹنے والوں اور ظلم کرنے والوں کی مخالفت کرنا، اپنی
ادبی کاوش سے عوام میں شعور، حس حرکت، جوش عمل، اور اتحاد پیدا
کرناــ اور تمام ان آثار اور رجحانات کی مخالفت کرنا جو جمود
، رجعت، پست ہمتی پیدا کرتے ہیں ـــ ہمارا اولین فرض
ٹھہرا۔" ۹۳

دراصل سجاد ظہیر اور ان کے ساتھی جو یورپی ممالک اور ہندوستانی زندگی کے تضاد کو دیکھ چکے تھے، وہ اپنی سیاسی سوجھ بوجھ کے تحت ان حالات سے آگاہ تھے، جو دنیا بھر میں تہلکہ مچائے ہوئے تھے، اور جن کے سبب سیاسی اعتبار سے بڑی تبدیلیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ شکست و ریخت کے اس سیاسی کھیل کے پس منظر میں نئے حالات جنم لے رہے تھے۔ تہذیبیں اپنا لباس تبدیل کر رہی تھیں، اور نئے اقتصادی ڈھانچے تعمیر ہو رہے تھے ـــ انھوں نے مغربی ادیبوں کی ہمت اور حوصلہ کو بھی دیکھا تھا جو پوری سنجیدگی اور شدت سے آمریت اور فسطائیت کے خلاف آواز بلند کر رہے تھے۔ ۱۹۳۲ء۔ ۱۹۳۳ء کے معاشی بحران کے سیاسی اثرات اور ان کے تحت جرمنی میں ہٹلر کی ڈکٹیٹر شپ کا وجود، کارخانوں میں مزدوروں کی منظم قوت کے تحت پیدا ہونے والا انقلابی جماعتی شعور جرمنی میں بلغاریہ کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر رونروف کا مقدمہ اور اس کے وہ بیانات جو وہ جسمانی اذیتوں اور سزاؤں کی دھمکیوں کے باوجود دیتا رہا اور جن بیانات میں وہ اپنے ساتھیوں کی بے گناہی ثابت کرنے کے علاوہ جرمن فاشزم کو اعلانیہ مجرم قرار دیتا تھا۔ اسکے بعد امریکہ، انگلستان اور فرانس میں مترد ف کی رہائی کے لیے مزدوروں کے بڑے بڑے اجتماعات، فرانس میں مزدوروں کی ہڑتال (۱۹۳۳ء) آسٹریا میں ڈالفس کی آمرانہ حکومت ویپٹنا، لنز، گراتز یعنی آسٹریا کے تمام بڑے صنعتی شہروں میں مزدوروں کا اس آمرانہ حکومت کے خلاف احتجاج، مزدوروں اور سرکاری فوج میں لڑائی اور ناکام مزدور انقلاب، یہ تمام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

واقعات، جدوجہد اور بین الاقوامی جنگ اور دنیا کے اس سیاسی اقتصادی بحران سے پیدا ہونے والی صورت حال کے اثرات اس وقت ہندوستانی طلبہ کے اس گروہ نے بھی شدت سے محسوس کیے جو تعلیم کے لیے اس وقت لندن میں مقیم تھا۔ اس وقت انکے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا وہ اپنی نجی زندگی کو انسان کی اس مجموعی بے چینی، ہلچل اور پریشانیوں سے الگ رکھ کر خوش رہ سکتے ہیں اور اس سوال کا جواب انھوں نے مارکس اور دوسرے اشتراکی مصنفین کی تحریروں میں تلاش کرنا شروع کیا۔ اس تلاش کا بنیادی مقصد ایک ایسے فلسفہ کی دریافت تھا جس میں انسانی زندگی کی الجھنوں، معاشی اور سماجی پیچیدگیوں کو سمجھنے اورانھیں حل کرنے کی کوئی راہ مل سکے۔ انھوں نے ۱۹۳۵ء میں انڈین پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن

INDIAN PROGRESSIVE WRITERS ASSOCIATION

کے نام سے لندن میں ایک انجمن قائم کی، جس کے ارکان میں سرفہرست سجاد ظہیر، ڈاکٹر ملک آنند، پرموسین گپتا، ڈاکٹر محمد دین تاثیر وغیرہ نمایاں تھے۔

تقریباً اسی زمانے یعنی ۱۹۳۵ء میں ہی مشہور فرانسیسی ادیب ہنری باربس کی کوششوں کے سبب بین الاقوامی مصنفین کی کانگریس برائے تحفظ کلچر پیرس کے مشہور ہال "بال بولئے" میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں پہلی بار قریب قریب پوری دنیا کے ادیب ایک جگہ جمع ہوئے تھے ان سب کو ایک جگہ جمع کرنے والے ادیبوں میں میکسم گورکی، آندرے مالرو، ٹامس مان، رومین رولان جیسی ہستیاں شامل تھیں۔ اس کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ انسانی زندگی کی تہذیب اور تمدن کو رجعت پرستی اور مائل بہ زوال ہونے سے بچانے کے لیے ادیب اپنی قوتوں کو مجتمع کر کے ترقی اور فلاح کے راستے تلاش کریں۔ اگرچہ اس کانفرنس میں مختلف خیال، مختلف عقیدوں اور مختلف نظریوں سے تعلق رکھنے والے ادیب جمع تھے لیکن ایک بات جس پر سب متفق تھے۔ وہ یہ کہ ادیبوں کے لیے آزادیٔ رائے اور آزادیٔ اظہار ضروری ہے۔ ان کے سامنے اس وقت اس خیال کو تقویت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بخشنے والی سب سے بڑی مثال چین کی تھی۔اس وقت چین، جاپان سرمراج کے خلاف نبرد آزما تھا۔۔چین کے بڑے ادیب، شاعر، ڈرامہ نگار، ناول نگار اور فلسفی اپنی دماغی قوتوں کو اپنے ملک کی آزادی اور کامیابی کے لیے استعمال میں لا رہے تھے جو ادبی لطافت کو برقرار رکھتے ہوئے۔۔۔چینی عوام کو اس حقیقت سے بھی آگاہ کر رہے تھے کہ ان کی آزادی سب سے قیمتی چیز ہے وہ اپنی تحریروں کے ذریعہ چینی عوام میں جاپانی سامراجیت کے خلاف جنگ کے احساسات کو بیدار کر کے انھیں نفسیاتی طور پر جنگ کے لیے آمادہ کر رہے تھے۔

یہ تھے وہ عالمی حالات جن کے زیر اثر ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کی ابتداء ہوئی اور جس کا سنگ بنیاد ۱۹۳۵ء میں لندن میں چند ہندوستانی طلباء کے ہاتھوں رکھا گیا۔اس تحریک کے ابتدائی نقوش ''انگارے'' کے افسانوں میں بھی جھلکتے ہیں۔اس تحریک کا مقصد جیسا کہ سجاد ظہیر کے بیان سے بھی واضح ہوتا ہے اس طبقہ کی فلاح و بہبود کا خیال رکھنا تھا جو اپنی محنت سے دولت پیدا کرتا ہے۔ان کے بقول سیاسی اور سماجی نظام اور ان کے تحت پیدا ہونے والی تہذیب، نظریات اور عقائد کا ڈھانچہ اس محنت پر قائم ہوتا ہے جو انسان آلات اور مختلف فنون کے حصول کے لیے کرتا ہے۔۔اس لیے ضروری قرار پایا کہ اقتصادی نظام کو بدلا جائے۔۔ان کا خیال تھا کہ اقتصادی نظام کی تبدیلی سے ان لوگوں کو فائدہ پہنچے گا جو جاگیرداری نظام کے تحت مفلوک الحال سے دوچار ہیں۔۔اور اس طرح وہی لوگ اس تبدیلی کے لیے برسر پیکار بھی ہوسکتے تھے جن کو اس تبدیلی سے فائدہ پہنچنے کا امکان ہو۔۔اس لیے ترقی پسند تحریک کا بنیادی مقصد ان لوگوں کو جگانا، ہمت دلانا، ان میں اتحاد اور یگانگت پیدا کرنا قرار پایا جو پیداواری قوتوں کے مالک تھے۔۔ان کی حالت بہتر بنانے کے علاوہ اس تحریک کا مقصد نئی تہذیب کی تخلیق تھا۔ان کے خیال میں گزرا ہوا دور سرمایہ داری یا شہنشاہیت پر قائم تھا۔اس کی بنائی ہوئی تہذیبی اقدار اور عقائد جدید عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہوسکتے۔۔۔جدید عہد کو نئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خیالات، نئے عقائد اور نئے اقتصادی نظام کی ضرورت تھی اور اس ضرورت کی تکمیل وہ مارکسی نظریہ کے تحت جاگیرداری نظام کو توڑ کر ہی کر سکتے تھے۔اس کے لیے انھیں مزدوروں، کسانوں اور نچلے متوسط طبقہ کی مدد درکار تھی اور یہ سب کچھ ممکن بنانے کے لیے ترقی پسند تحریک کے ارکان نے یہ متفقہ فیصلہ کیا کہ ادیب سیاسی زندگی سے کنارہ کش ہو کر نہ رہیں بلکہ اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق اپنے قلم کی وساطت سے تحریک آزادی میں حصہ لیں اور یہ تحریک اسی صورت میں کامیابی سے ہمکنار ہوسکتی تھی جب اس میں عوام کی اکثریت شامل ہوتی اور عوام کی اکثریت اس غریب اور مظلوم طبقہ پر مشتمل تھی جو اپنی محنت اور جسمانی مشقت سے مادی پیداوار میں اضافہ کرتے تھے۔اسی لیے ترقی پسند ادبی تحریک کے مصنفوں نے اس طبقہ کی حالت بہتر بنانے پر زور دیا جو مزدوروں، کسانوں اور محنت کش، عوام پر مشتمل تھا۔ان کا خیال تھا کہ ترقی پسند ادیب کے دل میں نوع انسان سے انس اور گہری ہمدردی ضروری ہے۔بغیر انسان دوستی آزادی کی تمنا،اور جمہوریت پسندی کے ادیب کا ترقی پسند ہونا ممکن نہیں۔سجاد ظہیر رقمطراز ہیں کہ:

> ''اسی وجہ سے ہم اعلانیہ اور دانستہ طور پر ترقی پسند ادبی تحریک کا رشتہ ملک کی آزادی اور جمہوریت کی تحریکوں کے ساتھ جوڑنا چاہتے تھے کہ ترقی پسند مزدوروں کسانوں، غریب اور مظلوم عوام الناس سے ملیں۔ان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کا حصہ بنیں۔'' [۱۴]

ترقی پسند ادبی رجحانات کے حامل ادیبوں کا ایک اور خیال یہ بھی تھا کہ ''دانشوروں کے لیے ادبی تخلیق کے ساتھ ساتھ عوامی زندگی سے زیادہ سے زیادہ قرب ضروری ہے۔'' جب تک ادیب دانشور عوام سے قریب نہ ہوں یا ان کی زندگی سے واقف نہ ہوں ۔ یا ادب پیدا نہیں ہوسکتا۔۔۔ترقی پسند ادیب مشرق کی ایسی روحانی اقدار سے واقف نہ ہوں۔نیا ادب پیدا نہیں ہوسکتا۔۔۔ترقی پسند ادیب مشرق کی ایسی روحانی اقدار

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے بھی اختلاف رکھتے تھے۔ جو ان کے خیال میں گوشہ نشینی کی طرف لے جاتی ہیں اور در پردہ جاگیر داری عہد کے عقائد اور نظریات کا پرچار کر کے رجعت پرستی سکھاتی ہیں۔ جس کی وجہ سے سماجی زندگی میں جمود کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔۔۔ اور جمود معاشرے میں سڑاند پیدا کر دیتا ہے جب کہ آگے بڑھنے کے لیے مسلسل حرکت اور عمل ضروری ہے۔۔۔ اس حرکت اور عمل کے لیے ترقی پسند ادبی تحریک کا قیام عمل میں لایا گیا۔

ہندوستان میں ترقی پسند ادبی تحریک کا پہلا اجلاس ۱۹۳۶ء میں لکھنو میں ہوا جس کی صدارت منشی پریم چند نے کی۔ اس کانفرنس کے منشور میں یہ بات کہی گئی تھی۔

> ''ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں اور ادب میں سائنسی عقلیت پسندی کو فروغ دیتے ہوئے ترقی پسند تحریکوں کی حمایت کریں اور ان کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کے انداز تنقید کو رواج دیں جس سے خاندان، مذہب، جنس، جنگ اور سماج کے بارے میں رجعت پسندی اور ماضی پرستی کے خیالات کی روک تھام کی جا سکے کہ وہ ایسے ادبی رجحانات کو نشو و نما پانے سے روکیں جو فرقہ پرستی، نسلی تعصب اور انسانی استحصال کی حمایت کرتے ہیں۔'' ۴۲

جہاں تک جدید اُردو ادب کا تعلق ہے جس میں شعوری حیثیت سے ادب کا تعلق براہِ راست زندگی اور سماجی قدروں پر استوار کرنے کی کوشش ملتی ہے۔ اس ادب کا آغاز تو سرسید تحریک کے بعد ہی سے ہو گیا تھا۔ جس میں سرسید کے تمام رفقاء کے علاوہ بعد میں اقبالؒ کی کوششیں بھی شامل ہیں۔

سرسید تحریک نے ادب کو ایک ایسا وسیلہ بنایا جس نے سماجی خامیوں، تنگ نظریوں اور غیر عقلی رجحانات کو ختم کر کے زندگی کے جدید تقاضوں کے مطابق نئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اصول، نئے رجحانات اور نئے نظریوں کو جنم دیا۔

"ہر نئی تحریک اور ہر نئی ادبی تخلیق اپنی انفرادی شکل لے کر آتی ہے۔ اس سے ترقی پسند تحریک سرسیدؔ، حالیؔ، شبلیؔ، اکبرؔ، اقبالؔ وغیرہ کی جمہوری روایات کا تسلسل بھی ہے اور ایک ایسی نئی تحریک بھی جس سے ہمارا ادب پہلے کبھی واقف نہیں تھا۔"[۴۳]

دراصل ۱۸۵۷ء میں ایک پورا سیاسی اور تہذیبی دور ختم ہو گیا تھا۔ داستانیں اپنا طلسم کھو چکی تھیں اور ناول نے اس کی جگہ سنبھالنی شروع کر دی تھی۔ غیر ملکی تسلط کے بعد جو نیا تہذیبی دور شروع ہوا، سرسید تحریک اس نئے دور کی آوازیں بن کر اُبھری۔ اصلاحی تحریک سے قبل اور ساتھ ساتھ معاشی اور سیاسی اعتبار سے ہندوستان کی زندگی میں بہت تغیر و تبدل واقع ہوا۔۔۔ ان تغیرات کے باعث پڑھے لکھے طبقہ میں ان وجوہات کو جاننے اور تلاش کی جستجو نے جنم لیا جو ان تغیرات کا سبب ہو سکتی تھیں۔ اس تلاش میں انھوں نے مغربی ادب اور خیالات سے براہ راست استفادہ شروع کیا۔ اس دور میں معاشرے کی اوپری سطح جو ہیجان کا شکار تھی۔ وقتی طور پر پُرسکون ہو گئی لیکن نچلی سطح میں بدستور طوفان پلتے رہے۔ اوپری سطح کے سکون اور ٹھہراؤ نے بعض ذہنوں میں رومان اور خوابوں کو جگانا شروع کر دیا تھا۔ وہ سطحی سکون دیکھ کر اس کی تہہ میں کروٹیں بدلتے طوفانوں سے آنکھیں چرا رہے تھے۔۔۔ وہ دراصل دائمی سکون کے متلاشی تھے اور اس دائمی سکون کے حصول کے لیے انھوں نے سطحی سکون کو کل زندگی کا مرکز اور محور بنا لیا۔ لیکن ان لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کے جسم کے کسی حصہ پر کاری زخم لگا ہو اور اسے زخم دیکھنے کی تاب نہ ہو اور وہ زخم پر خوبصورت پٹی باندھ کر اسے چھپا لے۔۔۔ اور اس پٹی کو ہٹانے سے پرہیز کرتا رہے۔ خواہ زخم اندر ہی اندر بڑھتا اور پھیلتا چلا جا رہا ہو۔۔۔ لیکن چونکہ زخم اس کی نگاہوں سے اوجھل۔ ہے تو وہ مطمئن رہے لیکن آخر کار انجام؟

اوپر کی سکون کی سطح کے نیچے طوفان سر اٹھانے لگا اور اب اوپر کی سطح بھی متلاطم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوگئی سیاسی مراعات طلبی اور نیم آزادی کی (ہوم رول) آواز اٹھنے لگی۔انڈین نیشنل کانگریس اس آواز کے سہارے بڑھی بھی اور اس نے آواز کو پورے ملک میں پھیلایا بھی ــــ گاندھی فلسفے نے سیاست میں انگریزوں سے مفاہمت کے راستے کھول دیئے لیکن دنیا بھر میں حالات مسلسل تغیرات سے دوچار ہوتے رہے پہلی جنگ عظیم، روسی انقلاب، مغرب میں سرمایہ دارانہ قوتوں کا عروج ،مشرق کا استحصال چین میں خلفشار، مغربی جمہوریت کا احساس، اسپین کی خانہ جنگی، جرمنی، اٹلی میں فسطائیت کا سر اٹھانا، مغربی ادیبوں کا سرفروشانہ عزم اور خواہش یہ تمام باتیں ایسی تھیں جن کے تحت ہندوستان کے نوجوان پڑھے لکھے لوگ اور ادیب مسلسل متاثر ہوتے رہے ــــ اور اسی کے سبب ہندوستان میں مفاہمت اور ہوم رول جیسی پالیسیوں کو ترک کر دیا گیا اور اب سیاست، اصلاح اور مفاہمت سے آزاد ہو کر انقلاب کی طرف بڑھ رہی تھی۔اس انقلاب کے پیچھے اشتراکی اور جمہوری فلسفے اور جدید نفسیات کے تحت فرد کی انا جاگ اٹھی تھی ــــ انہی حالات نے ترقی پسند تحریک کو جنم دیا گویا یہ تحریک اپنے زمانے کا ایک تاریخی اور لازمی تقاضا بن کر ابھری۔

> ''یہ ماحول تھا جس میں ترقی پسند ادب کی تحریک شروع ہوئی یہ اس قدامت پرستی سے بھی بیزار تھی جو اس دنیا کو چھوڑ کر نور و نغمہ، میں پناہ لیتی تھی اور اصلاحی تحریک سے بھی ناخوش جو پریم چند جیسے نیک نیت اشخاص کے ہاتھوں دنیا کی مصیبت کچھ کم کرنے اور بوسیدہ لباس میں اِدھر اُدھر رفو کرنے پر قانع تھی۔اس بیزاری اور نفرت کا اظہار ''انگارے'' کی شکل میں ہوا۔انگارے کے مصنفین نفسیاتی نقطہ نظر سے فرائڈ فنی نقطہ نظر سے جیمس جوائس اور معاشی نقطہ نظر سے کارل مارکس کے معتقد تھے۔۔۔انگارے کے ذریعہ سے انھوں نے موجودہ سماج کو جلا کر خاک کرنے کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کوشش کی۔''۴۴؎

ترقی پسند تحریک خالص ادبی تحریک نہیں کہی جاسکتی۔ جمالیاتی یا رومانی تحریک کے برعکس اس کا تعلق معاشرے، تاریخ، معاشیات اور سیاسی نظریات سے تھا۔ جہاں تک رومانی جمالیاتی تحریک کا تعلق تھا۔ ان کا مقصد ادب کو ادبی پیمانے پر جانچنا تھا۔ جب کہ ترقی پسند تحریک معاشرتی اور سیاسی فلاح و بہبود کے تحت ادب کو رد یا قبول کرتی تھی۔ ترقی پسند تحریک ادب کو معاشرتی اور سیاسی فلاح و بہبود کو لانے کا ایک ذریعہ بھی سمجھتی تھی اور اس کے پیچھے ایک خالص سیاسی اور معاشی نظریہ بھی تھا۔ یعنی یہ ادب برائے ادب کی قائل نہ تھی اور یوں اس کا رشتہ سرسید تحریک اور حالی کے مقدمہ شعر و شاعری سے استوار دکھائی دیتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس تحریک کے پیش نظر اصلاح نہیں انقلاب تھا۔ طبقاتی فرق کو قائم رکھنا نہیں بلکہ ختم کرنا تھا۔

یہ تحریک عام حیثیت میں جمالیاتی اقدار اور رومانی فکر کے خلاف نہیں تھی۔ بلکہ وہ اس جمالیاتی اور رومانی طرز فکر کے خلاف تھی جو معاشرتی اور سیاسی عوامل اور تقاضوں کو نظر انداز کر کے صرف حسن آفرینی کو ہی سب کچھ سمجھتی تھی۔۔۔ اور اس کے سامنے انسانی تاریخ میں جبر اور ظلم کے واقعات قابلِ توجہ نہ تھے۔ ترقی پسند مصنفین کانفرنس جو بھوپال میں ہوئی اس میں کرشن چندر نے خطبہ صدارت میں ترقی پسند تحریک کے تحت لکھے جانے والی ادبی تخلیقات کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

> ''گزشتہ دس برس میں ترقی پسند ادب نے اُردو میں ایک مستقل تحریک کی صورت اختیار کر لی ہے اور اس کی ادبی تخلیقات نے ہمارے ادب کا ڈھانچہ بدل کے رکھ دیا ہے۔ اسلوب بیان میں نئے نئے تجربے ہو رہے ہیں، فکری اظہار سے ہم لوگوں نے ادب کو زندگی کے قریب لانے کی کوشش کی ہے اور اس میں تجربات اور واردات بیان کرنے کی سعی کی ہے جو ہماری قوم کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

روح پر بیتے ہیں اور جنھوں نے ہمارے ضمیر کو جھنجھوڑا ہے۔ جنسی گھٹن ، فرنگی کی غلامی ، ہندو مسلم نفاق مزدوروں اور کسانوں کی زبوں حالی، سیاست حاضرہ کی نیرنگیاں، قحط کی لاشیں، طوائفیت کی حرص، سرمایہ پرستی کی منافع اندوزی، ہم نے ہر رنگ اور ہر نہج سے زندگی کو دیکھنے کی کوششیں کی ہیں اور اس کا بے باکی سے تجزیہ کیا ہے۔"[۴۵]

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس تحریک میں بھی انتہا پسندی تھی۔ مقصدی تحریک ہونے کے سبب اس کا انداز تبلیغی تھا۔۔۔ اس تحریک نے ادب میں تلقین اور تبلیغ کی بھرمار کر دی اور بہت سے لکھنے والوں کے لیے ادب ایک فارمولا بن گیا۔ اعلیٰ طبقہ استحصال کرتا ہے۔۔۔ متوسط طبقہ دوغلا ہے۔۔۔ نچلا طبقہ اپنی تمام جہالت کے باوجود انقلاب پسند ہے۔۔۔ افسانوں اور ناولوں کا انجام مایوسی اور شکست پر نہیں ہونا چاہیے۔ آخر میں نچلے طبقہ کی فتح و کامرانی لازمی ہے۔۔۔ ساری نیکی اور اچھائیاں نچلے طبقہ میں پائی جاتی ہیں۔۔۔ اور ساری بدی اور پرسی طبقہ میں موجود ہے وغیرہ وغیرہ۔

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ادب پروپیگنڈہ بن گیا۔۔۔ اس میں نعرہ بازی شروع ہو گئی لیکن یہ نعرہ بازی زیادہ تر نظموں میں آئی۔ اچھے افسانہ نگار اس سے بچے رہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ افسانوں میں مختلف کردار ہوتے ہیں اور ان کے تحت خیالات خود بخود مختلف نظر آتے ہیں۔

"اس تحریک میں اور خرابی یہ بھی تھی کہ اس نے جمالیات کو معاشرے کی پاکیزگی ہی میں تلاش کیا مگر اس تحریک نے انسانی ذہن کے اس حصہ کو یکسر فراموش کر دیا جو تاریکی میں اُجالا اور اُجالے میں تاریکی کو ڈھونڈ لیتا ہے۔"[۴۶]

یہ تحریک اپنے ابتدائی دور میں بڑے جارحانہ انداز سے شروع ہوئی۔ ہر قسم کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سماجی اقدار سے انحراف کو یہ اپنا نعرہ بنائے ہوئے تھی۔تحریک کے ابتدائی دور میں اس کا ایک رسالہ ''نیا ادب'' کے نام سے لکھنو سے شائع ہوتا تھا۔اس میں یہی انتہا پسندی تھی حسن عسکری کا ایک افسانہ ''پھسلن''اسی میں شائع ہوا تھا۔اس افسانے کا موضوع ''ہم جنسی''تھا۔ترقی پسند تحریک کے اغراض ومقاصد میں ۔۔۔اس نوع کے موضوعات سے بحث زوال پرستی اور ذہنی پریشان خیالی کی دلیل تھی۔جنسی جبلت کو انسانی زندگی کا مرکزی جذبہ بنا کر پیش کرنا۔اس کے مقصد کے خلاف تھا۔چنانچہ اس تحریک نے ایک کروٹ اور لی۔جنسی کج رووں کو اس نے سماجی اور معاشی اثرات کے تحت دیکھنا شروع کردیا۔اس لیے یہ بعد میں ایسے افسانہ نگاروں اور شاعروں سے کنارہ کش ہوگئی جو جنس کو انسان کی جبلی اور بنیادی سرشت سمجھتے تھے اور بعض ترقی پسند ادیبوں نے تو کھلم کھلا اس کے خلاف قلم اٹھایا۔

> ''بعض انحطاطی چیزوں کو غلطی سے ترقی پسند سمجھ کر ترقی پسند رسائل میں شائع کیا گیا۔مثلاً حسن عسکری کی کہانی ''پھسلن''جو نیا ادب میں شائع ہوئی تھی۔ن م راشد کی شاعری کا بیشتر حصہ زندگی سے فرار کر کے جنسیات میں پناہ لینے کی ترغیب دیتا تھا۔اس کے باوجود ن م راشد کو ترقی پسند حلقے میں شریک سمجھا گیا۔انھوں نے خود بھی انجمن کی تیسری کانفرنس میں شرکت کی سعادت حسن منٹو گورکی کے ترجمے کرنے اور نیا قانون جیسی کہانی لکھنے کے بعد تیزی سے انحطاط کی طرف جارہے تھے اور سنسنی خیز فحش اور گندی کہانیاں لکھنے لگے تھے۔
>
> عصمت چغتائی نے بھی اپنی بغاوت کے لیے جنسیات ہی کا انتخاب کیا اور کبھی گیندا کی طرح اچھی اور کبھی لحاف کی طرح بُری کہانیاں لکھیں۔نئے لکھنے والے میں اور بہت سے ادیب اس قسم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی مریضانہ جنس نگاری کو حقیقت نگاری سمجھ کر پیش کر رہے
تھے۔ یہ تمام چیزیں ترقی پسند ادب کے ساتھ کچھ اس طرح مل
گئیں کہ ہر نیا ادیب ترقی پسند قرار دیا گیا اور ہر نئی تحریر ترقی پسند
ادب کا نمونہ۔ نیا ادب اور ترقی پسند ادب ہم معنی الفاظ ہو گئے۔
اس وقت سجاد ظہیر، احتشام حسین اور دوسرے ترقی پسند ادیبوں
نے اپنے مضامین اور تنقیدوں سے اس ابتری اور انتشار کو دور
کرنے کی کوشش کی۔'' ۴۷

سجاد ظہیر نے بھی ۱۹۴۵ء میں اُردو کانفرنس میں جنسی ترغیبات یا جنسی واقعات کے ان لکھنے والوں کے بارے میں اختلاف رائے کیا جو اس موضوع کو محض تلذذ پرستی کے لیے استعمال کر رہے تھے۔

''ترقی پسند ادب کے مخالفین ہر نئے ادیب کو اور وہ اگر خراب
ادیب ہے تو اور زیادہ با اصرار اور ترقی پسندی کا نام دے کر پوری
تحریک کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا
کہ'' درمیانی طبقہ کے ہر آسودہ حال فرد کی، جنسی بدعنوانیوں کا
تذکرہ چاہے وہ کتنا بھی حقیقت پر مبنی کیوں نہ ہو لکھنے اور پڑھنے
والے دونوں کے لیے تضیع اوقات ہے۔۔۔ اور دراصل وہ زندگی
کے اہم ترین تقاضوں سے اسی قدر فرار کا اظہار ہے جتنا کہ
رجعت پسندی۔'' ۴۸

احتشام حسین نے بھی نیا ادب کی بحث کے دوران علی اختر تلہری اور رشید احمد صدیقی کو جواب دیتے ہوئے کہا۔

''ترقی پسند ادب نیا ادب ضرور ہے لیکن سارا نیا ادب ترقی پسند
ادب نہیں ہے۔ انھوں نے فرائڈ کے تحلیل نفسی کے مارے ہوئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اعصابی ادب کو خاص طور سے ترقی پسندی کے زمرے سے خارج کیا اور لکھا کہ ترقی پسندوں نے کبھی فرائڈ کو اپنا امام تسلیم نہیں کیا ہے بلکہ بہت احتیاط سے اس کے نتائج فکر کا مطالعہ کیا۔ کیونکہ ترقی پسندی اجتماعی زندگی کو اصل بنیاد قرار دیتی ہے اور تحت اشعور ، جنسی دباؤ ، ذہنی بیماریوں کو بھی وقت کے معاشی، معاشرتی حالات سے وابستہ سمجھتی ہے۔ محض تجزیہ نفس سے دلچسپی لینے والے فرد اس میں اس قدر محو ہو جاتے ہیں کہ سماجی انسان نظر انداز ہو جاتا ہے۔ وہ تحت الشعور اور لاشعور کی دھندلی اور اندھیری دنیا میں پہنچ کر زندگی کے ان خارجی اثرات کو نظر انداز کر جاتے ہیں، جس سے داخلیت تربیت پاتی ہے۔" ۴۹ے

ترقی پسندوں کی یہ بات تو درست تھی کہ ادب میں جنس برائے جنس کا تذکرہ بے ادبی اور صرف لذت پرستی ہے لیکن جنسی تحریکات اور ترغیبات کو یکسر نظر انداز کر دینا یا مردود و مطعون کرنا بھی حقیقت سے آنکھ چرانا تھا۔ انسانی زندگی کا یکطرفہ مطالعہ نہیں کیا جا سکتا۔ جنس کے تذکرے سے یہ خوف اتنا بڑھا کہ ترقی پسند ادیبوں نے باقاعدہ ایک تجویز پاس کرنے کی کوشش کی۔

"۱۹۴۵ء کی ترقی پسند کانفرنس منعقدہ حیدر آباد میں ایک قسم کا ریزولیشن پیش کرنے کی ضرورت پڑی کہ ترقی پسندی پر جو الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ اس میں عریانی، لذتیت اور جنسیت کی طرف زیادہ میلان پایا جاتا ہے۔ ہم اس سے بالکل اپنی علیحدگی کا اعلان کرتے ہیں اور ترقی پسند تحریک کا اس سے کوئی واسطہ نہیں یہ تجویز پاس نہیں ہو سکی۔ کیونکہ مولانا حسرت موہانی اور قاضی عبدالغفار نے اس کی شدید مخالفت کی لیکن یہ بات ضرور واضح ہو گئی کہ ترقی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

> پسندوں کے پیش نظر جو زندگی کی تصویر تھی اس میں جنسی موضوعات محض جنسی حیثیت سے نہیں بلکہ سماج کی ایک حقیقت کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں جو پورے سماجی نظام کو درہم برہم کرتی ہے اور توازن بگاڑتی ہے۔۔۔ اور اس طرح ایک اہم سماجی مسئلہ بن جاتی ہے۔" ۵۰

یہ تو ترقی پسند تحریک کے اس پہلو کا جائزہ تھا جو ایک لحاظ سے فرائڈ کے نظریات سے متاثر ہوا اور اس میں بعض لکھنے والوں نے کچھ تو نئے موضوع ہونے کے اعتبار سے عام پسندیدگی کے پیش نظر۔۔۔ اور کچھ اپنی ذہنی کج رویوں کے سبب۔ لذت پرستی کے تحت لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان تحریروں میں افراط وتفریط سے کام لیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے زبروست سیلاب نے بند توڑ دیا ہو اور سیلاب کا پانی ہر طرف بہہ رہا ہو۔ یہ بات سمجھ میں آنے والی بھی تھی۔ جنسی موضوعات پر لکھنا معاشرتی ضوابط اور اخلاقی قوانین کے خلاف سمجھا جاتا تھا مگر جدید ادب کی تحریک جب ان ضوابط اور قوانین کے کھوکھلے پن پر حملہ آور ہوئی تو جنس کا موضوع بھی انتقامی طور پر برتا جانے گا اور بعض اوقات اتنے گھٹیا انداز میں برتا کہ لوگ نئے ادب کے نام سے بھی کراہیت محسوس کرنے لگے۔۔۔ ترقی پسند تحریک کے رہنما اس موضوع پر لکھنے کو اس حد تک تو جائز تو سمجھتے تھے کہ یہ موضوع ایک اہم سماجی مسئلے کی صورت میں سامنے آجائے۔ البتہ سستی جذباتی تسکین کا ذریعہ ٹھہرانا ان کے مقاصد کے خلاف تھا۔

لیکن اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے۔۔۔ یا اس تحریک کے ابتدائی نقوش "انگارے" کے افسانوں پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان لوگوں کا مقصد جنھوں نے ترقی پسند ادب کی بنیاد ہندوستان میں ڈالی، بغاوت تھا۔۔۔ یہ بغاوت اپنے تمام مروجہ اصولوں اور روایتوں۔۔۔ اور اقدار سے تھی۔۔۔ اور اس بغاوت کے تحت ہی انھوں نے جنس کے موضوع کو دانستہ طور پر اس طرح برتا کہ اس میں عریانی، فحاشی نمایاں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھی۔اس کے اثرات پورے ادب پر ہوئے۔نظم اور افسانے دونوں میں جنسی موضوعات کھل کر بلکہ کھل کھیل کر لائے گئے۔معاشرتی اقدار کی توڑ پھوڑ کے بعد پھر معاشرتی پس منظر ہی میں سب کچھ پیش کرنا مشکل تھا۔جنسی موضوعات سے کنارہ کشی کے اعلان کے باوجود ترقی پسند ادیب ایک تضاد کے شکار تھے کیونکہ جنس بہر صورت ایک فعال قوت تھی جس کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا۔انگارے کے افسانے دراصل اسی تضاد کو پیش کرتے ہیں جو تضاد ترقی پسند تحریک کے علمبرداروں کے ذہن میں موجود تھا۔۔۔اور اس تضاد کے باعث ہی ایک بات یہ بھی محسوس کی جاسکتی ہے کہ ترقی پسند ادیبوں کے سامنے ابتدا میں ترقی پسندی کا کوئی واضح تصور موجود نہیں تھا۔۔۔اور انھوں نے صرف بغاوت کو بنیاد بنا کر اس تحریک کی ابتداء کردی تھی۔۔۔اس لیے اس تحریک کو بعد میں بہت سی مشکلات اور تضادات کا سامنا کرنا پڑا۔

''انگارے'' کے افسانوں نے جنس پرستی اور بغاوت کا جو راستہ دکھایا تھا اس عہد کے نئے لکھنے والوں نے جب وہ راستہ اپنایا اور اس کے تحت مخالفتوں کا جو طوفان اُٹھ کھڑا ہوا اس سے گھبرا کر اس تحریک کے بانی خود اپنے ہی دکھائے ہوئے راستے پر چلنے والوں سے علیحدگی کا اعلان کر بیٹھے تاہم یہ بات بھی غنیمت ہوئی کہ مولانا حسرت موہانی اور قاضی عبدالغفار نے ۱۹۴۵ء کے اس ریزولیشن سے شدید اختلاف کیا جس میں جنسی رجحان کے تحت لکھنے والوں سے مکمل علیحدگی کا اعلان تھا۔ترقی پسند نوجوانوں کے لیے مولوی عبدالحق نے کہا تھا کہ

> ''مجھے معاف فرمایئے گا میں دیکھتا ہوں کہ اکثر ترقی پسند نوجوان اپنے خیالات کو صحیح طور پر ادا کرنے سے قاصر رہے ہیں۔جو دل میں ہے وہ بیان میں نہیں آتا۔''

اس کے علاوہ ترقی پسند تحریک کا ایک نمایاں بلکہ بنیادی موضوع مارکس کے نظریات پر مشتمل تھا۔اس تحریک کے بعض موافقین نے بھی اس سے اختلاف کیا مخالفین

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تو خیر ادب کے مارکسی نظریئے کے خلاف تھے ہی، چنانچہ ایک مخالف رائے دیکھئے۔

"یہ بات سچ ہے کہ ترقی پسند ادب کی خیالی دنیا تنگ و محدود ہے۔ وہ تنقید ہو یا تخلیقی ادب ہر جگہ خاص خاص فقرے، خاص خاص نعرے، خاص خاص خیالات دہرائے جاتے ہیں اور یہ فقرے یہ نعرے اور یہ خیالات بھی مغرب سے مستعار لیے گئے ہیں۔ ان میں کوئی انفرادی خصوصیت نہیں۔ متضاد خیالات کو نظم یا افسانے کے قالب میں ڈھال کر ترقی پسند لکھنے والے یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ انھوں نے کوئی زبردست ادبی خدمت انجام دی ہے۔ یا کوئی زبردست ادبی کارنامہ پیش کر دیا ہے۔۔۔۔ معقول لکھنے والوں کے لیے یہ زیبا نہیں کہ وہ کسی سیاسی لیڈر کی طرح گرجنے لگے۔ غریبی کو مٹا دیں گے۔۔۔ ترقی پسند ادب کا زیادہ حصہ اسی قسم کا ہے۔ اس میں چند اشتراکی خیالات کی تکرار ہے اور بس۔۔۔۔ ادب باقی نہیں رہتا۔ پروپیگنڈا بن جاتا ہے۔" ۵۱

کلیم الدین احمد نے ترقی پسند مصنفین کے مقاصد میں سے ایک مقصد "آزادی رائے اور آزادی خیال کی حفاظت" پر بھی نکتہ چینی کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ ترقی پسند مصنفین کی تحریروں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے خیالات آزاد نہیں ہیں پابند ہیں اور وہ یہ پابندیاں دوسروں پر بھی عائد کرنا چاہتے ہیں۔۔۔ اور اس کا جواز یوں پیش کرتے ہیں کہ ترقی پسند مصنفین آزادی خیال پر زور دینے کے باوجود خود اپنی کوئی ذاتی رائے رکھتے۔ ان کے ہاں غور و فکر کا کوئی احساس ہے نہ کوشش وہ چند خیالات اور پہلے سے کہے گئے (مارکس کے) فقروں کو دہراتے ہیں اور انھی نظریات کا بار بار اعادہ کرتے ہیں جو مارکس کے اشتراکی نظریئے کی بنیاد ہیں۔ اسی نظریئے کے تحت ترقی پسند مصنفین کا یہ خیال

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے کہ "روٹی انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔" کلیم الدین نے بھی اس پر تنقید کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر بھوک اور جنس ہی بنیادی حیثیت کی حامل ہوتیں تو یہ دونوں چیزیں تو جانوروں میں بھی موجود ہیں۔ اگر کسی جانور کو پیٹ بھر کر غذا ملتی ہے اور اس کی جنسی ضروریات کی تکمیل ہوتی رہے تو وہ انسان نہیں بن سکتا۔ یا انہی دونوں احساسات کے سبب انسان کو حیوان پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔۔۔ بلکہ یہ دونوں احساسات زندگی کی بقاء اور تسلسل کی علامت ہیں۔۔۔ اور زندگی میں اس تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے یقیناً بھوک اور جنس دونوں اہم کردار ادا کرتی ہیں لیکن اگر زندگی کا تسلسل اور بقاء ہی اہمیت کی حامل ہوتی تو پھر دماغی، صلاحیتوں کی کیا ضرورت ہے۔

> "غالباً کسی کو بھی اس سے انکار نہیں ہوگا کہ دماغ ہی زندگی کا سب سے اہم کارنامہ ہے۔۔۔ اس لیے ہم انہی اقدار کو قیمتی سمجھیں گے جن کے حصول سے ہماری دماغی خواہشات کی تسکین وابستہ ہوگی وہ نہایت قیمتی اور اہم نہیں ہوسکتیں جن کی بنیاد انسان کے حیوانی عناصر پر رکھی گئی ہو۔" ۵۲

انھوں نے اس بات سے بھی اختلاف کیا کہ ادب کو سیاسیات اور معاشیات کا متحدہ میدان بنایا جائے۔

> "ادب کا براہ راست یا بلواسطہ یہ کام نہیں کہ دنیا کی کثیر سے کثیر انسانی آبادی کو پیٹ بھر کر کھانا ملنے میں مدد کرے۔۔۔ اس کام کے لیے انسان کے پاس دوسرے ذرائع موجود ہیں اور وہ ان ذریعوں سے مدد لیتا اور لے سکتا ہے۔" ۵۳

لیکن ان تمام خامیوں کے باوجود ترقی پسند تحریک میں اس عہد کے بڑے بڑے ادیبوں، شاعروں، ناقدروں، افسانہ نگاروں کے نام شامل تھے جس میں جوش، پریم چند، حسرت موہانی، مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری، آل احمد سرور، احتشام حسین، کرشن،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بیدیؔ، مجاز، فیض، ندیم، جاں نثار اختر، جذبی، سردار جعفری وغیرہ اور بقول آل احمد سرور کے۔

"اُردو ادب میں علی گڑھ تحریک کے بعد یہ دوسری بڑی ادبی تحریک ہے۔" ۵۴

یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس تحریک سے اُردو ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس تحریک نے ادب میں پہلی بار شعوری طور پر بعض ایسی چیزوں کی اہمیت کا احساس دلایا جو مادی تھیں اور جن کا تعلق اس مظلوم طبقہ سے تھا جو مفلسی اور تنگ دستی کے ہاتھوں مشکلات میں مبتلا تھا غرض کہ:

"۱۹۳۶ء کی ادبی تحریک کا تعلق عالمی تبدیلیوں، بیسویں صدی کی اہم حقیقتوں اور برصغیر کی تحریک آزادی سے تھا۔ مارکس کا یہ انداز فکر کہ ہم کسی بھی تہذیب کا جائزہ لیں گے تو آخری تجزیہ میں معاشی ضرورتیں ہی ملیں گی۔ ذہن انسانی کو سمجھنے کی کوشش میں فرائڈ کا شعور دریافت کرنا، یونگ کا اجتماعی لاشعور، سارتر کا فلسفہ وجودیت کی پیچیدگیاں، طبقاتی کشمکش یا نیا شعور، ان سب کو تحریر میں سمونے کا آغاز ۳۶ء کی ادبی تحریک سے وابستہ ادیبوں نے کیا۔ ۷۰ء میں ہمارا ادبی شعور ۳۶ء کے مقابلہ میں بہت آگے ہے لیکن حرف آغاز وہی ہے۔" ۵۵

اس تحریک کے تحت سب سے زیادہ ترقی افسانے نے کی۔۔۔اور اُردو افسانے پر فرائیڈ مارکس کے نظریات کے علاوہ فلسفہ وجودیت اور اجتماعی لاشعور وغیرہ جیسے نظریات بھی اثر انداز ہوئے۔ افسانوں میں مروجہ اصولوں سے ہٹ کر لکھنے کا شعور پیدا ہوا۔ افسانوں کے اسلوب، انداز نظر، ہیت اور موضوعات میں بڑی تبدیلیاں ہوئیں۔

پریمؔ چند کے بعد کی افسانہ نگاری انہی تبدیلیوں اور جدید رجحانات کو پیش کرتی ہیں۔ پرانی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اقدار کی شکست و ریخت کے بعد اُردو ادب نے عمومی اور افسانہ نگاری نے خصوصی حیثیت سے جدید اقدار اور جدید ذہن کی تشکیل اور تعمیر میں اپنے کو مصروف کر دیا۔

> ''ارضی، جسمانی اور مادی زندگی کے برحق اور مقدس ہونے کا شعور ترقی پسند تحریک کی سب سے بڑی دین ہے۔۔۔۔ یہ اور بات ہے کہ جو غلطی پہلے تصوریت کے مبلغ کر چکے تھے۔ وہی غلطی ترقی پسندوں نے کی۔ یعنی زندگی کی ثنویت اور جدلیت کو بھول کر وہ بھی زندگی کے ایک ہی رخ پہ ضرورت سے زیادہ زور دینے لگے اور ہم زندگی کے دوسرے رخ سے کچھ بیگانہ سے ہو گئے۔'' ۵۶

۱۹۴۷ء تک پہنچتے پہنچتے یہ تحریک اپنے اثرات کھو بیٹھی۔ اس کی وجوہات مختلف تھیں۔ کچھ تو ترقی پسند تحریک میں سماجی اور مادی زندگی کے رخ کی یکطرفہ عکاسی، جس میں انسان کی ذہنی اور روحانی لطافتوں کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا اور زندگی کو صرف و محض معیشی چکر کا اسیر بنا ڈالا گیا اور کچھ یوں کہ یہ تحریک اپنا دم خم جس قدر ہو سکتا تھا، ''بروئے کار لا چکی تھی'' ترقی پسند تحریک کے سبب جو اثرات ہندوستان کی زندگی اور ادب پر پڑ چکے تھے، اس سے زیادہ کسی نئے اثر یا رجحان کے پیدا ہونے کی توقع اس تحریک سے نہیں کی جا سکتی تھی۔

☆☆☆☆

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترقی پسند تحریک اور غیر ملکی اثرات

نویدہ کوثر

''آج جس شاخ نے سو پھول کھلا رکھے ہیں''

رات تاریک تھی ، ویران گلی کوچے تھے
یاد پڑتا ہے اسی شہر میں شمعیں لے کر
کل جو نکلے تھے تو معتوب ہوئے تھے ہم لوگ
کل یہیں ہم نے بکھیری تھی لہو کی افشاں
کل اسی شاخ پہ مصلوب ہوئے تھے ہم لوگ
''آج جس شاخ نے سو پھول کھلا رکھے ہیں'' (رضی اختر شوق)

''وقت تغیر پذیر بھی ہے اور تغیر آفرین بھی۔ وہ پرانے کو آہستہ آہستہ ریزہ ریزہ کر کے بکھیر دیتا ہے اور نئے کو اس کی جگہ متمکن کرتا ہے۔ وقت کی تغیر آفرینی کے ساتھ ساتھ انسانی فکر بھی تغیر پذیر رہی ہے اور اس نے خط مستقیم پر نہیں بلکہ پیچ و خم خطوط پر ترقی کی ہے۔'' ۵۷

ترقی پسند تحریک فکری ارتقاء کے اسی پیچ و خم کا ایک اہم حصہ بن کر اُردو ادب میں آئی۔ ترقی پسند تحریک اُردو ادب کی وہ واحد تحریک ہے جس پہ باقاعدہ غیر قانونی ہونے کا شبہ ہوا اور پابندی بھی لگی۔ ترقی پسند تحریک اُردو ادب کی سب سے ہنگامہ خیز تحریک رہی ہے۔ علی گڑھ تحریک کی بھی اتنی مخالفت نہیں ہوئی جتنی اس تحریک کی۔ اس تحریک کے بارے میں بے شمار غلط فہمیاں ہمیشہ موجود رہی ہیں انہی میں ایک غلط فہمی یہ بھی ہے کہ:

''یہ تحریک صرف غیر ملکی نظریات کے اثرات پہ اٹھی''

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حالانکہ یہ بات درست نہیں یہ مانا کہ یہ نظریہ سو فیصد غلط بھی نہیں۔لیکن
''صرف غیر ملکی''اثرات کا حامل قرار دینا یقیناً''ترقی پسندی اور
ادب کے ساتھ ہی زیادتی نہیں خود اس تحریک کو سمجھنے میں بھی غلطی
کا حامل مانا جائے گا۔آل احمد سرور کہتے ہیں:

''شاعری حسن اور اسٹائل کی طرح ترقی پسندی کا کوئی بندھا ٹکا
فارمولا نہیں ہے۔یہ ایک رجحان ،ایک تصور حیات ایک منزل
مقصود ہے۔'' ۵۸

اور واقعی یہ بات درست ہے کہ ترقی پسندی کہیں باہر سے پکڑ کر نہیں لائی جاتی
بقول عابد حسن منٹو:

''جس طرح زندگی کے متعلق ہر شخص شعوری یا غیر شعوری طور پر
کوئی نہ کوئی نقطہ نظر رکھتا ہے۔اسی طرح ادب کے متعلق بھی کوئی
نہ کوئی نقطہ نظر موجود ہوتا ہے کیونکہ ادب بہر حال زندگی ہی کے
کسی گوشے سے متاثر ہو کر تخلیق کیا جاتا ہے۔'' ۵۹

اور ادب کے بارے میں یہ نقطہ نظر ہی ادب اور زندگی دونوں کو آگے بڑھنے کی
توانائی فراہم کرتا ہے۔

''آؤ کہ کوئی خواب بنیں کل کے واسطے
ورنہ یہ رات آج کے غم ناک دور کی
ڈس لے گی جان و دل کو کچھ ایسے کہ جان ودل
تا عمر پھر نہ کوئی حسین خواب بن سکیں'' ۶۰

اور یہی نظریہ تحاریک کو جنم دینے کا باعث بھی بنتا ہے کہ جب کسی مخصوص خیال
سے کمٹمنٹ صرف ایک ادیب یا شاعر کا حصہ نہیں رہتی اور بہت سے لوگ اکھٹے چل کھڑے
ہوتے ہیں تو کوئی بھی نظریہ تحریک کی شکل میں مزید لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کے لیے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چل نکلتا ہے۔ سبط حسن نے لکھا:

''ترقی پسندی کے سن وسال کا تعین ممکن نہیں کیونکہ زندگی کی حیات آفریں قدروں سے وابستگی اوران کے فروغ کی آرزو اتنی ہی پرانی ہے جتنی حسی تجربات کے فنی اظہار کی روایت۔ لہٰذا یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ ترقی پسند ادب ۱۹۳۵ء میں اچانک پیدا ہوا۔'' ۶۱

عزیز احمد نے لکھا:

''انقلاب انسان کی ارتقائی زندگی کا سب سے بڑا مصلح ہے جب زندگی کسی پرانی روایتی روش پر چلتے چلتے اکتا جاتی ہے تو انقلاب اسے نیا راستہ دکھاتا ہے۔ ادب ___ انقلاب سے ہمیشہ متاثر ہوتا ہے اور کبھی کبھی انقلاب کا پیش رو بھی بن جاتا ہے۔'' ۶۲

ترقی پسند تحریک نے یہی کام کیا اور انقلاب کو اپنے جلو میں لے کر چلی۔ کیونکہ ترقی پسند تحریک اس جدیدیت سے عبارت تھی جو نئے پانیوں کا دھارا وقت پہ مسلط کر سکتی تھی۔ ثاقب رزمی لکھتے ہیں:

''ترقی پسند نظریہ ادب کے نزدیک ادب میں جدیدیت نئے عہد کا ایک مظہر ہے جو وقت کے تغیر آفریں بہاؤ کی جانب اشارہ کرتا ہے اس کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ وہ معاشرے میں استحصالی قوتوں کی موجودگی اور عوام کی سماجی بدحالی سے اغماض نہیں کرتا اور اپنے فن سے عوام میں طبقاتی شعور پیدا کرتا ہے۔'' ۶۳

اسی شعور اور ترقی پسند ادب کی وضاحت کرتے ہوئے علی سردار جعفری نے لکھا:

''جب سے تہذیب وتمدن کا دور شروع ہوا تب سے آرٹ اور ادب کے دو متوازی دھارے بہہ رہے ہیں ایک عوامی ادب جو تھکے ہاتھوں اور محنت کش عوام کی تخلیق ہے ۔۔۔ اور دوسرا دھارا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علم کے خزانوں سے پھوٹتا ہے اور جب کبھی خصوصیت کے
ساتھ ان لمحوں میں جب سماج اور زندگی کوئی تاریخی کروٹ
بدلتی ہے۔۔۔تو دونوں دھارے ایک دوسرے کا منہ چوم لیتے
ہیں اور ایک پرشور سیلاب کی طرح چوڑے چکلے پاٹ میں بہنے
لگتے ہیں۔" ۶۴

زندگی میں ہمیشہ ہی نت نئے خیالات کا اظہار ہوتا آیا ہے اور نذرالاسلام کو ہی دیکھئے وہ ۱۹۲۶ء میں ایسی نظمیں لکھ چکا تھا اور لکھ رہا تھا جو اشتراکیت اور انقلاب کا وہی تصور سامنے لاتی تھیں جو بعد میں صرف ترقی پسند تحریک کا خاصہ مانا گیا ایک نظم کے چند مصرعوں کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

"جنہوں نے کوہ و بیاباں کے دامن میں شاداب فصلیں کھڑی
کردیں جن کی مضبوط مٹھیاں پھاوڑے چلاتے چلاتے پتھر
ہوئیں میں انھیں کے گیت گاتا ہوں! ۶۵
میں انھیں کے گیت گاتا ہوں!
جو ہر زمانے میں ادہ
ہر دور میں انقلاب کا پرچم لہراتے ہیں
جو پہاڑی ندیوں کی طرح کسی رکاوٹ کی پروا نہیں کرتے
میں ان کی چوکھٹ پہ سر جھکاتا ہوں
اور انھیں کے گیت گاتا ہوں"

اختر حسین صاحب لکھتے ہیں:

"نذرالاسلام کی زندہ جاوید نظم "دوروہی" (باغی) نے اسے
ادبی انقلاب کا علم بردار بنایا اور اسے شاعر انقلاب
یعنی "دوروہی کوی" کا لقب دلایا۔ پروفیسر بنے سرکار اپنی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تصنیف Asia Futurism of میں اس نظم کا تذکرہ کرتے
ہوئے لکھتے ہیں: جب میں نے "باغی" کو پڑھا تو محسوس ہوا کہ
۔۔۔جس انقلاب کے ہم متوقع تھے وہ آگیا" ؁٦٦

یعنی وہی باتیں جنہیں مرتب شکل میں ترقی پسند تحریک نے اپنے منشور کی شکل میں پیش کیا وہ پہلے بھی انقلابی ذہنوں اور ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کے یہاں موجود تھیں اختر حسین رائے پوری نے بالکل ٹھیک کہا ہے:

"نذر الاسلام کا پیغام مذہب وملت کی قیود سے آزاد ہے۔ ممکن
ہے کہ اس کے خواب کی تعبیر کبھی نظر آئے اور پھر اس کے گیت
پرانے ہو جائیں۔ لیکن یہ باور کرنا مشکل ہے کہ دنیا میں مجاہدوں
اور شہیدوں کی ضرورت یکسر نہ رہے۔" ؁٦٧

یعنی یہ سمجھ لینا کہ لندن سے سجاد ظہیر کے ساتھ ہی سارے ترقی پسند خیالات آئے تو یہ بات ٹھیک نہیں ہوگی اقبال کی مثال ہی لیں۔ عزیز احمد نے لکھا:

"شاعری میں ترقی پسندی کی روح عمل بہت عرصے سے سرگرم
تھی۔ ان شاعروں میں سب سے اہم اور سب زیادہ مقدس
نام اقبال کا ہے۔۔۔ تقریباً سب صاحب دماغ ترقی پسند
شعراء اور اکثر ادیبوں نے اقبال کی راہنمائی کو خراج عقیدت
پیش کیا ہے مثال کے طور پر دیویندر ستیارتھی کا وہ افسانہ "میری
زندگی کا ایک ورق" ملاحظہ ہو جس میں اقبال کی ذہنی شخصیت
، ان کا کھرا انسانی نقطہ نظر ایک قنوطی کو ذہنی اور جسمانی خودکشی
سے بچالیتا ہے یا فیض کی نظم "اقبال" ؁٦٨

عزیز احمد نے ہی مخدوم محی الدین کی نظم "اقبال" کا بھی حوالہ دیا ہے جس میں انہوں نے لکھا:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نغمہ جبریل ہے انسان کا گانا نہیں
صوراسرافیل ہے دنیا نے پہچانا نہیں
عرش کی قندیل ہے ایک آسمان راگ ہے
راگ کیا ہے سر سے پا تک عشق کی اک آگ ہے

ادب میں یہ امر فطری سوچ اور انسانی ارتقاء کا ہمیشہ ضامن رہا ہے کہ وہ اپنے اِردگرد کی ضرورتوں اور حقیقتوں کے مطابق اپنی سوچ کو انقلابی بنا لیتا ہے کیونکہ بقول سردار جعفری:

''ادب حقیقت کو بدلتا ضرور ہے لیکن خارجی فطرت اور ماحول پر براہ راست اثر انداز نہیں ہوتا وہ انسان میں داخلی تبدیلی پیدا کرتا ہے وہ اس کے شعور کو تیزی اور شوق کو گرمی بخشتا ہے''[۶۹]

اس لیے یہ کہنا بجا ہوگا کہ ادب میں حقیقت کے مطابق چلنے اور جذبات انسانی میں تبدیلی اور ارتقاء کے مراحل ہمیشہ طے ہوتے رہتے ہیں اس لئے یہ لازم نہیں کہ کوئی تحریک با قاعدہ طور پر چلے تو تبھی ایسی ادلی بدلی کی نوبت آئے گی جو خارجی اور داخلی طور پہ انسان کو ہلا دے بلکہ یہ تحریکات تو خود ایسے ذی شعور انسانوں اور انکی سوچ کی طلبگار ہوتی ہیں جو ان کے سانچے میں ڈھلے نظریات کو اور تقویت بخش سکیں۔ جمیل نقوی نے ''ترقی پسند جگر'' کے تحت بالکل درست لکھا ہے

''اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک جگر کے سامنے شروع ہوئی بہت سے ایسے ادیب اور شاعر جو اس تحریک میں عملی طور پر شامل نہیں ہوئے اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ۔۔۔رجعت پسندی کے الزام سے بچنے کے لئے بڑے بڑے کہنہ مشق شاعر پرانی شراب کو نئے ساغروں میں ڈھال کر پیر میخانہ بن بیٹھے تھے ترقی پسند جگر کی شاعری اور ان کے نقطہ نظر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے بخوبی واقف تھے انہیں بعض بزرگوں کی معیت میں اپنی فکری
راہیں ہموار کرنا تھیں وہ پرانے لوگوں کے کس بل پر غیر ملکی
نظریات کی نشوونما چاہتے تھے۔اسی لئے انھوں نے جگر جیسے
شاعر کو اپنے پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا۔" ۷۰

ایسے بہت سے شعراء اور ادبا اس دور میں پہلے سے موجود تھے جن کے یہاں مزدوروں کی محنت اور ان کی قدر نہ ہونے کے جذبات موجود تھے جوش کی مثال اس سلسلے میں اپنی جگہ اپنی مثال آپ ہے یا پھر جذبی کو دیکھئے:

کاش مفلس کے تبسم سے نہ چلتا یہ پتہ
کتنے فاقوں کی سکت غیرت بے تاب میں ہے

جیسے اشعار میں انقلاب بہت کم اور شاعرانہ غزلیت زیادہ ہے بقول عزیز احمد:

"انھوں نے محبت کے کیف و غم سے پھر انقلاب کی طرف ہجرت کرنا چاہی ہے۔ ۷۱

عزیز احمد اسی بات کی طرف مزید اشارہ کرتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک کا منشور سب کا سب نانکنگ ریستوران سے ہی نہیں آیا پہلے سے زمین ہموار بھی تھی واضح رہے کہ پریم چند کے دوسو افسانے موجود تھے۔

"پریم چند کا اپنے آخری زمانے میں ترقی پسند تحریک کی طرف
مائل ہونا اس تحریک کی بڑی خوش قسمتی تھی۔اس سے ترقی پسند
افسانے کو وہ ہمت، حقیقت نگاری وہ صلاحیت نصیب ہوئی جو
اسے ترقی پسند ادب کی سب سے کامیاب شاخ بنائے ہوئے
ہے۔اگر ان کا افسانہ مشعل راہ نہ ہوتا تو بہت سے نوجوان
افسانہ نگار جو آج مشہور اور کامیاب ہیں۔اندھیرے میں بھٹکتے
پھرتے ہوتے۔" ۷۲

قاضی عبدالغفار کا نام اگرچہ رومانیت پسند اپنے کھاتے میں لکھنا زیادہ پسند

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرتے ہیں لیکن عزیز احمد کا خیال اس بارے میں خاصا مختلف ہے انہوں نے لکھا ہے:اور(یہ بھی اس تحریک سے پہلے لکھے گئے کی بابت ہے)

> ''قاضی عبدالغفار کا''لیلیٰ کے خطوط''پہلا ترقی پسند ناول ہے۔ناول کا اطلاق اس کتاب پر ذرا مشکل ہی سے ہوتا ہے جو انشا پردازی پرانے معنوں میں سے قصے کا کام لیتی ہے قاضی صاحب نے ناول کی اس نوع کی پیروی کی ہے جو اٹھارویں صدی میں فرانس اور انگلستان میں بہت مقبول تھی اور''خطوط کا ناول'' کہلاتی تھی۔'' ۳ے

عزیز احمد نے اسی سراغ میں بہت سی خیال افروز اور دلچسپ باتیں کی ہیں انہوں نے ترقی پسندی کا ناتا اس رومانیت سے بھی جوڑا ہے جو ہندوستانی ادب میں پہلے سے ایک تحریک کی شکل میں موجود تھی اور اسی کو پس منظر قرار دیا ہے ترقی پسندوں کے لیے وہ لکھتے ہیں:

> ''رومانوی روایت نے ہمارے ادب میں حقیقت کے عکس کو بہت کچھ دھندلا دیا۔ چھایاوادی اثرات نے شاعری کو زندگی کی حقیقتوں سے اب تک قابل احترام فاصلے پر رکھا لیکن اسی رو سے پھر نئے راستے بھی نکلے ایک راستہ میراجی، راشد کا ہے۔۔۔دوسرا راستہ ترقی پسند مصنفین کی صفوں سے ہوکر گزرتا ہے یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ فیض، مجاز اور سردار جعفری کی شاعری، کرشن، احمد علی اور عصمت کے افسانے اور اختر حسین رائے پوری کی تنقیدیں وہ جدت طرازیاں دکھاتے ہیں۔مشاہدے اور بیان کی ندرت کبھی کبھی لطف دے جاتی ہے۔'' ۴ے

جیسے''بتان حرم''میں یہ شعر ۵ے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آہ وہ دوشیزہ لب، گل ریز لب، گل نار لب
آہ وہ لب آشنا لب، شوخ لب، خونبار لب

اور پھر آپ خود انصاف کریں کہ اگر ترقی پسند تحریک جملہ اثرات باہر سے لے کر آئی تو وہ قابل قدر، قد آور ہستیاں جو اس کے پہلے پہل کے اجلاسوں اور منشور پر دستخط کرنے والوں میں شامل تھیں کیا ان کی تمام تر شہرت اور نظریے سید سجاد ظہیر کے ساتھ آئے تھے۔

"اس کانفرنس میں شرکت کے لیے منجملہ اور لوگوں کے منشی پریم چند، مولوی عبدالحق اور جوش ملیح آبادی بھی آئے تھے ان کے علاوہ مولانا عبدالسلام ندوی ، منشی دیانرائن نگم، ڈاکٹر محی الدین زور، فراق اور ڈاکٹر اشرف شامل تھے۔" ۶ے

اور ویسے بھی کوئی تحریک گملے میں نہیں اُگتی اس کی جڑیں اپنی سرزمین میں پہلے سے موجود ہوتی ہیں اور پھر انھی جڑوں پہ جو پودا سر نکالتا ہے اسی کی شاخوں، پھلوں پھولوں سے تحریک کی شناخت ہوتی ہے اور پھر محنت اور ہمت کے مراحل طے کر کے یہ صورت بنتی ہے کہ۔

ہم نے خیرات میں یہ پھول نہیں پائے
خونِ دل صرف کیا ہے تو بہار آئی ہے

یوسف تقی صاحب اسی مرحلے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"ترقی پسند تحریک بڑی ہنگامہ خیز سہی، آگے بڑی دھیرے دھیرے ہی بڑھی تھی۔ سجاد ظہیر سے پہلے بھی یہاں انقلاب آچکا تھا نذرالسلام، اقبال، پریم چند، جوش سب تو خیر ستون انقلاب میں ہی ان کے علاوہ بے شمار شعراء ادباء چھوٹے چھوٹے پودوں کی طرح انقلاب کے سائے گھرے کرنے میں مشغول

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ.

www.KitaboSunnat.com

تھے۔" ۷ے

"اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ ملک کی سب سے بڑی ادبی تحریک ہے جو صرف ایک زبان تک محدود نہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کی ہر زبان کے بہترین ادیب اس تحریک سے وابستہ ہیں۔ ویسے اس کے لیے یہ سعادت بھی کچھ کم نہیں کہ اس کو ٹیگور اور پریم چند، جوش اور ولاتھول کی سرپرستی نصیب ہوئی اقبال کی دعائیں ملیں۔ اسکے پہلے اعلان نامے پہ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر عابد حسین اور مولانا نیاز فتح پوری کے بھی دستخط تھے اور اس کے نوجوان قافلے میں نو مشق ادیبوں کی ہمت افزائی کے لیے مجنوں گورکھپوری اور قاضی عبدالغفار جیسے پختہ کار ادیب شامل رہے۔" ۸ے

اور شہزاد منظر نے رشید احمد صدیقی کے حوالے سے لکھا:

"ترقی پسند تحریک سے بہت پہلے اُردو ادب کے مزاج میں سیاسی اور سماجی شعور کا داخلہ شروع ہو گیا تھا۔ حالی، آزاد اور اقبال کے ذہنوں میں ان تحریکات کی گونج ملتی ہے۔ ہندوستان میں صنعتی انقلاب کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ نئے موضوعات سخن جنم لے چکے تھے چنانچہ میرا خیال ہے کہ اگر انجمن ترقی پسند کی بنیاد ۱۹۳۵ء میں نہ بھی پڑتی جب بھی اُردو شاعری موجودہ موضوعات سخن سے دوچار ہوتی۔" ۹ے

یعنی یہ بات واضح ہے کہ یہ احساس یکا یک باہر سے نہیں آیا بلکہ ہر حساس اور ذی شعور وقت کی تبدیلیوں اور معاشرے کے سماجی رویوں سے متاثر ہوتا ہے اور مسلمان تو خاص طور پر ۱۸۵۷ء کے بعد سرسید تحریک کے بعد اسی ترقی پسندی کے رجحان سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خاصے متاثر تھے:

''یوں تو کسی کو بھی ترقی پسند کہہ دینا کوئی مشکل بات نہیں لیکن اگر بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو حالی اور سر سید کے علاوہ کوئی بڑے سے بڑا ترقی پسند نہ پیدا ہوا نہ ہوگا۔ جنسی چٹخارے دار افسانے اور لینا پکڑنا، اٹھنا، جاگنا ٹائپ کی نظمیں ترقی پسندی نہیں ہیں۔ ترقی پسند جدید نظریات کے مطابق ذہنوں کو مکمل طور پہ ڈھالنا ہے اور یہ کام سر سید اور حالی سے بہتر کسی نے کیا کیا ہوگا۔'' ۸۰

خود سبط حسن نے ''روشنائی'' کے دیباچے میں لکھا ہے کہ:

''ترقی پسند ادب کی تخلیق کسی، عہد، کسی قوم، کسی زبان کا اجارہ نہیں ہے بلکہ ادیبوں نے ہر دور میں معاشرے کے صحت مند رجحانات کی پذیرائی اور ظلم و جبر کی قوتوں کی مذمت کی ہے۔ ترقی پسندی کا تعین زندگی میں ہو یا ادب میں معاشرہ اپنے سماجی شعور اور وقت کے تقاضوں کے مطابق کرتا ہے اسی لیے معاشرہ کی تبدیلی کے ساتھ ترقی پسندی کے مفہوم میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔'' ۸۱

لیکن اس بات سے انکار کرنا بھی غلط ہے کہ ترقی پسند تحریک غیر ملکی اثرات کی آئینہ دار نہیں ہے۔ ایسا ہے اور اس کی اپنی وجوہات ہیں کہ باہر سے لائے ہوئے اثرات کیسے ہمارے حالات پہ منطبق ہوئے اور کیسے ان اثرات نے اس ہنگامہ خیز تحریک کا بوٹا لگایا، اسے آگے بڑھایا اور اس پر پابندی بھی لگوادی اور یہ کوئی پہلی بار نہیں ہوا۔

''اُردو غزل میں ولی اس لیے ممتاز ہے کہ اس نے فارسی شاعری سے اُردو غزل کی امتزاجی کیفیت کو وہ روپ دیا جو آج بھی اُردو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غزل کا حصہ ہے۔" ۸۲

اور مزید ملاحظہ ہو:

"اُردو نظم میں حالی اور آزاد نے جو بھی تبدیلی لانے کی کوشش کی وہ انگریزی اثرات کے تابع ہے۔"

اور یہ بھی موجود ہے:

"مرثیہ اور قصیدہ نہ ہوتے اُردو ادب میں اگر عربی ادب سے استفادہ نہ ہوتا" ۸۳

یعنی غزل سی جاندار، نظم کی سی خوبصورت، مرثیے کی قوی، قصیدے کی ختم ہوتی سب روایات کے ڈانڈے کہیں باہر سے ہی ملتے ہیں۔ نثری نظم ہو یا سانیٹ، آزاد نظم ہو یا نظم معریٰ یہ سب بھی باہر سے آئی ہوئی ہیں اور یہ استفادے کوئی معیوب نہیں ہیں۔

ڈاکٹر خورشید جہاں نے لکھا:

"کوئی بھی ترقی یافتہ ادب اپنی حدوں میں اس حد تک سمٹا ہوا نہیں ہوتا کہ اس پر دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے اثرات نہ پڑتے ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شعرو ادب میں لین دین کا کاروبار مسلسل چلتا رہتا ہے۔ اس سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ادب جو دوسری زبان کے ادب سے بعض اعتبار سے کمزور ہوتا ہے وہ اخذ و استفادہ کے مرحلے میں کچھ زیادہ ہی تیز رفتار ہوتا ہے۔" ۸۴

اور پھر ترقی پسند تحریک والے تو خود بھی اس بات کا ببانگ دہل اقرار کرتے ہیں کہ وہ دنیا کے حالات اور دوسری چیزوں سے متاثر ہوئے ہیں۔

"بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ جب ہر دور میں ترقی پسند ادب ن تخلیق ہوتی رہی اور جب حالی، شبلی، اقبال بھی ترقی پسند ہیں تو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پھر آخر ترقی پسند مصنفین کی انجمن بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یہ سوال ایسا ہے کہ جب دنیا میں آج تک پھول کھلتے رہے ہیں تو باغ لگانے کی کیا ضروت ہے۔ اس انجمن کی ضرورت اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ افراد اجتماعی طور پر ادبی مسائل پر بحث کریں۔ سماجی کیفیت کا تجزیہ کریں اور اس طرح مشترکہ نصب العین قائم کریں کیونکہ جنگ عظیم، تحریک آزادی اور انقلاب روس نے مل کر دنیا میں اتنی تبدیلی کردی ہے کہ اس انجمن کی ضرورت فزوں تر ہوگئی ہے۔" ۸۵

سردار جعفری نے لکھا:

"پیرس کانفرنس کے انعقاد سے چند ماہ پہلے سجاد ظہیر اور ملک راج آنند نے لندن میں مقیم ہندوستانی طالب علموں کی مدد سے ترقی پسند مصنفین کی انجمن بنانے کے خیال کو عملی جامہ پہنایا۔ لندن کے ناکنگ ریستوران میں اس کا پہلا اعلان نامہ تیار کیا گیا جس پر ہندوستان کے بڑے بڑے محترم ادیبوں نے بعد کو دستخط کیے اور وہ تحریک پیدا ہوئی جو اپنی وسعت، ہمہ گیری اور دور رس نتائج کے اعتبار سے سرسید اور حالی کی تحریک سے بھی کہیں زیادہ اہم ہے۔" ۸۶

یعنی دنیا کے حالات اور جدید خیالات سے متاثر ہو کر اس انجمن کی بنیاد رکھی گئی۔ سبط حسن "روشنائی" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"ترقی پسند ادب کے تحریک کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھی اور نہ کسی کی سازش تھی بلکہ پہلی جنگ عظیم کے بعد دنیا میں جو حالات پیدا ہوئے ان کا قدرتی نتیجہ تھی۔ اقتصادی بحران اور دیگر حالات میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

> بے چینی کی ایک طوفانی لہر جو زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گئی۔ چین پر جاپان کا حملہ، جرمنی میں جمہوریت کا خاتمہ، اسپین میں جمہوری حکومت کے خلاف جنرل فرانکو کی بغاوت ایسے سانحے تھے جن کے عواقب ونتائج کا اندازہ لگانا عام آدمی کے لیے بھی چنداں مشکل نہ تھا چہ جائیکہ ادیبوں کے لیے۔" ۸۷

محمد علی صدیقی نے اپنے مقالے "ترقی پسند ادب محرکات ورجحانات" میں اس بات پہ بار بار زور دیا ہے کہ روس کا انقلاب، جنگ عظیم دوم کے بعد آزادی کی تحریکوں کا دنیا بھر میں پھیلانا، اور مغربی سامراجیت اور معیشت کے غلط اصولوں نے دنیا میں ایسے تغیرات کو جنم دیا جو ایسی اجتماعی سوچ کا باعث بنے کہ افراد ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ایک زنجیر بے پایاں کی مانند ان سب چیزوں کے سامنے کھڑے ہو گئے اور ذہنوں میں بھی ایسے ہی احساس نے جنم لیا کہ سب کو ساتھ لے کر چلو، ڈاکٹر آغا افتخار حسین کے مطابق ایسے حالات میں:

> "جب بھی ارباب اختیار کی کوتاہ اندیشی نے اصلاح کا راستہ روک دیا تو انقلاب آگیا۔ ان ادیبوں نے کہانیاں، ناول ڈرامے، نظمیں سب کچھ ہی لکھا ان کا مقصد زیادہ تر تغیر آفرینی تھا۔" ۸۸

اور یہ ادب جو تغیر آفرینی کا خواہش مند تھا اس میں سب سے ضروری امر ترقی پسند تحریک کے تحت یہ قرار دیا گیا کہ عوام میں نچلے طبقے کی زیادہ سے زیادہ عکاسی کی جائے اور عالمی تبدیلیوں کے ساتھ شانہ بشانہ زندگی، ادب اور عصر کو چلانے کی خواہش کو اپنا اصول قرار دیا اور سماجی زندگی کے خارجی ڈھانچے میں تبدیلی کو اپنا مطمع نظر۔ محمد علی صدیقی نے اپنے مقالے میں اسی نظریے کی وضاحت کی ہے کہ ان قدروں میں تبدیلی کر کے ترقی پسند

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ادب اپنا مقصد پورا کرنا چاہتا تھا کہ:

”ترقی پسند ادب جدلیاتی مادیت پر قائم ایک ایسا سماجی نظام سامنے لایا جس نے کچلے ہوئے عوام کو اپنی توجہ کا مرکز اور طاقت کا منبع قرار دیا۔“ ۸۹

اسی لیے جو ادب سامنے آیا اس کا اصول تھا کہ بقول پریم چند

”بے شک آرٹ کا مقصد ذوقِ حسن کی تقویت ہے اور وہ ہماری روحانی مسرت کی کنجی ہے۔ مسرت خود ایک افادی شے ہے۔“ ۹۰

اور یہ خیال انقلاب روس سے جڑا ہوا معلوم ہوتا تھا اس لیے دنیا بھر میں سامراجیت کے خلاف ہونے والی جدوجہد سے اس کا ناتا بھی جوڑا گیا اور انھی خیالات کے تحت جو ادب تخلیق ہوا اسے بھی انھی خوبیوں کا حامل سمجھا گیا۔ خود اختر انصاری تسلیم کرتے ہیں:

”انقلابی ادب پرولتاری اور عوامی نقطہ نظر سے زندگی کی تفسیر و تنقید کا نام ہے۔“ ۹۱

اور پھر مجنوں گورکھپوری نے بھی عوامی نظر اسی کو قرار دیا کہ مزدوروں اور کسانوں کا ذکر کیا جائے۔

”مزدوروں اور کسانوں سے ہمارے شغف کی غرض صرف یہ ہے کہ ان پر زندگی اور ترقی کی تمام راہیں عام ہو جائیں اور ایک غیر طبقاتی نظامِ معاشرت قائم ہو جائے۔“ ۹۲

اور یہ واضح رہے کہ یہ سب تصورات روسی ادب اور سامراجی نظام کے خلاف تھے۔ علی سردار جعفری نے بھی یہی لکھا ہے کہ:

”پہلی جنگ عظیم کے بعد مزدوروں اور کسانوں کی بیداری اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تنظیم سے قومی تحریک آزادی کا پاٹ چوڑا ہوگیا اور اس میں
گہرائی پیدا ہو گئی۔ مزدور تحریک منظم ہونے لگی سامراج کی
بنیادیں ہلنے لگیں اور یہ حقیقت واضح ہونے لگی کہ اب انقلاب
کے راستے پہ چلنا ہے اور جو نئے طبقے اس میں شامل ہونے آنے
لگے تو شاعری اور ادب میں بھی ان کا اپنا حصہ ہے (وہ اپنے
ساتھ اپنی شاعری لے کر آئے تھے جو دیہاتی اور مزدور گیتوں کی
شکل میں تھی۔" ۹۳

اگر چہ ترقی پسند تحریک کے ناقدین وقتاً فوقتاً اس بات کی وضاحت کرتے رہے کہ ایسا نہیں ہے کہ صرف غیر ملکی اثرات اور عالمی ادب اور سیاست کے تحت ایسا ہو رہا ہے لیکن یہ امر پھر بھی ترقی پسندی کے ساتھ لازم و ملزوم ہی رہا اور پھر ہر تحریک کے عناصر فضا میں پہلے سے موجود ہوتے ہیں تنظیم و تربیت کے عمل سے گزرتے ہیں پھر نمایاں ہو کر ایک عہد کے عام شعور کا حصہ بن جاتے ہیں پھر انہی عناصر کی چھتر چھایا میں ایک تحریک نمو پذیر ہوتی ہے اور ادب کو اپنا منشورِ اعلیٰ بنا کر آگے بڑھنے کے لیے ابلاغ کی راہیں تلاش کرتی ہے اس لیے اس بات سے چشم پوشی کرنا غلط ہے کہ ترقی پسند تحریک نے اس سیاسی انقلابی عہد کی تحریکوں سے آنکھ بند کر کے صرف ادبی ترقی پسندی کو جنم دیا ہے۔

"اُردو ادب کی وہ جدید تحریک جو ترقی پسندی کے نام سے موسوم
ہے دراصل وہ عناصر ترکیبی سے مل کر بنی ہے دو دھارے ہیں جو
اس میں مل کر بہتے ہیں۔ ان دو دھاروں میں سے ایک حقیقت
نگاری ہے اور دوسری انقلابی تحریک۔" ۹۴

عزیز احمد کا خیال بالکل درست ہے اور "ترقی پسند تحریک منشوروں کی روشنی" نام کے مقالے میں میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے صاف طور پہ اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

”ترقی پسند تحریک کا بااثر حلقہ آغاز سے ہی اشتراکی نظریات کا
حامل تھا۔ چنانچہ انسانی تاریخ و تہذیب کے مارکس نقطہ نظر کے
مطابق ادب کی ماہیت سماج اور سماج کا ادب کی ساخت
و پرداخت میں بہت حصہ ہوتا ہے۔“ ۹۵

یہی وہ نازک فرق تھا جسے ترقی پسند ادب والے اور زندگی دونوں میں الگ الگ کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن جو چیز ان کی تحریک کا بقول شہزاد منظر ”مین پوائنٹ“ تھی اس کو کسی طرح الگ نہ کر سکے اور پھر اسی فرق کو دور کرنے کی وجہ سے مولوی عبدالحق، نیاز اور بعد میں احمد ندیم قاسمی جیسے خالص ادباء و شعراء کے ہوتے ہوئے بھی اس تاریخ ساز تحریک پہ ”سیاسی اور خالص سیاسی“ تحریک کہہ کر قانونی پابندی تک عائد کردی گئی بازوں اور بائیں بازوں کی بحث کا آغاز کیا۔

یہ وہ غیر ملکی نظریہ ہے جس نے تحریک کے ادبی مقاصد کو متاثر بھی کیا اور اس کے مخالفین میں بھی خاطر خواہ اضافہ کیا اور حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک کو غیر ملکی خیالات کا حامل اسی نظریے کی وجہ سے سمجھا جاتا ہے۔ شہزاد منظر کا ایک طویل اقتباس اسی بات کی بڑی اچھی وضاحت کرتا ہے:

”ترقی پسندوں کے انتہا پسند عناصر نے ترقی پسندی کے تصور کے
ساتھ ایک ظلم یہ کیا کہ اسے جامد تصور بنا کر ایک مخصوص نظریے
سے وابستہ کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ترقی پسند ہونے کا مطلب
اشتراکی قرار پایا۔ ایسا صرف اس کے مخالفوں نے نہیں سمجھا خود
اشتراکی عناصر نے اپنے عمل کے ذریعے ثابت کر دیا۔ اسی لیے
آج ترقی پسندی اور اشتراکیت اہم معنی اصطلاح بن گئی ہے
حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ترقی پسند ہونے کا مطلب
ہرگز اشتراکی ہونا نہیں ہے۔ ترقی پسندی ایک نقطہ نظر کا نام اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زندگی کو سمجھنے کا ایک زاویہ ہے۔ضروری نہیں کہ یہ زاویہ اشتراکی ہی ہو۔ترقی پسندی کوئی جامد تصور نہیں یہ ہر دور میں موجود رہا ہے اور ہر دور میں رہے گا۔ترقی پسندی کو جامد ۱۹۲۹ء میں کیا جب روس میں اسٹالن کے عہد میں ژدانوف نے ادب وفن کو سوشلزم کی ترویج و اشاعت کے لیے وقف کر دینے پر زور دیا۔انجمن ترقی پسند مصنفین میں اسی کے بعد ہی ادبی چھوت چھات اور نظریاتی تنگ نظری کا دور شروع ہوا۔" ۹۶

خود ترقی پسندوں کو اس بات کا احساس شروع دن ہی سے ہو چکا تھا کہ ان کی ادبی خدمات کو سراسر کمیونسٹ خیالات اور اشتراکی نظریات کا ضمیمہ سمجھا جا رہا ہے چنانچہ اس قسم کی وضاحتیں ہوتی رہیں۔

> "شاعر کا پہلا کام شاعری ہے،وعظ دینا نہیں ،اشتراکیت وانقلاب کے اصول سمجھانا نہیں۔اصول سمجھنے کے لیے کتابیں موجود ہیں۔اس کے لیے ہم کو نظمیں نہیں چاہئیں۔اگر فن کے اعتبار سے بھونڈا پن ہو تو ہمارے احساسات کو لطافت کے ساتھ بیدار کرنے سے قاصر ہو گا تو اچھے سے اچھے خیال کا بھی وہی حشر ہو گا جو دانے کا بنجر زمین میں ہوتا ہے۔" ۹۷

سجاد ظہیر اور ان کے ساتھیوں کے اس قسم کے بیانات بھی ان کا یہ تاثر دھو نہیں سکے وہ لگا تار کہتے رہے کہ:

> "ہم تحریک انقلاب اور نیشنل کانفرنس میں شامل نہیں مگر درونِ پردہ عوام کو اپنی کہانیوں سے غلامی ،افلاس اور استحصال کا احساس دلا سکتے ہیں؟" ۹۸

اور بار بار ان کا تیسرے طبقے کے حقوق کی طرف اشارہ کرنا ہمیشہ لینن کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لائے ہوئے انقلابی غیر ملکی خیالات کا تابع ہونا سمجھا جاتا رہا۔ خود ان کے اپنے حمایتی کچھ یوں کہتے رہے ہیں۔ احتشام حسین لکھتے ہیں:

”ہندوستانی ترقی پسند تحریک دنیا میں ترقی پسندی کی تحریک ،اشتراکیت کے اصولوں کے، فاشزم کے خلاف تمدنی وادبی محاذ عام تحریک کا حصہ ہے“۔ ۹۹

اور بات یہی سچ ہے کہ ترقی پسند تحریک کی جڑیں موجود ضرور تھیں لیکن نُمو کا پودا غیر ملکی نظریات کے سایے تلے ہی بڑھنے پھولنے میں کامیاب ہوا۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نے بھی اپنے مقالے، مارکسزم اور ادب میں اسی طرح کے اعترافات کئے ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر کریم الدین نے بتایا کہ:

”مارکسزم علاقہ واریت سے قطعی طور پر نا آشنا ہے جو لوگ اپنی تحریک سے طبقاتی کی بجائے علاقائی شعور پیدا کرتے ہیں ترقی پسندوں کے دشمن ہیں“۔ ۱۰۰

ن۔م۔راشد نے ترقی پسندوں کے بارے میں کہا:

”ان کی شاعری کے تمام موضوعات اپنی اندرونی افتاد اور رونمائی کے بجائے غیر ملکی نظریات اور دباؤ پر منحصر تھے“ ۱۰۱

اور یہ بات واقعی ڈھکی چھپی نہیں کہ انقلاب روس یا اشتراکیت ہماری ترقی پسندی پہ اثر انداز ہوئی یا نہیں۔ شہزاد احمد نے بالکل سولہ آنے کھری بات کہی ہے:

”ہم ہر چند کسی اشتراکی ملک میں نہیں رہتے مگر روس سے قطعی طور پر بے پروائی نہیں برت سکتے اسی طرح ہم یورپ کے فلسفے اور سائنس سے بھی متاثر ہوتے ہیں آج دنیا سمٹ آئی ہے اس لئے یہ مطالبہ کرنا کہ ایک خاص فلسفہ چونکہ لاہور کے لوگ کم جانتے ہیں اسلیئے ادب میں نہ آنا چاہیے درست نہیں“ ۱۰۲

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ڈاکٹر انور سدید ممتاز حسین کا ایک بیان اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

”ترقی پسند تحریک کی بنیاد اس فلسفے پر تھی جو باہر سے لایا گیا تھا یعنی مارکسزم“ ۱۰۳

خلاصہ کلام یہی ہے کہ اس ترقی پسند تحریک کا بیج باہر سے آیا لیکن چونکہ ملک کے حالات، پہلی گزری ہوئی تحاریک کے منفی اثرات اور بدلتے زمانے نے زمین ہموار کر دی تھی اس لیے یہ بوٹا خوب بڑھا پھولا بقول غلام حسین ذوالفقار:

”قدیم مکتب فکر کے پروردہ تھے اور نئے مغربی افکار سے لیس۔“ ۱۰۴

اور اسی نے مل جل کر تحریک کو آگے بڑھنے میں مدد دی لیکن سو فیصدی یہ کہنا درست نہیں کہ سب کچھ باہر سے آیا۔ اندر باہر ماضی حال سب کو اکٹھا کر کے ہی یہ تحریک آگے آئی بقول انتظار حسین:

”حال کوئی بیر بوٹی قسم کی شے تو نہیں ہے جسے چٹکی سے پکڑ کر ہتھیلی پر رکھ لیا جائے وہ تو آگے پیچھے ماضی اور مستقبل کا جلوس لے کر ظاہر ہوتا ہے۔“ ۱۰۵

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترقی پسند تحریک۔ ایک جائزہ

انور احسن صدیقی

تقریباً ۶۹ سال پہلے سجاد ظہیر نے ہندوستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی تھی، جسے ہماری ادبی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت حاصل تھی۔ انجمن کا قیام ادب میں ہزار ہا برسوں سے موجود ترقی پسند اور انسان دوست رجحانات و نظریات کو پہلی بار ایک منظم، مربوط اور ٹھوس شکل میں متحد کرنے کی انقلابی کوشش تھی۔ ادب کی تاریخ میں اس سے پہلے ایسی کسی بھرپور سائنسی کوشش کا سراغ نہیں ملتا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ معاشرے نے ان فکری قوتوں کو اتنا مستحکم نہیں کیا تھا جو اس قسم کی کسی تحریک کے لیے بنیاد فراہم کرسکیں۔ تاریخی عمل کے ایک خاص مرحلے پر پہنچ کر ان فکری قوتوں کے لیے لازم ہوگیا کہ وہ ایک باضابطہ تحریک کی شکل اختیار کرلیں چنانچہ ادب میں ترقی پسند تحریک کا ظہور ہوا اور اس تحریک نے اپنے لیے ایک تنظیم کی ضرورت کو لازمی قرار دیا۔

گزشتہ صدی کے نصف اول کا دور، نوعِ انسانی کی تاریخ کا سب سے زیادہ پرآشوب انقلاب آفریں اور ہنگامہ خیز دور تھا۔ ایشیا، افریقا اور لاطینی امریکا کے بیشتر ممالک یورپ کے مٹھی بھر ممالک کی محکومی اور غلامی کا شکار تھے اور دنیا بھر میں بدترین استحصال کی گرم بازاری تھی۔ یوں تو افریشیائی اور لاطینی امریکی ممالک کی غلامی اور محکومی کا عذاب کئی صدیوں سے جاری تھا۔ لیکن گزشتہ صدی کے نصف اول کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ غلامی اور محکومی کے اس احساس کی شدت میں اضافہ ہونے لگا تھا اور شعوری جدوجہد آگے بڑھنے کے راستے تلاش کررہی تھی۔

ہندوستان میں پہلی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں لڑی گئی، لیکن یہ ایک غیر منظم اور منتشر نوعیت کی ایسی جدوجہد تھی جس میں ہندوستانی عوام کی بڑی تعداد شامل نہیں تھی۔ اس جدوجہد کی جڑیں وسیع پیمانے پر عوام تک نہیں پہنچ پائی تھیں اور فرسودہ اور کمزور جاگیرداری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قیادت میں سرمایہ داری کی مضبوط اور تازہ ابھرتی ہوئی قوت پر غالب آنے کی سکت نہیں تھی لیکن ۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی نے اپنی ناکامی کے باوجود ہندوستانی سماج اور ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ فکروخیال کے دھاروں میں نئی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اصلاح پسندی اور خرد افروزی کی تحریکات نمودار ہوئیں جو ہماری ادبی تاریخ میں ایک نئی چیز تھی۔ ان تحریکات کے زیرِ اثر وجود میں آنے والا ادب اپنے ماضی کے اعتبار سے ترقی پسند ادب تھا۔ کیوں کہ یہ ماضی کے ادب سے اس لحاظ سے خاصا مختلف تھا کہ یہ زندگی کے زیادہ وسیع موضوعات کا اور معاشرتی مسائل کا اپنے عہد کے پیمانے کے مطابق معروضی انداز میں احاطہ کرتا تھا۔

بیسویں صدی کے نصف اول میں صورتِ حال بہت تبدیل ہو چکی تھی عالمی پیمانے پر بھی اور خود ہندوستان کے اندر بھی ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس نے ساری دنیا کے محکوم ملکوں کے عوام کو ایک نئی راہ دکھائی تھی۔ عالمی پیمانے پر محکومی اور غلامی کے خلاف جدوجہد نے ایک نیا رنگ اور آہنگ اختیار کر لیا تھا۔ ہندوستان میں آزادی کی تحریک جو انداز اختیار کر رہی تھی وہ ۱۸۵۷ء کے زمانے سے بہت مختلف تھا۔ اب عوام کی بھاری تعداد میں آزادی کا شعور بیدار ہو رہا تھا اور سیاسی پارٹیاں بھی وجود میں آ رہی تھیں ایک باقاعدہ سیاسی جدوجہد شروع ہو چکی تھی جس کی قیادت فرسودہ اور کمزور جاگیردار طبقے کے ہاتھ میں نہیں تھی۔ بلکہ ہندوستان میں نئی ابھرتی ہوئی طبقاتی قوتیں اس جدوجہد کی تنظیم اور رہنمائی کر رہی تھیں۔ یہ ماضی کے قبرستانوں میں دفن ہو جانے والی جاگیرداری قوتیں نہیں تھیں بلکہ مستقبل میں عنانِ اقتدار سنبھالنے والی قوتیں تھیں، جنھیں عوام کی مکمل تائید وحمایت کی ضرورت تھی۔

یورپ میں فاشزم کا خطرہ منڈلا رہا تھا۔ سپین فاشسٹوں کی ایماء پر خانہ جنگی کی زد میں تھا۔ جرمنی میں فاشسٹ حکومت قائم ہو چکی تھی اور دنیا دوسری عالمی جنگ کے دہانے پر کھڑی تھی دنیا بھر میں عوامی شعور تیزی سے بیدار ہو رہا تھا اور ایشیا، افریقا اور لاطینی امریکا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ممالک کے عوام کی آزادی کی خواہش اور جدو جہد زیادہ گہرائی اور گیرائی حاصل کر رہی تھی۔ زندگی کے ہر شعبے کی طرح ادب میں بھی ایسی نئی آوازوں کی ضرورت تھی جو اس ہنگامہ خیز دور میں زندگی کی تعمیر نو کا پیغام دے سکیں۔ معروضی حالات ایک ایسی ادبی تنظیم کے قیام کے متقاضی تھے جو عہد جدید میں ادب اور عوام کے درمیان گہرے اور قریبی رشتے قائم کر کے ادب کو زندگی کا نہ صرف حقیقی ترجمان بنا دے بلکہ اسے زندگی کی نئی صورت گری کا امکان اور حوصلہ بھی بخشے۔ چنانچہ اسی معروضی ضرورت کے تحت ہندوستان میں ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا، جب کہ برطانیہ میں اسے ایک سال پہلے انجمن قائم ہو چکی تھی ہندوستان میں تاریخ نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کا اعزاز سید سجاد ظہیر کو بخشا جو ایک نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص اور ایک بہت متمول گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ سجاد ظہیر (مرحوم) نے اپنے طبقے کے مفادات کو ترک کر کے محنت کش عوام کے مفادات سے رشتہ جوڑا اور اس رشتے کے تقدس کو انھوں نے اپنی زندگی کے آخری لمحات تک نبھایا۔ تاریخی قوتیں جب کسی عمل کو معاشرے کے لیے ناگزیر قرار دیتی ہیں تو پھر اس عمل کو انجام دینے کے لیے معاشرے کے کچھ غیر معمولی طور پر ذہین حوصلہ منداور باشعور لوگ آگے آتے ہیں اور تاریخی قوتوں کا ساتھ دیتے ہوئے اس عمل کو آگے بڑھاتے ہیں۔ یہیں سے تاریخ میں فرد کے کردار کا تعین ہوتا ہے۔ سجاد ظہیر (مرحوم) نے اپنے رفقاء کے ساتھ مل کر ہندوستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی جس نے ادب میں نئی معنویت اور نئی تفہیم کی راہوں کو روشن کیا اور جمالیاتی قدروں کے نئے سانچے تشکیل دیے۔ انجمن نے قاری اور ادیب کے درمیان نئے رشتوں کی بنیاد ڈالی اور ادیب کو قاری کے دُکھ درد کا اس کی خوشیوں اور محرمیوں کا اس کی امیدوں، آرزوؤں، امنگوں اور اس کے ہر طرح کے محسوسات کا ساتھی بنا دیا۔ یہ شرکت صرف اس صورت میں ہی ممکن ہو سکتی تھی۔ جب ادیب نہ صرف یہ کہ قاری اور معاشرے کے درمیان موجود معروضی رشتوں کی اچھی طرح چھان بین کرے بلکہ قاری کی روح کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھنے کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ ترقی پسند تحریک نے ادب کو جانچنے اور پرکھنے کے نئے سانچے مقرر کیے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخیں دیکھتے ہی دیکھتے، ہندوستان کے دور دراز گوشوں تک میں قائم ہو گئیں اور اس تحریک کے زیر اثر لکھنے والوں کی اتنی بڑی تعداد منظرِ عام پر آئی کہ اس سے پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔ ترقی پسند تحریک نے دلوں کو روشن کیا، ذہنوں کو جلا بخشی، دماغوں پر جمی ہوئی کہنہ اور منفر افکار کی گرد کو صاف کیا اور ہندوستانی سماج کی تعمیر نو کی جدوجہد میں ایک نہایت اہم کردار ادا کیا۔ برطانوی غلامی کے خلاف ہندوستانی عوام کی جنگِ آزادی میں ترقی پسند ادب، ایک بہت مؤثر اور کارگر وسیلے کا کام دیتا رہا۔ اُردو میں ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر جو ادب پیدا ہوا وہ بلاشبہ، اُردو زبان کی تاریخ کا اعلیٰ ترین اور مؤثر ترین ادب تھا اور اس کے تخلیق کرنے والے اپنے عہد کے سب سے زیادہ بلند پایہ لوگ تھے۔

تقسیمِ ہند کے وقت تک متحدہ ترقی پسند تحریک برصغیر جنوبی ایشیا کے علاقے میں اپنے عروج کے ساتھ جاری و ساری رہی۔ علاقے میں دانستہ طور پر پیدا کی جانے والی فرقہ پرستی اور مذہبی جنون کے خلاف ترقی پسندوں نے تاریخی کردار انجام دیا۔ تقسیم ہند سے متعلق جو ادب عالمِ وجود میں آیا وہ فرقہ پرستی اور مذہبی جنون کے خلاف ترقی پسند ادیبوں کا تخلیق کردہ ادب تھا جس کی اہمیت آج بھی باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گی۔

تقسیمِ ہند کے بعد انجمن ہندوستان میں تو کافی عرصے تک فعال رہی لیکن پاکستان اس معاملے میں اتنا زیادہ خوش نصیب ثابت نہیں ہوا۔ بدقسمتی سے پاکستان میں عنان اقتدار ایسے طبقات کے ہاتھ میں آ گئی جو ادب اور فنون لطیفہ کی جانب شروع سے معاندانہ رویہ رکھتے تھے اور آزادی اظہار کو محدود کرنے اور اس پر قدغن لگانے کے حامی تھے۔ مقتدر حلقوں کی منفی اور غیر حقیقی پالیسیوں کے باعث پاکستانی معاشرہ آج تک اپنی شناخت کی تلاش میں سرگرداں ہے اور ہمارے رہنما اب تک یہی فیصلہ نہیں کر پائے ہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ ہمارے تاریخی تشخص کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے موہن جوڈارو سے یا سندھ پر محمد بن قاسم کے حملے سے یا اگست ۱۹۴۷ء سے اور یہ کہ ہمیں اپنی تہذیبی روایات کی جڑوں کو کرۂ ارض کے کس حصے کی خاک میں تلاش کرنا چاہیے۔

پاکستان میں اظہار خیال کے مکمل آزادی کے ساتھ تخلیقِ ادب کا معاملہ ادیبوں کے لیے ہمیشہ ایک بڑا چیلنج بنا رہا ہے۔ جس معاشرے میں سیاسی گروہوں کے کارکن مقتدر حلقوں کی ایماء پر سڑکوں پر نعرے لگاتے پھرتے ہوں کہ "آلاتِ موسیقی توڑ دو" اس معاشرے میں ادب اور فنونِ لطیفہ کا فروغ ایک سوالیہ نشان بن کر رہ جاتا ہے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کو روزِ اول سے ہی سخت ترین آزمائشوں سے گزرنا پڑا اور حکومتوں کی جانب سے اس کو تعزیز و عقوبت کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔

ترقی پسند ادیبوں کو بار بار گرفتار کر کے جیل میں ڈالا جاتا رہا اور ان پر حصولِ رزق کے دروازے سے بند کیے گئے۔ دیگر تمام ترقی پسند تنظیموں کی طرح جنھیں حکومتِ وقت اپنے حق میں مضر سمجھتی تھی، انجمن ترقی پسند مصنفین پر بھی پابندی عائد کر دی گئی جو ایک طویل عرصے تک عائد رہی۔ لیکن تمام تر دشواریوں اور نامساعد حالات کے باوجود ترقی پسند ادیبوں نے ترقی پسندی کے پرچم کو بلند رکھا، اور گو کہ ان کے ہاتھ بار بار قلم ہوتے رہے مگر وہ پھر بھی جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں لکھنے میں مصروف رہے اور انھوں نے اُردو سمیت پاکستان کی کی تمام زبانوں میں اعلیٰ ترین ادب تخلیق کیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانی سجاد ظہیر کو جو کہ تقسیم ہند کے بعد پاکستان آ گئے تھے اور ان کے ساتھ دوسرے ترقی پسند ادیبوں کو کڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ انھیں قید و بند کی طویل صعوبتیں جھیلنی پڑیں۔ سجاد ظہیر کے پاکستانی ہم عصروں میں فیض احمد فیض، سبط حسن، حمید اختر اور ان کے علاوہ بہت سے دوسرے اکابرین شامل ہیں، جنھوں نے ساری زندگی جدوجہد میں گزاری وہ کبھی بھی موقع پرستی اور مفاہمت کوشی کا شکار نہیں ہوئے۔ ان کے بعد کی نسلوں نے بھی اس روایت کو زندہ رکھا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ادیبوں کی بھاری تعداد کو پاکستانی معاشرے میں ایسے ناساعد حالات سے گزرنا پڑا کہ ان کے لیے تخلیقِ ادب کے فریضے کو دیانت داری کے ساتھ انجام دینا پل صراط پر چلنے کے مترادف تھا۔ یہاں میں ایک پرانے واقعے کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ ایوب خان کے دورِ حکومت میں بیورآف نیشنل ری کنسٹرکشن کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا تھا، جس کا مقصد ادیبوں اور دانشوروں کو رقوم فراہم کر کے انھیں حکومت کی حمایت پر آمادہ کرنا اور ایوب شاہی کے قائم کردہ بنیادی جمہوریتوں کے نظام سمیت حکومتی پالیسیوں کی حمایت میں ان سے مضامین اور کتابیں وغیرہ لکھوانا تھا۔ آزادی اظہار کا اس وقت دور دور تک کوئی تصور نہیں تھا۔ پروفیسر ممتاز حسین (مرحوم) نے مجھے اور فہیم سرحدی (مرحوم) کو جو کہ اس وقت طالب علم تھے یہ مشورہ دیا کہ ادیبوں کی طرف سے ایک ایسا محضر تیار کیا جائے، جس میں حکومت وقت سے آزادی اظہار خیال کی بحالی کا مطالبہ کیا جائے اور اس محضر پر ادیبوں سے دستخط لیے جائیں۔ یہ محضر تیار کرلیا گیا اور میں فہیم سرحدی (مرحوم) اس کو لے کر کراچی کے ادیبوں سے دستخط کروانے کے لیے نکلے۔ کچھ ادیبوں نے بلا تامل اس پر اپنے دستخط کردیے لیکن کچھ نے دستخط کرنے سے مختلف حیلوں بہانوں سے تحت انکار کردیا۔ ریڈیو پاکستان سے وابستہ ایک نامور ادیب نے یہ کہہ کر دستخط کرنے سے انکار دیا کہ چونکہ سوشلسٹ ملکوں میں بھی آزادی اظہار رائے موجود نہیں ہے اس لیے پاکستان میں بھی اس کے لیے واویلا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک اور معروف ادیب نے جواب زندہ نہیں ہیں، بڑے خجالت آمیز اور معذرت خواہانہ انداز میں یہ کہا کہ اگر چہ وہ اس محضر کے مندرجات سے پوری طرح متفق ہیں، لیکن وہ اس پر دستخط کرنے سے اس لیے قاصر ہیں، کیوں کہ ان کے اشاعتی ادارے کو حکومت سے رقم ملتی ہے اور اگر وہ دستخط کردیں گے تو یہ رقم بند ہو جائے گی۔ ادیبوں پر دباؤ ڈالنے کی اور ان کے ضمیر کو خریدنے کی سرکاری کوششوں کا یہ سلسلہ تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ کسی نہ کسی طور پر ہمیشہ جاری رہا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاکستان میں مقتدر حلقوں نے ترقی پسند تحریک اور ادیبوں پر براہِ راست حملے کرنے کے ساتھ ساتھ ادبی محاذ پر اپنے گماشتوں اور حامیوں کے ذریعے جوابی تحریکات اور نظریات سے بھی کام لیا۔ ترقی پسند تحریک کے جواب میں ایک زمانے میں اسلامی ادب کی تحریک بڑے زور و شور کے ساتھ چلائی گئی لیکن اس تحریک کے بانی خود بھی اس امر کی کوئی وضاحت نہیں کر پا رہے تھے کہ اسلامی ادب سے ان کی کیا مراد ہے اور اس تحریک کے زیرِ اثر تخلیق کیا جانے والا ادب کس قسم کے جمالیاتی سانچوں کی تشکیل کرے گا۔ چنانچہ یہ تحریک خود بہ خود ختم ہوگئی۔ اس کے بعد طرح طرح کے نظریوں اور فلسفوں کے ذریعے ترقی پسند تحریک پر حملوں کا سلسلہ جاری رہا اور لکھنے والوں کی بڑی تعداد کو عوامی مسائل اور معروضی حقائق کے جمالیاتی ابلاغ و انکشاف سے دور رکھنے کی غرض سے طرح طرح کے طریقے اختیار کیے جاتے رہے۔

آج گلوبلائزیشن کے دور میں، جو فی الحقیقت مغربی سامراج کی بے لگام بلادستی اور تسلط کا دور ہے۔ سامراجی حلقوں اور ان کے نظریہ سازوں کی یہ بھرپور کوشش ہے کہ عالمی پیمانے پر دنیا کے ہر ملک میں طبقاتی جدوجہد کی راہوں کو روکا جائے تا کہ سرمایہ داری کی مطلق العنانی کو مکمل تحفظ فراہم کیا جا سکے اور آنے والے دور میں معاشی استحصال کے خلاف عوامی تحریکات کی بندش کی جا سکے۔ اس غرض سے ذرائع ابلاغ کی مدد سے لوگوں کے ذہنوں کو مسموم کرنا انھیں منفی اور مریضانہ خیالات و افکار کے گورکھ دھندے میں اُلجھا کر رکھنا اور مثبت اور حقیقت پسندانہ سوچ سے دور رکھنا سامراج کی اصل ضرورت ہے۔ ادب آج بھی انسانی ذہن کی تسخیر کا ایک مؤثر اور کارگر ذریعہ ہے اور سامراجیوں کی یہ کوشش ہے کہ وہ اسے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کریں۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں سوویت یونین اور عالمی سوشلسٹ نظام کے انہدام کے ساتھ ہی سامراجی گماشتہ دانشوروں نے ''بے نظریہ دنیا'' کا راگ الاپنا شروع کر دیا تھا اور ترقی پسند فکر اور سامراج دشمن تحریک کی موت کا فتویٰ صادر کر دیا تھا لیکن جلد ہی ان کھوکھلے دعووں کی حقیقت عالم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر آشکارہ ہوگئی تاریخ نے ثابت کر دیا کہ متحارک اور متصادم طبقات کی موجودگی میں "بے نظریہ دنیا" کا کوئی مطلب نہیں ہوتا نظریات کی یہ جنگ تو اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ سماج میں استحصال کرنے والوں اور استحصال کا شکار ہونے والوں کا وجود باقی ہے اور نظریات کی یہ جنگ ادبی میدان میں سمیت زندگی کے ہر شعبے میں جاری رہے گی۔

پاکستان کے ترقی پسند ادیب اور دانشور انتہائی ناساعد حالات کے باوجود ثابت قدمی کے ساتھ زندگی اور ادب ترقی پسندانہ نقطۂ نظر سے وابستہ رہے ہیں اور روشن ضمیری کے ساتھ اس کی ترجمانی کرتے رہے ہیں ترقی پسند فکر پاکستان کی تمام زبانوں کے ادب میں آج کی غالب اور فاتح فکر ہے اور یہی آنے والے دور کی بھی فکر ہے گذشتہ نصف صدی کے دوران پاکستان میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا سب سے زیادہ قابل قدر اور دقیع حصہ وہی ہے جو ترقی پسندانہ فکر کا آئینہ دار ہے پاکستان میں ترقی پسند تحریک کو طرح طرح کی سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا لیکن اس کے باوجود ترقی پسند فکر نے ہمیشہ اپنا لوہا منوایا اور پاکستانی عوام کے دُکھ درد کو ان کے طربیوں اور المیوں کو ان کے محسوسات کی وسیع دنیا کو اپنے دامن میں سمیٹ کر حقیقت شناسی اور خرد افروزی کی راہ کو روشن کیا۔ ترقی پسند نظریہ آج بھی پاکستان کے ادب میں غالب نظریہ ہے کیوں کہ یہ عوام کے دلوں تک رسائی رکھتا ہے اور ان کی دھڑکنوں کو شمار کرنے کا فن جانتا ہے۔ ایک عام قاری ایسے ادب کو مسترد کرتا ہے جو اسے زندگی کی تکذیب تنزل اور حقائق سے فرار کی طرف لے جاتا ہے اور وہ آئندہ بھی ایسے ادب کو مسترد ہی کرے گا کیوں کہ معروضی سچائیاں اس کے سماجی شعور کو زیادہ سے زیادہ بلندی کی طرف لے جائیں گی۔

☆☆☆☆

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کتابیات

ممتاز شیریں۔ "ترقی پسند ادب" (مشمولہ) "معیار"، لاہور۔۱۹۶۳

عارف ثاقب، پروفیسر۔ "اشتراکیت اور ترقی پسند تحریک" (مشمولہ) "بیسویں صدی کا ادبی طرز احساس" غالب نما۔ لاہور جون ۱۹۹۹

ثاقب رزمی، "ترقی پسند ادبی تحریک۔ منظر پس منظر" (مشمولہ) "ترقی پسند نظریہ ادب کی تشکیل جدید" آئینہ ادب لاہور ۱۹۸۷

فردوس انور قاضی، ڈاکٹر "انگارے کے افسانے" (مشمولہ) "اُردو افسانہ نگاری کے رجحانات" مکتبہ عالیہ اُردو بازار لاہور ۱۹۹۰

رسائل

ڈاکٹر نجیب جمال، پروفیسر "ترقی پسند تحریک تخلیقی ادب" (مشمولہ) "انگارے" ملتان ستمبر ۲۰۰۵

شہزاد منظر، "ترقی پسند افسانے کی روایت اور نیا افسانہ"۔ ماہِ نو، لاہور دسمبر ۱۹۹۲

احمد علی، پروفیسر "تحریک ترقی پسند مصنفین اور تخلیقی مصنف"، (مشمولہ مجلہ) "سیپ" (۴) کراچی

عبادت بریلوی، "اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک" (مشمولہ) مجلہ "نقوش" ادارہ فروغ اُردو، لاہور

نویدہ کوثر، "ترقی پسند تحریک اور غیر ملکی اثرات" (مشمولہ) ماہِ نو، لاہور جون ۱۹۹۸

اخبارات

جاوید اختر، "اُردو ادب کی ترقی پسند تحریک" (مشمولہ) "سنڈے ایکسپریس" ۴ دسمبر ۲۰۰۵

انوار احسن صدیقی، "ترقی پسند تحریک کے خدوخال" روزنامہ ایکسپریس، پشاور۔ ۴ دسمبر ۲۰۰۶

انوار احسن صدیقی، "ترقی پسند تحریک۔ ایک جائزہ" روزنامہ ایکسپریس، پشاور۔ ۲ فروری ۲۰۰۶

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مآخذ وحوالہ جات

☆ ڈاکٹر نجیبہ جمال، پروفیسر، ترقی پسند تحریک، تخلیقی ادب (مشمولہ) افکار ے ملتان ستمبر ۲۰۰۵

۱۔ ڈاکٹر محمد حسن، بحوالہ مضمون ''آزاد نظم، غزل اور ترقی پسند شاعری'' مطبوعہ، نقوش لاہور ۷۰۔۱۹۶۹، اکتوبر ۱۹۵۸

۲۔ دیکھیے: ''اہل قلم تم کس کے ساتھ ہو؟'' بحوالہ ''احتساب'' لاہور، جلد نمبر ۸ شمارہ نمبر ۲، ۳، ۴، مارچ، مئی ۱۹۷۹ء ص ۱۲

۳۔ ایضاً ۴۔ ایضاً ص ۱۳

۵۔ بحوالہ مضمون ''آزاد نظم، غزل اور ترقی پسند شاعری''

۶۔ بحوالہ کتاب ''ترقی پسند ادب''، مکتبہ پاکستان، لاہور، ص ۲۴۷

۷۔ بحوالہ کتاب ''اُردو ادب کی تحریکیں'' مطبوعہ انجمن ترقی اُردو، پاکستان کراچی، اشاعت دوم ۱۹۹۱ ص ۴۸۴

۸۔ ایضاً ص ۴۹۸ ۹۔ ایضاً ص ۵۰۶

۱۰۔ علی احمد فاطمی، بحوالہ مضمون ''کیفی اعظمی اور ترقی پسند تحریک'' مطبوعہ ''ارتقا'' کراچی (۳۲) جون تا ستمبر ۲۰۰۲

۱۱۔ ممتاز شیریں، بحوالہ مضمون ''نیا ادب'' مطبوعہ ''ماہ نو'' لاہور، چالیس سالہ انتخاب ۱۹۸۷ ص ۲۰۱

☆ ڈاکٹر عارف ثاقب ''اشتراکیت اور ترقی پسند تحریک'' (مشمولہ) ''بیسویں صدی کا ادبی طرزِ احساس''

غالب نما لاہور جون ۱۹۹۹

۱۲۔ محمد یاسین، ڈاکٹر، ''انگریزی ادب کی مختصر تاریخ'' لاہور بک چینل ۱۹۹۳ء ص ۱۸۷

۱۳۔ صدیق کلیم، ''معاشرتی و ادبی پس منظر'' (۱۹۳۶۔۱۹۷۰) (مشمولہ) تاریخی ادبیات مسلمانانِ پاک و ہند (جلد دہم)

۱۴۔ سجاد ظہیر، ''روشنائی'' مکتبہ اُردو لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۷۰

۱۵۔ اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر، ''ادب اور انقلاب''، نفیس اکیڈی کراچی ۱۹۸۹ء ص ۱۰

۱۶۔ محمد حسن، ڈاکٹر، ''جدید اُردو ادب'' غضنفر اکیڈمی کراچی، ۱۹۸۴ء ص ۹۱، ۱۹۷

۱۷۔ نقوش لاہور، شمارہ: ص ۴

۱۸۔ مجنوں گورکھپوری، ''ادب اور زندگی'' آزاد کتاب گھر دہلی (بھارت) ۱۹۵۵ء ص ۶۸

۱۹۔ محمد حسن، ''ترقی پسند تحریک کا جائزہ'' (مضمون) ادبِ لطیف (سالنامہ) لاہور ۱۹۵۱ء ص ۷۶

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۰۔ شارب ردولوی، ڈاکٹر ''ترقی پسند تحریک اور اُردو تنقید'' (مشمولہ) ''ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر''

مرتبہ: پروفیسر قمر رئیس۔ سید عاشور کاظمی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی (بھارت) ۱۹۹۴ء ص ۵۶۵، ۵۶۶

۲۱۔ احتشام حسین سید، ''تنقیدی جائزے'' پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد (بھارت) ۱۹۵۱ء ص ۱۳۲

۲۲۔ عبدالعلیم، ڈاکٹر، بحوالہ: ''اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' از خلیل الرحمٰن اعظمی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علیگڑھ، بھارت

۲۳۔ علی سردار جعفری، ''ترقی پسند ادب'' مکتبہ پاکستان لاہور، ۱۹۵۶ء ص ۸۴۔ ۲۴۔ ایضاً ص ۲۴۳۔ ۲۴۶

☆ فردوس انور قاضی ڈاکٹر ''انگارے کے افسانے'' (مشمولہ) ''اُردو افسانہ نگاری کے رجحانات''

مکتبہ عالیہ لاہور ۱۹۹۰

۲۴۔ سید سجاد ظہیر ''نیند نہیں آتی'' نقوش، جلد دوم، ص ۴۶۵

۲۵۔ ایضاً

۲۶۔ احمد علی ''مہاوٹوں کی ایک رات'' نقوش حصہ دوم، افسانہ نمبر، ص ۴۶۹

۲۷۔ رشید جہاں، ڈاکٹر ''دلی کی سیر'' نقوش حصہ دوم، افسانہ نمبر، ص ۴۷۱

۲۸۔ محمود الظفر ''جوانمردی'' نقوش، افسانہ نمبر جلد دوم، ص ۴۷۳

۲۹۔ ایضاً

۳۰۔ احتشام حسین، ''ادبی دنیا'' اُردو افسانہ (ایک گفتگو)، ص ۱۷۲

۳۱۔ سجاد ظہیر ''روشنائی'' ص ۱۵

۳۲۔ سگمنڈ فرائڈ، ''تحلیلِ نفسی'' (پہلا لیکچر) ۱۸۵۶ تا ۱۹۳۹

۳۳۔ ایضاً

۳۴۔ محمد حسن عسکری ''ستارہ یا بادبان'' فرائیڈ یا جدید ادب، ص ۹۵، ۹۶

۳۵۔ مارکس پیدائش ۱۸۱۸۔ وفات ۱۸۸۳

۳۶۔ سجاد ظہیر۔ ''روشنائی'' ص ۴۸

۳۷۔ سجاد ظہیر ''ترقی پسند تحریک''

۳۸۔ سجاد ظہیر ''روشنائی'' ص ۷۱

۳۹۔ علی سردار جعفری ''ترقی پسند ادب'' مکتبہ پاکستان لاہور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۴۰۔ آل احمد سرور ''تنقیدی اشارے'' ص ۳۶

۴۱۔ ''اُردو کی ترقی پسند تحریک'' (مشمولہ) افکار کراچی، کرشن چندر نمبر، ص ۱۲۷

۴۲۔ مجتبیٰ حسین۔ غیر مطبوعہ

۴۳۔ علی سردار جعفری ''ترقی پسند ادب'' ص ۲۰۷

۴۴۔ ایضاً ۴۵۔ ایضاً

۴۶۔ احتشام حسین ''اُردو افسانہ'' (ایک گفتگو) ص ۱۷۳

۴۷۔ کلیم الدین احمد ''اُردو تنقید پر ایک نظر'' ترقی پسند تحریک، ص ۱۵۴

۴۸۔ ایضاً ۴۹۔ ایضاً

۵۰۔ آل احمد سرور ''تنقید کیا ہے'' دہلی ۱۹۵۲، ص ۱۶۶

۵۱۔ انجم اعظمی ''اُردو نظم کے پچیس سال'' افکار، جوبلی نمبر، ص ۱۱۵

۵۲۔ مجنوں گورکھپوری، ص ۱۳

☆ نویدہ کوثر ''ترقی پسند تحریک اور غیر ملکی اثرات'' (مشمولہ) ماہِ نو، لاہور جون ۱۹۹۸

۵۳۔ رضی اختر شوق ''آواگون'' نظم کا نام ماہنامہ اقدار۔ مطبوعات اقدار۔ کراچی۔ جلد ۲ شمارہ ۱۵۔۱۶، ص ۴۷

۵۴۔ ڈاکٹر سی۔ اے قادر (دیباچہ) ''ترقی پسند نظریہ ادب کی تشکیل جدید'' ثاقب رزمی، آئینہ ادب لاہور، بار اول ۱۹۸۷

۵۵۔ آل احمد سرور ''تنقید کیا ہے'' کتابی دنیا لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۴۷، ۱۰۴، ''موجودہ ادبی رسائل''

۵۶۔ عابد حسن منٹو ''نقطہ نظر'' میری لائبریری۔ لاہور بار اول ۱۹۸۶، ص ۴۲

۵۷۔ ساحر لدھیانوی ''ترقی پسندوں کی نظمیں'' ایک انتخاب مرتب علی سردار جعفری، آزاد کتاب گھر۔ دہلی ۱۹۵۴، ص ۱۱۳

نقطہ نظر (دیباچہ) ص ۱۱

۵۸۔ عزیز احمد ''ترقی پسند ادب'' کاروان ادب۔ ملتان۔ ص ۳۱ سن اشاعت ندارد

۵۹۔ ''ترقی پسند نظریہ ادب کی تشکیل جدید'' ص ۴۶

۶۰۔ سردار جعفری ''ترقی پسند ادب'' مکتبہ پاکستان لاہور۔ ۱۹۵۶، ص ۴۷

۶۱۔ اختر حسین رائے پوری ''پیامِ شباب''۔ دلی پریس۔ دلی (بھارت) ۱۹۳۸

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۶۲۔ ایضاً۔ص ۱۴

۶۳۔ ''پیام شباب'' ص ۳۲

۶۴۔ ''ترقی پسند ادب'' ص ۵۸۔۶۲

۶۵۔ ''ترقی پسند ادب'' ص ۶۳

۶۶۔ سردار جعفری ''ترقی پسند ادب'' ص ۲۸

۶۷۔ جمیل نقوی ''تنقید و تفہیم'' ادب نما، کراچی ۱۹۸۴، ص ۱۱۰

۶۸۔ عزیز احمد ''ترقی پسند ادب'' ص ۱۱۳۔ ۶۹۔ ایضاً ص ۱۱۵۔ ۷۰۔ ایضاً۔ ص ۱۱۵، ۱۱۶۔ ۷۱۔ ایضاً۔ ص ۹۶، ۹۷

۷۲۔ سید سجاد ظہیر ''روشنائی'' دانیال۔ کراچی۔ ۱۹۸۶، ص ۳۵

۷۳۔ یوسف تقی ''ترقی پسند تحریک اور اُردو نظم'' دیار فکر و فن۔ کلکتہ ۱۹۸۰، ص ۲۱

۷۴۔ ''ترقی پسند ادب'' ص ۱۵

۷۵۔ رشید احمد صدیقی ''ردعمل'' از شہزاد منظر۔ منظر پبلی کیشنز کراچی۔ ۱۹۸۵، ص ۲۴

۷۶۔ غلام السیدین ''ترقی پسند اشتراکی'' مکتبہ میری کتاب، نیا ادارہ دہلی (بھارت ۱۹۵۱، ص ۲۶

۷۷۔ ''روشنائی'' ص ۱۰، ۱۱

۷۸۔ خواجہ عابد جعفری ''اُردو غزل'' ایجوکیشنل پریس۔ دہلی (بھارت) ۱۹۵۲

۷۹۔ ڈاکٹر سلیم اختر ''مختصر ترین تاریخ ادب اُردو'' سنگ میل لاہور۔ ص ۱۳۳

۸۰۔ جمیلہ شاہین۔ ''اوراق'' شمارہ ۱۲ ''تبصرے'' ص ۱۸۲

۸۱۔ خورشید جہاں ڈاکٹر ''جدید اُردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات'' منشاء پبلیکیشنز۔ پکھل۔ ہزاری باغ ۱۹۸۹، ص ۹۷

۸۲۔ سجاد ظہیر اور ترقی پسند تحریک'' کتاب پبلشرز لکھنو ۱۹۸۱۔ ۸۳

۸۳۔ ''ترقی پسند ادب'' ص ۱۹۶

۸۴۔ ''روشنائی'' ص ۱۱

۸۵۔ افتخار حسین آغا ''جدیدیت مکتبہ فکر و دانش'' لاہور بار اول ۱۹۸۶، ص ۴۲

۸۶۔ ''ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر'' ۷۹۔ ۸۷۔ ایضاً ص ۱۶۵۔ ۸۸۔ ایضاً ص ۱۴۳

۸۹۔ مجنوں گورکھپوری ''ادب اور زندگی'' مکتبہ افکار۔ گیا (بھارت) ۱۹۴۵

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۹۰۔ ''ترقی پسند ادب'' ص۱۳۲۔ ۹۱۔ ایضاً ص۱۴

۹۲۔ ''ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر'' ۱۰۹

۹۳۔ ''ردعمل'' ص۳۲، ۳۱

۹۴۔ سجاد ظہیر ''ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر'' ترتیب پروفیسر قمر رئیس۔ سید عاشور کاظمی ایجوکشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۹، ص۲۰۹۔ ۹۵۔ ایضاً ص۲۲۷

۹۶۔ احتشام حسین ''ترقی پسند نظریہ ادب'' کتابستان دہلی ۱۹۶۱، ص۳۳

۹۷۔ کریم الدین احمد، ڈاکٹر ''تنقیدی تحریریں'' آئینہ ادب لاہور۔ ۱۹۸۳، ص۱۳۰

۹۸۔ ن۔م۔ راشد ''۱۹۶۲ کے بہترین مقالے'' مرتبہ حلقہ ارباب ذوق مکتبہ جدید لاہور۔ ۱۹۶۳، ص۱۰۶

۹۹۔ شہزاد احمد ''کچھ تو کہیے'' (۹) مرتب حلقہ ارباب ذوق مکتبہ جدید لاہور۔ ۱۹۶۳، ص۲

۱۰۰۔ ''اُردو ادب کی تحریکیں'' انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی ۱۹۸۳، ص۵۰۱

۱۰۱۔ غلام حسین ذوالفقار ''اُردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر'' جامعہ پنجاب لاہور ۱۹۶۶، ص۴۹۳

۱۰۲۔ انتظار حسین ''علامتوں کا زوال'' سنگ میل پبلیکیشنز لاہور ۱۹۸۹، ص۲۰

☆☆☆☆

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

احمد پراچہ اُردو ادب کی تاریخ کا اہم نام ہے جن کا تعلق صوبہ سرحد کے جنوبی اضلاع کے سب سے بڑے ضلع کوہاٹ سے ہے۔ ان کی جہت اُردو ادب کی ہر صنف پر اتنی گہری ہے جیسے وہی ان کا خاص موضوع ہو۔ انہوں نے افسانہ نگاری، ناول نگاری، تذکرہ وتبصرہ اور شخصیت نگاری کے ذریعے اُردو ادب کے خزانہ میں خوبصورت اضافے کئے ہیں۔ احمد پراچہ کی پوری زندگی مسلسل محنت جدوجہد اور مطالعے میں گزری ہے وہ علم وادب کے تخلیقی عمل میں گزشتہ پچاس برسوں سے پوری کومٹ منٹ کے ساتھ شامل ہیں یہ ایک فنکار کی پوری عمر کا عرصہ ہے اور اس خطے کے عصری ثقافتی تاریخ کا ایک معتبر حوالہ بھی ہے۔ احمد پراچہ اپنے تخلیقی اور تاریخی کاموں کی بدولت ایک نمایاں شناخت کا درجہ رکھتے ہیں مگر جب وہ محقق کی حیثیت سے فکر وفن کو سمیٹتے ہیں تو ان کی ذہانت اور اُردو ادب کے اسالیب اور فطانت پر ان کی فکری گرفت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ ضلعی نامہ نگار کی حیثیت سے مختلف قومی اخبارات کے ساتھ منسلک رہے ہیں اور مختلف ادبی انجمنوں مثلاً بزمِ شعاعِ ادب، انجمن ترقی اُردو، خیابانِ ادب کے صدر اور جنرل سیکریٹری بھی رہے جب کہ آرٹس کونسل کے رکن اور ممبر مجلسِ عاملہ بھی رہے ہیں۔ کوہاٹ آرٹس کونسل کے حالیہ انتخابات میں آپ کو بلا مقابلہ مشیرِ ادب منتخب کیا گیا ہے۔ کوہاٹ کی سطح پر موصوف کو پہلا ناول نگار اور تاریخ نویس ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ انجمن ترقی اُردو لاہور کی طرف سے 1970ء میں خدمتِ اُردو کے سلسلے میں سندِ اعتراف اور خادمِ اُردو کا بیج ملا۔ ان کی کتاب کوہاٹ کا ذہنی ارتقاء پر پاکستان رائیٹرز گلڈ کا 85-1984ء کا آدم جی ادبی ایوارڈ ملا علاوہ ازیں موصوف 1985ء سے ادبی مجلہ ''نایاب'' بھی نکال رہے ہیں۔

فکشن ہاؤس

18- مزنگ روڈ لاہور

E-mail: fictionhouse2004@hotmail.com
Ph:042-7249218, 7237430

ISBN 978-969-562-082-3